

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222949

UNIVERSAL
LIBRARY

جملہ حقوق محفوظ ۸۶

ز مام ابلق ایام در دستِ هُماؤں شد
نویدِ دوزخِش کامی انیس طبعِ موزوں شد

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اُردو کا علمی ادبی ماہوار رسالہ

هَمَائُون

مکتبہ

میاں شبیر احمد بی۔ اے۔ (راکمن) بیرسٹریٹ لاء۔ ایڈیٹر۔
مولانا تاجور۔ نجی آبادی (فضل دیوبند) جاسٹ ایڈیٹر۔

منشی محمد صادق منیر سالہ ہمایوں نے
مرکبائیں لیں لاہور میں چھپوا کر شائع کیا
دفعہ مندرجہ بالا مرکبات کی تعلیم

فہرست مضامین رسالہ ہمایوں بابت ماہ فروری ۱۹۲۲ء

جلد ۱	حصہ نثر	مضمون	صفحہ	حصہ نظم	مضمون	صفحہ
۱	۱	بزم ہمایوں	۲	۱	کلام اکبر	۶۵
۲	۲	جہان نما	۳	۲	لسان العصر مولانا اکبر الہ آبادی مرحوم	۶۵
۳	۳	علمی شعاعیں	۶	۳	رباعیات گرامی	۶۵
۴	۴	تصویر انقلاب فرانس (ٹینس کورٹ کا حلقہ)	۹	۴	پیامِ امید	۶۵
۵	۵	انقلاب فرانس	۱۴	۵	خلیفہ عبدالحکیم صاحب ایم اے	۶۶
۶	۶	شخصیتیں و خیالات	۱۸	۶	ایل ایل بی پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی	۶۶
۷	۷	تحقیق الالسنہ	۲۳	۷	لذتِ عرفان	۶۷
۸	۸	کلام خسرو	۳۱	۸	محترمہ زرخش صاحبہ علیگڑھ	۶۷
۹	۹	پچھل	۳۲			
۱۰	۱۰	عورت اور مختلف مذاہب	۳۹			
۱۱	۱۱	دل دینا	۴۳			
۱۲	۱۲	زربیدہ	۵۰			
۱۳	۱۳	تاروں کی دنیا	۵۲			
۱۴	۱۴	میں کیا ہوں	۵۵			
۱۵	۱۵	بزمِ تحقیق	۵۸			
۱۶	۱۶	نسوانی دنیا	۵۹			
۱۷	۱۷	یادِ آیام	۶۱			
۱۸	۱۸	لغاتِ اجماعین	۶۴			
۱۹	۱۹	محفلِ ادب				
۲۰	۲۰	شذرات				

جذباتِ عالیہ

۱۔ طباطبائی - نواب حیدر یار جنگ بسادر

۶۸ علامہ طباطبائی لکھنوی

۲۔ وحشت - مولوی رضاعلی صاحب وحشت کلکتہ

۶۹ مولانا وجاہت حسین صاحب ایڈیٹر

۳۔ وجاہت - خان شیر حسین خان صاحب جوش

۴۔ جوش - شیخ عبد اللطیف صاحب تپش

۵۔ تپش - تاجور

۷۰ تقریظات

۷۱ ایڈیٹر

۷۲ ہمایوں کی نسبت رائیں

بزم ہمایوں

ہمایوں کا پہلا پرچہ شائع ہونے کے ساتھ جہاں (بدخواہ حاسدوں سے قطع نظر کر کے) اُسے اکثروں کے نزدیک پہلی ہی نظر میں مقبولیت حاصل ہو گئی وہاں ہمیں اس میں بعض ایسی خامیاں بھی محسوس ہوئیں جو بالعموم ہر انسانی کوشش کے ساتھ لاحق ہوتی ہیں۔ ایڈیٹر، کاتب، اہل مطبع، مینجر سب نے شوق سے کام کیا۔ لیکن بالآخر ہر کام کی تکمیل پر یہ ضرور محسوس کیا کہ اس میں یوں ترقی ہوتی تو فٹاں کی نہ رہ جاتی۔ ہماری کوشش یہی ہے اور کوشش نہیں خواہش ہے کہ ہمیں اپنے کام میں خامیاں نظر آئیں اور پھر مصلح تحقیقی کی طرف سے اُن خامیوں کے دور کرنے کی توفیق عطا ہو۔

ہر شخص کا نقطہ نظر جدا ہوتا ہے اور اُس کے ہر کام کا طرز عمل مختلف۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے سرپرست اپنے خیالات و آراء سے ہمایوں کی رہ نمائی کرتے رہیں لیکن ہماری طرف سے اُس کے متعلق عمل درآمد کی نسبت یہ بھی نظر انداز نہ کریں کہ مدیر رسالہ کی جب تک ایک اپنی رائے یا چند اپنے اصول کار نہ ہوں اُس کا کسی اور کے احساسات و خیالات سے متنفید ہونا نہ صرف بے سود ہوتا ہے بلکہ ناممکن۔ وہ کشتی جو فضا کے ہر جھونکے یا سمندر کی ہر موج کے ساتھ ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اُدھر ڈنگا کاتی پھرے اور اُس کے کھینے والے اُسے اپنے زور بازو سے کسی خاص ساحلی مقام یا بیگم کی طرف لے جانے کا مقصد پیش نظر نہ رکھتے ہوں بہت جلد اپنے تئیں گردابِ بلا کے ہاتھوں کو سونپ دیگی۔ اس کے برعکس اگر وہ اس طرح جو غرام ہو کہ اپنی حرکت کے ساتھ موجوں کے تھپیڑوں یا ہوا کے تیز جھونکوں سے قوت حاصل کرے تو وہ پہلے کی نسبت زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ اپنے منتہائے کمال کی طرف سرگرم سفر ہوگی۔

یہی طرز عمل ہمارا ہونا چاہیئے۔ ہمیں ہر شخص کو خوش کرنا مقصود نہیں۔ ہاں! ہر با مذاق کی بات سُن کر اُس پر غور کرنا اور اپنی عقل ناقص کے مطابق اپنے طریق عمل پر از سر نو روشنی ڈالنا ہمارے پیش نظر ضرور ہے اور رہیگا۔ اس لحاظ سے ہم اپنے معاونین کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ہمایوں کو پسند فرمایا اور بعضوں نے ایسے دوستانہ مشورے بھی دیے جو ہمارے لئے بہت مفید ثابت ہو گئے۔

بشیر احمد

جہاں نما

حبشیوں کی بیداری۔ اجتماعی ترقی کے اس محشر خیز زمانے میں جہاں مشرق و مغرب کی قومیں اپنے اپنے خواب سے بیدار ہو رہی ہیں ناممکن تھا کہ حبشیوں کی کالی کلوٹی نسل حکومت کی تاریکیوں سے نکل کر آنکھیں ملتی ہوئی تہذیب یافتہ لوگوں کے زمرے میں نہ آ پتی! مغربی تہذیب کا قُرب ان لوگوں کے لئے مُحرک اتحاد ثابت ہو رہا ہے۔ وہ اپنی نسل کے لئے ایک بہت زیادہ شاندار مستقبل دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ ان کی ذکاوت نمایاں طور پر ظاہر ہو رہی ہے اور وہ انسانی شخصیت کے حقوق حاصل کرنے کے دعویدار ہیں۔ جنگ عالمگیر نے جہاں دُور دراز ملکوں میں آزادی کے خیالات پیدا کئے وہاں حبشیوں میں بھی خود مختاری کی تحریک کو زیادہ پُر زور بنا دیا۔ صلح نامے کے بعد ایک افریقی قومی کانگرس بمقام عکہ (مغربی افریقہ میں) منعقد ہوئی اور آج مشرقی اور وسطی افریقہ میں بھی حرکت کے آثار نظر آتے ہیں۔ حبشی تحریک کا سب سے بڑا مرکز امریکہ ہے۔ یہ حبشی غلاموں کی تجارت کا نتیجہ ہے کہ اس وقت ممالک متحدہ میں ایک کروڑ حبشی آباد ہیں جن کی موجودگی کے باعث "سلازنگ" نے بہت بھونڈی شکل اختیار کر لی ہے۔

امریکی حبشی تحریکات کے تین بڑے گروہ ہیں۔ حبشی ترقی کی تاریخ میں سب سے بڑی شخصیت بوکر ٹنگٹن کی ہے جو غلامی کے درجے سے بڑھتے بڑھتے حبشی تعلیم کی تحریک کا مقتدر سرگروہ بن گیا۔ اُس کا طرز عمل جو سفید قوموں کے ساتھ مل کر کام کرنے کے پُر صلح اصول پر مبنی تھا ہر دلعزیز ہو اور اُس کے اکثر ہم قوم اُسے حکمرانوں کا پروردہ خوشامدی سمجھنے لگے۔ دوسرے طبقے کا سرگروہ مشہور حبشی شاعر دُوبوات ہے۔ جس کی تازہ ترین تصنیف قومی منافرت کا ایک صریح اعلان ہے۔ اسی طبقے کے زیر اثر دوسری کل افریقی کانگرس منعظم ہوئی ہے جس کے تین جلسے یکے بعد دیگرے لندن برسلز اور پیرس میں منعقد ہونے والے ہیں۔ تیسرے طبقے ۱۹۲۰ء میں نیویارک کی کانفرنس میں رونما ہوا۔ انتہا پسندوں کی یہ جماعت جن کا لیڈر مارکس گاروی ہے۔ بڑے شد و د سے اس بات کی تلقین کر رہی ہے کہ افریقہ افریقیوں کے لئے ہے اور اُس تاریک براعظم میں جہاں کسی غیر سیاہ آدمی کو مداخلت کا حق حاصل نہیں حبشیوں کو اپنی عظیم الشان قومی سلطنت جلد قائم کرنی چاہیئے!

۱۹۲۱ء کا بہترین ادیب۔ ملک سویدن سے ہر سال دُنیا کے بہترین ادیب کو سو الاکھ روپیہ کا بیش قیمت ہدیہ دیا جاتا ہے۔ اسے ادب کا نوبل انعام کہتے ہیں کیونکہ اس کا بانی ایک مخیر ایلفرڈ نوبل نامی تھا جو ۱۸۹۶ء میں فوت ہوا اور جس نے اپنی کمائی کا بیشتر حصہ پانچ مفید انعامات کے لئے وقف کر دیا جن میں ایک انعام ادب سے متعلق ہے۔ ہمارے سب سے بڑے روحانی شاعر شکیور نے اسی عطیہ کے ذریعے سے عالمگیر شہرت حاصل کی۔ ۱۹۲۱ء کا انعام فرانس کے ایک مشہور مصنف ٹراک آنا تول رتیولت کے حصے میں آیا ہے جس نے اپنا تصنیفی نام اپنے وطن کی محبت کے جوش میں آنا تول فرانس اختیار کیا، وہ ایک کتب فروش کا لڑکا تھا اور اُس کا ادبی مذاق اُن علمی مذاکروں کی آغوش میں پلا جو اُس کے باپ کی دکان میں ہوا کرتے تھے۔ اُس کا طرز اُس کی ظرافت اور اُس کی سیرت شاہسی لاجواب ہیں اور اُس کی کتابوں کا حقیقی لطف اُن کے مکالموں میں موجود ہے جہاں وہ اپنی ذکاوت و فراست سے نہ صرف افسانے کے دریا کو کوزے میں بند کر دیتا ہے بلکہ ایک زبردست سیرت کا خاکہ آنکھوں کے سامنے کھینچ کر ہمیں ایک زندہ ہستی سے دوچار کرتا ہے، آنا تول کی عمر اس وقت ۷۷ برس کی ہے!

اُس نے اپنے انعام کا سارا روپیہ روس کے قحط زدوں کی امداد کے لئے دے دیا ہے باوجودیکہ روس اور فرانس برسرِ پرغاش ہیں + ایسے انعاموں کے مستحق ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں!

دُم دار آدمی۔ اُرتقائی حکما کہتے تو نہیں مگر یقین رکھتے ہیں کہ بنی آدم فی الحقیقت بنی قرۃ ہیں اور از رو قبل تاریخ میں وہ اپنے جدا مجد کی طرح دُم رکھتے تھے + حال میں ایک مشہور ماہر طبوعات ڈاکٹر لم ہولس نے جو تھوڑی مدت ہوئی بورنیو سے واپس آیا بیان کیا ہے کہ اُس نے وحشی قوموں کے بہت سے افراد اپنی آنکھوں دیکھے ہیں جن کے اک چھوٹی سی ناکممل دُم تھی۔ وہ کہتا ہے کہ ظاہر طور پر یہ لوگ ایک پوری دُم رکھنے والی قوم سے سلسلہ قرابت رکھتے ہیں + پروفیسر موصوف کو یقین ہے کہ نیوگنی میں دُم دار آدمی موجود ہیں۔ اور اُس کا ارادہ ہے کہ اُس ملک میں سر و سیاحت کر کے اس امر کی کما حقہ تحقیق کرے + بعض خبروں کی رو سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی دُمیں بارہ سے لے کر اٹھارہ انچ تک لمبی ہوتی ہیں اور اُن کے جسم اپنے لمبے گھنے بالوں سے ڈھکے رہتے ہیں + وہ جنگل کے سب سے گنجان مقامات میں رہتے ہیں اور مٹی کے برتن بنانے اور کپڑا بننے میں مشاق ہیں۔ جنگ کے واسطے حاکم زہر تیار کرنے میں بھی وہ یدِ طولیٰ رکھتے ہیں +

جنگ اور رقص۔ زمانہ آئندہ کے مؤرخین جب جنگِ فرنگ کی کمائی لکھیں گے تو یہ بھی

بیان کریں گے کہ دنیا کی سب سے زیادہ تباہ کن لڑائی کے بعد ہمارے دل اور اعضا ناچ کی طرف مائل ہوئے،
 تانچے کے صنوعات اس قسم کی مثالوں سے بھرے ہوئے ہیں جس سے قلب انسانی کی نفسیات پر روشنی پڑتی
 ہے + اطالیہ میں سٹائٹ میں کالی موت کے بعد لوگ دیوانہ ہو کر رقص کرتے تھے + بعض لوگوں کا خیال ہے
 کہ دوران جنگ میں سپاہیوں نے جب میدان میں بینڈ باجے کے ساتھ کوچ کرنا سیکھا تو قدرتاُن کے
 قدم ناچ کی حرکتوں کی طرف راغب ہو گئے + آج مغربی لندن کا ایک پُر تکلف ہوٹل نہیں جہاں ہر کھانے
 کے بعد اور درمیان میں ناچ کا جنون انگیز سلسلہ جاری نہ رہتا ہو +

ایک حیرت انگیز نایبنا لڑکی۔ دنیا کے زندہ عجائبات میں کم ہستیاں اتنی عجوبہ زاہو نگی جتنی
 امریکی شہر جین دل کے نایبناؤں کے مشہور اسکول کی طالب علم لڑکی ولینا کلنز + ولینا کی عمر اس وقت
 سولہ برس کی ہے۔ وہ مادر زاد نایبنا نہیں بلکہ صرف چند سال ہوئے اپنی دیکھنے اور سننے کی قوتیں قطعی
 طور پر کھو بیٹھی + اس تغیر سے پہلے وہ بد مزاج خاموش اور غلیں رہا کرتی تھی لیکن بہری اور اندھی ہونے
 کے ساتھ ہی اس کی طبیعت میں ایک حیرت انگیز تبدیلی واقع ہوئی اور آج اس کی بات بات سے چالاکی
 ذکاوت اور خوش طبعی نکلتی ہے + قدرت کی بعض نعمتوں سے محروم ہو کر اس کی فطرت اپنی پوری قوت میں مدنا
 ہوئی + ولینا نے دوسرے کے سر پر ہاتھ رکھ کر سننا اور چیزوں کو سونگھ کر دیکھ لینا + اور رنگوں کی صحیح تشخیص
 کرنا شروع کیا + ایک روز اسکول کی مہتمم چند دلچسپی لینے والی خواتین کے سامنے اس "نایبنا کو باغیچے میں لے
 گئی اور اُسے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف چلنے کو کہا۔ دیکھنے والیاں حیرت زدہ ہو گئیں کہ وہ رستے میں
 آنے والے درختوں سے صاف بچتی ہوئی بے دھوک چلتی گئی۔ ایک خاتون نے اک پھول توڑ کر اُس کے
 ناک کے قریب رکھا اور پوچھا یہ کس رنگ کا ہے۔ فوراً جواب ملا "سفید" + وہ گانے بجانے کی مشاق اور سینے
 پر رونے میں ماہر بن ہے۔ اُس کا لباس اُس کے ہاتھوں کا سلا ہوتا ہے + اس زندہ مثال سے صاف طلبہ
 پر عیاں ہے کہ ہماری دیکھنے سننے چھونے اور سونگھنے کی قوتیں ایک دوسری کی جگہ کام دے سکتی ہیں اور
 یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر فرد بشر کی خوشی اور ترقی کا بہترین ذریعہ اپنے ہم جنسوں سے کھلے طور پر
 آزادانہ تعلقات قائم کرتا ہے +

بشیر احمد

علمی شعاعیں

اسرارِ نجوم۔ ہیئتِ دان ہمیں بتاتے ہیں کہ وہ ننھی ننھی ہستیاں جو ہمارے تاروں بھرے آسمان کی زیب و زینت ہیں اپنے ظاہرہ ننھے پن کے ساتھ حقیقت میں ایسی ہیبت ناک جسامت رکھتی ہیں کہ اُس کے صحیح صحیح اندازے کا احساس ہی ہماری ذہنی قوت کو فنا کر دینے کے لئے کافی ہے + سورج ہم سے نو کروڑ تیس لاکھ میل کے فاصلے پر ہے لیکن ارقطوس ایک نامعلوم ستارہ جو ہمارے تیرِ اعظم سے دس ہزار گنا بڑا ہے ہم سے اتنی مسافت پر واقع ہے کہ روشنی کی ایک کرن جو وہاں سے ۸۶,۰۰۰ میل فی ثانیہ کی رفتار سے چلتی ہوئی آج زمین کی طرف سرگرم سفر ہو ہمارے ہاں ۱۹۴۷ء کے موسمِ بہار میں پہنچے گی + دھاتیں بھی تھک جاتی ہیں۔ یہ امرِ مدت سے دریافت ہو چکا ہے کہ دھاتیں بھی انسان کی طرح مسلسل محنت و مشقت سے مضطرب ہو جاتی ہیں مثلاً دھات کا ایک ٹکڑا جو دیر تک برابر جنبش میں رہے بتدریج اپنی قوت کھو بیٹھتا ہے لیکن اگر اُسے تھوڑا آرام مل جائے تو وہ از سر نو اپنی طاقت حاصل کر لیتا ہے + یہی وجہ ہے انجنیئر دھاتوں کی ٹھکن کا اندازہ لگانا بہت ضروری جانتے ہیں + وہ کسی دھات کی سختی یا لچک کا اتنا خیال نہیں کرتے جتنا اس بات کا کہ وہ کس درجہ پر چڑھ کر ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی + اس ٹھکن کا اندازہ کرنے کے جو طریق پہلے رائج تھے اُن میں بڑا نقص یہ تھا کہ آزمایش میں بہت وقت اور نتیجتاً زبردستی صرف ہوتا تھا + حال میں ایک آلہ ایجاد ہوا ہے جس سے دھاتوں کی ٹھکن کا صحیح صحیح اندازہ بجائے ایک دو ہفتے کے چند ہی منٹ میں کر لیا جاتا ہے +

(ج)

انسانی زندگی کے پچاس برس۔ ایک فرسادی ماہر اعداد و شمار نے اندازہ کیا ہے کہ پچاس برس کے ایک آدمی کی عمر اوسطاً اس طرح صرف ہو چکتی ہے :-

سونہ	۶۰۰۰ دن	کام کاج	۶۵۰۰ دن
چلنا پھرنا	۸۰۰ دن	سیر تماشا	۴۰۰۰ دن
کھانا پینا	۱۵۰۰ دن	علاقت	۵۰۰ دن

وہ دو سو دس دن ترکاری انڈے اور مچھلی کھا چکتا ہے اور پانچ سو چھتیس دن مائعات پی چکتا ہے

پچاس برس کے ایک غریب ہندوستانی سے پوچھئے کہ اُس کی اوسط کتنی ہے؟ (جٹ)
 موسیقی کے ذریعہ علاج - ڈاکٹروں کی نظمیں موسیقی بہت دقت حاصل کر رہی ہے بعضوں نے
 تو عصبی امراض کے معالج میں موسیقی کو بطور دوا استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ موسیخو فرانسس نے
 فونو گراف کے مخصوص طریقہ کے ذریعہ بعض مریضوں کا علاج کیا اور یہ تجربہ بہت کامیاب ثابت ہوا۔ اس کی رائے
 میں غنا (گانا) کا اثر تشبیہ جسم ہی تک محدود نہیں بلکہ اعصاب میں اس کا اثر حیرت انگیز طور پر ظاہر ہوتا ہے۔
 موسیخو موصوف نے بہت سے مریضوں کا علاج صرف موسیقی و غنا کے ذریعہ کیا اور وہ بالکل شفا یاب ہوئے۔
 ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیقی امراض عصبیہ بخوابی، اختلاج قلب وغیرہ کے لئے بہت مفید ہے +

(السلام (مصر)

۲۴ دسمبر کے ایک لندن اخبار میں کسی کسان کا یہ قول شائع ہوا ہے کہ جس روز میری گائیں اتفاقی
 طور پر کسی ایسی جگہ جا نکلتی ہیں جہاں محفل سرد گرم ہو تو شام کو اور دنوں کی نسبت دودھ زیادہ دیتی ہیں +
 کیا آفتاب کی حرارت تغیر پذیر ہے؟ علمائے ہیبتہ کی رائے ہے کہ دو ہزار سال سے اب تک آفتاب
 کی حرارت میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ اسی لئے کرہ الارض پر حیوانات و نباتات کی پیدائش غیر متغیر نظر آتی ہے لیکن
 دو ہزار سال سے قبل حرارت آفتاب کی مقدار میں عظیم تغیرات ہوتے رہے ہیں۔ جن کی وجہ سے جیولوجی
 (علم طبقات الارض) کے عظیم انقلابات رونما ہوئے۔ بعض فلاسفہ کی رائے ہے کہ آفتاب کا حجم تدریجی
 طور پر کم ہو رہا ہے اور ایک لاکھ برس کے بعد آفتاب کا یہ دکھتا ہوا کرہ بجھ جائیگا۔ حتیٰ کہ حرارت کی کمی
 کی وجہ سے سطح زمین سے حیوانات و نباتات یک قلم فنا ہو جائیں گے +

(السلام (مصر)

اس کے برخلاف یورپ کی مشہور فلسفہ مادام کوری کا خیال ہے کہ آفتاب کی حرارت کم ہونے کی
 بجائے ترقی پذیر ہے۔

بہر حال آفتاب کی حرارت ترقی پذیر ہو یا تنزل قبول دنیا کا مستقبل خطہ ہی میں ہے + (تاجور
 نئے ہوائی جہاز صلیح نامہ در سائی کی رو سے جرمنوں کے لئے انجن والے ہوائی جہازوں کا بنانا ممنوع
 قرار دیا گیا لیکن ان کی ایجاد کاری اک دوسری شکل میں نمودار ہوئی۔ حال میں رومن کے علاقے میں ایک پروازی
 مقابلہ ہوا جس میں ۴۵ بے انجن اڑنے والے ہوائی جہازوں نے حصہ لیا۔ ایک ہوا پر اڑتیرہ منٹ ہوائیں
 اڑتار ہوا اور اتنی دیر میں اُس نے چھ میل کا فاصلہ طے کر لیا +

علم الکیمیا۔ حال کے سائنس دان قدیم علم کیمیا پر یقین رکھنے والوں کی پھیلتی اڑاتے آئے ہیں۔ لیکن گذشتہ کسب میں یورپ کا دماغ یہ سن کر ہیجان کی حالت میں آگیا کہ ایک جرمن نے مصنوعی طریق سے سونا بنالیا ہے، اتحادی ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ کیا جرمن اپنا تادان ادا کرنے میں ایسی ذیل حرکت سے باز نہ آئیں گے، جرمنی کے متین طبقے کی طرف سے اس بات کی تردید ہو گئی لیکن یقین نہیں آتا کہ یہ بات صرف تفتن طبع کی غرض سے کی گئی تھی۔

بالنس کی گھڑی۔ سینئر سزنی (ساکن نیپلز) نے تین برس کی محنت شاقہ کے بعد ایک بالنس کی بڑی گھڑی ایجاد کی ہے جس میں سوائے گھنٹی کے سب پرزے بالنس کے بنے ہوئے ہیں، اس میں گھڑی کے معمولی کام کے علاوہ بعض نئی باتیں ہیں۔ گھڑی ہر پندرہ منٹ کے بعد بجتی ہے۔ دن اور مینے کا پتہ دیتی ہے اور اُسے صرف چار برس کے بعد چابی دی جاتی ہے۔ ہر روز دوپہر کے وقت اُس میں ایک چھوٹی سی توپ چلتی ہے ایک جھنڈا بلند ہوتا ہے اور ایک سیٹی کے بعد ایک گھنٹی بجتی ہے۔

اخلاق پیمائی۔ ڈاکٹر برٹس (برلن) نے ایک فیزی آلہ ایجاد کیا ہے جس سے تھوڑی دیر میں انسان کی اخلاقی قوت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، یہ آلہ معمول کے سر پر لگا دیا جاتا ہے اور ایک گھنٹے کے اندر اُس شخص کی اچھی بڑی عادتوں کا پتہ چل جاتا ہے۔ (ج)

امریکہ کے مشہور ہوا پرواز سٹریڈون نے اعلان کیا ہے کہ میں قطب شمالی کے سفر کی تیاری کر رہا ہوں یہ سفر ایلاسکا (شمالی امریکہ) سے شروع ہو کر قطب کو کاٹتا ہوا "سبتیز برجن" پر ختم ہوگا یعنی اٹھارہ سو میل کی مسافت طے کرنی ہوگی اور پھر طرہ یہ کہ اتنی بڑی مسافت ایک ہی پرواز میں قطع کی جائیگی۔

(الہلال مصر)

دنیا میں سب سے زیادہ بلند پرواز ایک امریکن باشندہ مسٹر میکریڈی ہے جو اکتالیس ہزار قدم اونچا اڑ سکتا ہے اور سب سے زیادہ نرود پرواز موسیو کوانٹ فرانسیسی ہے جو (۲۰۶) میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑتا ہے۔ (رٹاجو) (الہلال مصر)



انقلابِ فرانس

اٹھارھویں صدی کے نصفِ آخر میں مغرب کا بحرِ سیاست جو کچھ مدت سے گویا سکونِ مطلق کی تصویر ہو چکا تھا اب ایک ہیبت انگیز طوفان کی فتنہ سامنیوں کا نظارہ بن گیا! یہ طوفان بے تمیزی سے موخنین انقلابِ فرانس کہہ کر یاد کرتے ہیں اول اول پیرس سے اٹھا اور پھر آن کی آن میں سارے برِ عظم پر پھیل گیا! قومی انقلابات خواہ وہ سیاسی ہوں یا مذہبی اپنے اندر ایک غیر معمولی اُٹل قوت رکھتے ہیں۔ وہ قوت جو اپنے عہد کی اخلاقی اور تمدنی کمزوریوں میں جنم لیتی ہے اور پھر خود ان جراثیم کی تباہی کا موجب بن کر نظامِ ہستی کو اک نئی زندگی بخشتی ہے!

یہ پُر اضطراب تبدیلیاں قانونِ قدرت کے معمول سے ہیں جو کارِ خدائِ حیات کی کلوں کو کبھی ایک حالت پر نہیں رہنے دیتا بلکہ دائمی حرکت کے ذریعے اُس کے پُر زردوں میں بے قراری کی لہریں پیدا کرتا ہے۔ اور مادہ نیم جاں کو روحانی قوت کے زور سے عمل کی طاقت بخشتا ہے!

جب ”انقلابِ فرانس“ برپا ہوا یورپ خوابِ غفلت میں مدہوش تھا!

اکثر شاہانِ مغرب اپنی مطلق العنانی کے نشے میں چور تھے اور ملک کا خزانہ اپنے شاندار درباروں اور پُر عشرت محفلوں میں پانی کی طرح بہاتے تھے۔ اُمرا اپنے موردی جاگیر داری حقوق پر جے بیٹھے تھے اور اگرچہ عام طور پر اختیارِ شاہی کے آگے اُن کا چراغ نہ جلتا تھا لیکن خود شاہانِ اقتدار ہی اُن کی آتشِ فردریوں کو اپنا فروغ سمجھتے ہوئے تھا!

جرمنی میں مزارعان کی حالت خراب و خستہ تھی۔ وہ غلاموں سے بڑھ کر درجہ نہ رکھتے تھے۔ فرانس میں بھی وہ حقوقِ جاگیر داری کے آئے دن کے مطالبات سے تنگ آ گئے تھے۔ اُن کا جاگیر دار اگر سیر و شکار میں مصروف ہے تو کیا مجال کہ اپنی کھیتی باڑی کی تباہی پر وہ ناک بھول چڑھائیں۔ اُن کی محنت کا پھل جاگیر دار کے شغلِ دیش کی قربانِ گاہ پر بطورِ نذر پیش ہو جاتا ہے اور اُن میں سے ہر ایک صرف غم و مایوسی کی نگاہوں

دیکھتا رہتا ہے کہ ہاں میرا مقدر یہی ہے !

طبقة اسفل کے احساسات | لیکن تابہ کے ؟ طبقة اسفل کبھی ہمیشہ کے لئے دبانیں رہتا !

آنکھوں سے دیکھ لے کر موروثی عشرتیں بے رحمی کے ساتھ انسانیت کی بنگلہ کی طرح زلزلے کی مانند اٹھتا ہے اور بجلی سے بھری ہوئی گھٹاؤں کی طرح چار دانگ عالم میں چھا جاتا ہے ۔ پھر اُسے بیٹھو مانیں رہتا کہ اُسے صرف اپنی گذشتہ ناکامیوں کی تلافی کا استحقاق حاصل ہے بلکہ وہ قلب انسان کے اس زہرِ طبعین کے ساتھ جسے فطرتِ انسانی فخر کے ساتھ انتقام کا لقب دیتی ہے اپنے ہمجنسوں کی ہلاکتِ عام کا تہیہ کر لیا ہے ۔ اس طرح معاشرت کے ترازو کا کبھی ایک پلڑا بھاری ہو جاتا ہے کبھی دوسرا اور اگرچہ طبقة اسفل اکثر نیچا نظر آتا ہے لیکن تاریخِ دنیا گردش کی اُن مثالوں سے بھری پڑی ہے جہاں فاقہ مستوں نے صرف اپنے حقِ زیست کو نہیں بلکہ اپنے حقِ حکومت کو بھی بزدلِ شمشیر ثابت کیا ہے ۔ ”انقلابِ فرانس“ اس فطری احساس کا ایک لاجواب اظہار تھا ۔

انقلابِ فرانس کے اہم اثرات | یہ اسی انقلاب کی وجہ ہے کہ آج دنیا ہمیں اپنی موجودہ حالت میں نظر آتی ہے اور جہاں جہاں بنی نوعِ بشر آباد ہیں وہاں جمہوریت کا ڈنکا بج رہا ہے ۔ ہر قوم اپنے ملک میں اور ہر فرد اپنے گھر میں اپنے فطری حقوق خود مختاری کا مطالبہ کرتا ہے ۔ خود سری اپنی صورت دکھاتی ہے تو سب فریقِ مل کر اُس کی سرکوبی پر آمادہ ہو جاتے ہیں ۔ ہر شخص اپنی عقل و توجیہ کا دلدادہ ہے اور ہر قسم کی بزرگی اپنی سند کو کھو بیٹھی ہے !

اگر ”انقلابِ فرانس“ برپا نہ ہوتا تو ہماری بیسویں صدی کی دنیا اٹھارھویں صدی کے زمانے سے اس قدر مختلف نہ ہوتی ۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ”انقلابِ فرانس“ وہ حجاب ہے جو قدیم زمانوں کو ہماری سیاسی اور معاشرتی دنیا کی نگاہوں سے چھپائے ہوئے ہے !

یہ درست ہے کہ اس انقلاب کے بعد بھی انیسویں صدی میں استبداد نے اپنا سر اٹھانے سے دریغ نہیں کیا لیکن ہر ایسی حالت میں تھوڑی مدت کے بعد ہی اُسے قوتِ جمہور کے سامنے اپنا سر جھکانا پڑا ۔ خود ہمارے وقت میں بھی مغربی قوموں نے مشرقی اور افریقی ملکوں کو فتح کر کے اپنی آرام گاہوں میں تبدیل کر لیا ہے لیکن اُن کی زمانہ شناسی اور اُن کا وسیع تجربہ انہیں بتا رہا ہے کہ یہ بیرونی حکومت ہنسی

وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک یہاں کے باشندوں میں اپنی قدرتی حق طلبی کا احساس اور اپنی فطری ذمہ داری کا خیال منقود ہیں اور اس میں کچھ شک نہیں کہ جس روز یہ لوازماتِ حریت پیدا ہونگے دنیا کے یہ حصے بھی محکومیت کی بندشوں سے آزاد ہو جائیں گے !

انقلابِ فرانس کے اسباب | یہ انقلابِ عظیم جس نے یوں مہذبِ دنیا کی کایا پلٹ دی کیونکر وقوع میں آیا ؟ اس کے اسباب نہایت دلچسپ اور اُن قوموں کے واسطے

جو آزادی کے لئے جدوجہد کر رہی ہیں انتہا درجہ معنی خیز ہیں !

۱۷۸۹ء سے پہلے یورپ میں اکثر قوموں نے اپنے موجودہ جغرافیائی حدود قائم کر لئے تھے۔ لیکن انسانی معاشرت کے طبقے ہنوز اپنی پرانی حالت میں پڑے تھے بالخصوص پچھلا طبقہ جو صدیوں سے ایک طرف شاہی مطلق العنانی اور دوسری طرف جاگیر داری تمول کے ناقابلِ برداشت ظلموں کے درمیان دب کر اپنی فطری صورت کھو چکا تھا !

ان مغربی قوموں میں فرسادی لوگ نہایت جفاکش اور تیز فہم ہونے کے ساتھ انتہا درجہ ذکی الحس واقع ہوئے ہیں۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے پہلے پہل اس طبقاتی امتیاز کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور یہی لوگ تھے جنہوں نے یکپارگی اس کا قلع قمع کر دینے کا مصمم ارادہ کر کے اُس کو جڑ سے اکھیڑ دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا +

قرونِ وسطیٰ میں اور اصلاحِ مذہبی کے دور میں بمقابلہ مغربی ملکوں کے فرانس میں شاہی مطلق العنانی اپنے زوروں پر تھی لیکن اٹھارہویں صدی میں خاندانِ بوربون کے جانشینوں میں وہ سیاسی فطنت اور اوصافِ ملک داری باقی نہ رہے تھے جو فرسادی فرماں رواؤں کی امتیازی خصوصیت سمجھے جایا کرتے تھے +

"انقلابِ فرانس" کے وقت فرانس میں ادھر درباری اسراف اور شاہانہ عشرت کا بدناما پہلو پیش نظر تھا اور ادھر ملکی نظم و نسق کی حالت ابتر تھی اور قومی خزانہ قطعی خالی !

اس پر امریکہ اور ہندوستان میں انگریزوں کے ہاتھوں پے درپے شکستیں اٹھانا گویا بھختی شمع کے لئے ایک تندوتیز جھونکے کا کام دے گیا۔ مطلق العنان بادشاہ اور اُس کے چیلے چانٹے وہ امرا جن کے حقوق کی پرستش سے رعایا بیزار ہو چکی تھی جس طرح انہوں نے ایک دوسرے کی حمایت و اعانت سے نشوونما پائی تھی اب اُسی طرح ایک دوسرے کی مصاجبت میں لوگوں کے جوشِ انتقام کا نشانہ بنے !

شاہی خاندان کا اسرار اور بے اعتدالیوں، اُمرا اور پادریوں کے نامنصفانہ امتیازی حقوق، غریبوں اور طبقہ متوسط کے لوگوں کی ناگتہ بہ حالت، فرسادی فلسفہ و ادب کی جوش انگیزی، امریکہ کے جنگ انقلابی کا اثر یہ تھے وہ اہم اسباب جو انقلابِ فرانس کی تحریک بلائیز کا موجب ہوئے۔



لوئی شانزدہم | جب لوئی پانزدہم کی وفات پر سترہ سالہ میں اُس کا بیٹا لوئی شانزدہم تخت پر بیٹھا تو مالی مشکلات نے اہل حکومت کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ آخر کار (سترہ سالہ میں) بادشاہ نے مجلسِ خوانین کو جمع کیا اور جب اس سے کچھ بن نہ پڑا تو طوعاً و کرہاً فرسادی قوم کی قدیم مجلسِ شوریٰ کے انتخاب کا حکم دیا یہ خیال کر کے کہ شاید قوم کے چھوٹے چھوٹے مطالبات کے ساتھ شاہی خزانے کی بڑی ضروریات بھی پوری ہو جائیں۔

مجلسِ شوریٰ مدعوہ کی گئی | اور تجاویزِ اصلاح کے متعلق تحریری بیانات دیں۔ ایک مطالبہ ان سب بیانون میں مشترک پایا جاتا ہے کہ قوم کو اپنے نمائندوں کے ذریعے حکومت میں حصہ لینے کا حق دیا جائے۔ طبقہ سوم یا طبقہ زیرین کی شکایات زیادہ تر جاگیر داری حقوق و خدمات کے متعلق تھیں اور نیز اس بات پر اصرار تھا کہ سب طبقوں میں بارِ محصولات یکسانیت کے اصول پر مبنی ہو! یہ مجلس ۵۷ سال سے مدعو نہ کی گئی تھی۔ بادشاہ نے مجلس کا افتتاح کیا اُس وقت اُسے گمان تک نہ تھا کہ یہ لوگ اپنے جی میں کیا کیا ہوئیں لے کر آئے ہیں؟

”عوام“ کے اصرار پر انہیں چھ سو نمائندے بھیجنے کا حق عطا کیا گیا تھا۔ پادریوں اور اُمرا کے تین سو نمائندے تھے۔ اب ”عوام“ نے خلافت دستور مطالبہ کیا کہ ہر سوال پر طبقہ طبقہ رائے دے۔ بلکہ سب نمائندے یکجا جمع ہو کر انفرادی طور پر رائے دیں۔ ظاہر ہے کہ اس طریقہ سے عوام کسی بات میں رک نہ اٹھا سکتے تھے بلکہ بوجہ اُسی ہمدردی کے جو دوسرے طبقوں کے بعض نمائندے اُنکے خیالات کے ساتھ رکھتے تھے وہ اکثر معاملات میں بازی جیت لیتے، اس غیر معمولی مطالبہ پر برابر پانچ ہفتے بحث کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر کار ”عوام“ نے خود بخود مجلسِ قومی ہونے کا اعلان کر دیا۔ بادشاہ اُمرا اور پادری سب اس بے باکانہ

کارروائی پر شذر رہ گئے۔ بادشاہ نے خوف زدہ ہو کر مجلس کو معطل قرار دیا اور ایوانِ مجلس کے دروازوں کو بند کر کے اُن پر سنگین پہرہ کھڑا کر دیا۔ "عوام" نے اس کی مطلق پروا نہ کی اور رئیسِ کورٹ میں جمع ہو کر حلف اٹھایا کہ جب تک ہم فرانس کے واسطے ایک دستورِ حکومت مرتب نہ کر لیں گے ہم ہرگز منتشر نہ ہونگے، چند اُمرا اور بہت سے پادری اُن کے ساتھ شامل ہو گئے۔ بادشاہ نے یہ دیکھ کر سب نمائندوں کا مشترک جلسہ کیا اور پھر برطیقہ کے نمائندوں کو حکم دیا کہ اپنے اپنے ایوانوں میں چلے جائیں۔ اُمرا اور پادری اٹھ کر چلے گئے لیکن "عوام" اپنی نشستوں پر قائم رہے، میرِ رسوم نے بڑھ کر ذرا تحکماً انداز میں کہا "تم نے بادشاہ کا حکم سن لیا؟" براہِ رونے ان مشورۃ الفاظ میں اُس کو جواب دیا "جاؤ اور جن لوگوں نے تم کو بھیجا ہے اُن سے کہہ دو کہ ہم لوگ اہم نکات کے حکم سے یہاں موجود ہیں اور یہیں جم کے بیٹھیں گے حتیٰ کہ سنگینوں کے زور سے ہمو باہر نکال دیا جائے،" بیچارہ پیغام رساں جو اس باختہ ہو کر واپس چلا لیکن بیٹھ ہو کر نہیں بلکہ پچھلے قدموں جیسے وہ بادشاہ کے حضور رخصت ہو کر تاتھا، اُس کا ادراک درست تھا۔ وہ فی الحقیقت فرانس کے اک نئے فرماں روا کے دربار میں موجود تھا جس نے ابھی ابھی عثمانی حکومت اپنے ہاتھ میں لی تھی، یہ جان کر کہ اب ان کا مقابلہ دشوار اور خطرناک ہو گا بادشاہ نے اُن امرا اور پادریوں کو جو ابھی تک "عوام" سے الگ رہے تھے حکم دے دیا کہ اُن کے ساتھ شریکِ مجلس ہو جائیں، مجلسِ شوریٰ اب واقعی مجلسِ قومی بن گئی! مجلسِ قومی "مجلسِ قومی" کو مجلسِ دستوری بھی کہتے ہیں کیونکہ اس کا صریح مقصد فرانس کے لئے ایک مناسب دستورِ حکومت بنانا تھا، اس کے ہوتے سب سے پہلے پیرس میں

قومی محافظین اور پیرس کی انقلابی جماعت کا ظہور ہوا، ۴ جولائی کو عوام الناس نے شاہی قید خانے بائیل پر دھاوا کیا اور قیدیوں کو رہائی دے کر دیواروں کو قطعاً منہدم کر دیا، کوئی شانزدہم نے سنا تو غصہ و حیرت سے چلا کر کہا "کیا؟ یہ بغاوت ہے؟" جواب ملا نہیں! جہاں پناہ! یہ قومی انقلاب ہے! عظیم الشان انقلابِ فرانس، واقعی شروع ہو گیا تھا۔

"انقلابِ فرانس" کی تاریخ ہمارا موضوع نہیں۔ یہاں صرف تمہیداً اُس کا مختصر طور پر ذکر کرنا مقصود ہے، اُمرا کے حقوقِ خاص کی منسوخی، اعلانِ حقوقِ انسان، اراضیاتِ کلیسائی کا قومی جائیداد بنایا جانا۔ پادریوں کا دستور دیوانی۔ بادشاہ کا فرار اور گرفتاری ہم ان مشہور داہم واقعات کے ذکرِ محض پر اکتفا کرتے ہیں!

مجلس آئینی مجلس کے نئے دستور کے مطابق جس پر بادشاہ نے اپنی منظوری کی مُہر ثبت کر دی تھی یکم اکتوبر ۱۷۹۱ء کو مجلس آئینی کا آغاز ہوا۔ نمائندوں میں ایک گروہ کا منشا تھا کہ فرانس میں نئی دنیا کی سی جمہوری حکومت قائم کرے۔

شاہانِ یورپ نے کوئی شازدہم کے محلے کو اپنا معاملہ اور اُس کے تاج چھین جانے کو اپنے اپنے تخت کا اُلٹ جانا تصور کیا۔ آسٹریا کی جنگی تیاریوں کو دیکھ کر مجلس آئینی نے اُس دولت کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا۔ تھوڑی مدت بعد آسٹریا اور پرشیا کی متحدہ فوجیں سرحد کو عبور کر کے فرانس میں داخل ہوئیں۔ انقلابی گروہ آگ بگولا ہو گیا اور سب سے پہلے اُس نے ملکی دشمنوں کے قلع قمع کرشکا ارادہ کیا۔ دہتوں نے کہا کہ دشمن کو روکنے کی بہترین ترکیب شاہی طرفداروں کی سرکوبی ہے، اس طرزِ خیال کا نتیجہ سوئس گارڈ کا قتل عام اور ستمبر کی خونریزیاں تھیں۔ ساتھ ہی اتحادیوں کو بمقامِ وادی شکست ہوئی اور اُسی روز مجلس آئینی کا دور ختم ہوا۔

مجلس مدعوہ اس مجلس میں کوئی طرفدارِ شاہی نہ تھا۔ سب جمہوریئے تھے جن میں دو سیاسی گروہ تھے ایک بھردندی اور دوسرے کوہستانی۔ ۲۰ ستمبر کو نئی مجلس کی پہلی نشست ہوئی ۲۱ کو جمہوریہ کے قائم کئے جانے کا اعلان کیا گیا اور ۲۲ کو ایک نئے دور کا آغاز ہوا یعنی وہ جمہوری سال اول کا پہلا دن قرار پایا۔ تھوڑی مدت بعد فرسادی فوجوں کی کامیابی سے مغرور ہو کر مدعوہ نے اقوامِ دنیا کو مطلق العنانی کے خلاف اپنا اپنا جھنڈا بلند کرنے کی دعوتِ عام دی اور ہر قسم کی اعانت کا وعدہ کیا۔ یعنی اب دُنیا نے مغرب کے قدامت پسندوں اور جدت طرازوں کے درمیان ایک عظیم الشان خونریز جنگ کا آغاز ہو گیا شاہِ فرانس پر قوم کی طرف سے مقدمہ چلایا گیا اور ۲۱ جنوری ۱۷۹۳ء کو اُسے موت کی سزا دے کر گولین کر دیا گیا۔ اس واقعے سے برہم ہو کر ڈولِ یورپ نے ایک اتحادِ عظیم قائم کیا جس میں انگلستان آسٹریا پرشیا اور دیگر ریاستیں شامل تھیں۔ اس اتحادِ اول کا صریح مقصد جمہوری تحریک کا ملیا میٹ کرنا اور فرانس میں شخصی حکومت کا استحکام تھا۔

فرسادی فوجیں شمال میں شکستیں کھا کر پیچھے ہٹیں تو اہل پیرس نے اس بات پر زور دیا کہ ایک انقلابی عدالت قائم کی جائے جو مخالفینِ جمہوریہ کی سازشوں کا سد باب کرے اور اُن کو بلاتامل سنگین سزائیں دے، چند ماہ کے بعد ایک حفاظتِ عامہ کی کمیٹی مقرر کی گئی جسے اس قدر وسیع اختیارات

دئے گئے کہ فرانس میں گویا نادرشاہی دور کا آغاز ہو گیا۔ جرمنیوں نے ان انتہائی کارروائیوں کو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا اور نتیجتاً وہ کوہستانوں کے آگے اپنا سب اثر اور طاقت کھو بیٹھے۔

آشوب فرانس ملکی سازشوں اور اجنبی دشمنوں کے حلوں نے ایک نازک سیاسی حالت پیدا کر دی تھی۔ مجلس مدعوہ نے حفاظت عامہ کی کمیٹی کو از سر نو ترتیب دیا اور اُس کا نام "حفاظت عامہ کی بڑی کمیٹی" رکھا گیا۔ پورے بارہ مہینے تک بارہ شخصوں نے جو اس کمیٹی کے رکن تھے اور جن میں بوہنر

ممتاز تھا فرانس کے ہر فرد کے جان و مال پر نادرشاہی اختیارات برتے۔ کمیٹی کا اصول صاف و صریح تھا سختی و سفاکی کے ذریعے انہوں نے فرانس کے رگ و ریشے میں بے قراری کی لہر پیدا کر دی اور اُسے غیر ملکیوں اور مخالفین جمہوریہ کے خون کا پیسا بنا دیا۔ ملکہ ماری آنتوانت اور جرمنیوں کا قتل اور ان کے بعد ادم رولان

اور پھر اور ہزاروں بے گناہوں کا ہر روز خون بہایا جانا رقت انگیز واقعات تھے۔ لیکن ان سے بڑھ کر تیر تافزا وہ حدیں تھیں جو زندگی کی عام معاشرت میں کی گئیں، سن عیسوی تو مجلس مدعوہ نے منسوخ کر ہی دیا تھا۔

اب سال کے مہینوں نے نئے نام حاصل کئے۔ ہر مہینہ دس دس دن کے تین عشروں میں اور ہر دن سڑس گھنٹوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ سال میں جو پانچ دن بچے وہ ان یکسانیت پسندوں نے تعطیلات بنا دیئے، وزن

پیمائش کا طریقہ میٹرک اس سے پہلے مجلس قومی کے حکم سے مکمل ہو چکا تھا، زمین کے بادشاہ کو معطل کر کے انقلابیوں نے آسمان کے بادشاہ کو بھی عرش سے اتار دیئے کا حکم نافذ کیا۔ گرجاؤں کو بند کر کے قربان گاہوں

کے خزانوں کو لوٹا اور خالق ہوں کو قومی حکومت کی ملکیت بنا لیا۔ حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ کی مورتوں کو توڑ پھوڑ کر مارا اور دیگر مہمان وطن کے بُت کھڑے کر دیئے۔ لوگوں کی دیوانگی کا انتہائے کمال عقل کی

پرستش میں ظاہر ہوا جب انہوں نے ایک شہرہ آفاق شاہد بازاری کو تو ترو دم کی قربان گاہ پر لا بٹھایا اور اس عقل کی دیبی کی پوجا پیرس اور فرانس کے دوسرے حصوں میں عام طور پر ہونے لگی۔

اس وقت آشوبے تین گردہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ روہس پیڑ نے جو ایک جمہوری مطلق العنان بننا چاہتا تھا دوسرے دونوں گردہوں کے سر کر دول کو یکے بے دیگرے پھانسی پر چڑھوا دیا۔ اب صرف وہی

گوہ مقدس کی چوٹی پر تنہا کھڑا ہوا نظر آتا تھا لیکن اُس کی باری بھی عنقریب آنے والی تھی اپنی مکمل کامیابی کے بعد اُس کا پہلا کام فرانس کو لاندہی کے پنجے سے چھڑا کر دوبارہ ایک خدا پرست قوم بنانا تھا۔ چنانچہ، اُسی سال

کو اُس نے مجلس کے سامنے خدائے ذوالجلال کی غیر فانی ہستی پر ایک زبردست تقریر کی۔ مجلس نے اسے

مطابق ایک قانون نافذ کیا اور بجائے عقل کی پیروی کے فرانس کی عبادت گاہوں میں پھر الہ العالمین کی پرستش ہونے لگی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ خلافتِ عامہ کی بڑی کمیٹی "پیرس میں اپنی قتل عام کی عدالت لئے بیٹھی تھی قید خانوں سے ہر روز صد ہا بد نصیبوں کو گھسیٹ کر عدالتِ انقلابی کے سامنے لایا جاتا اور صفِ گذشتہ امارت کے اقرار پر قتلِ لعین میں ان ستم گرد دیا جاتا، صوبوں میں حالت اس سے بھی بدتر تھی۔ شہرِ نانت میں چار جینے کی قلیل مدت میں پانچ سو زراعتی ہونٹا با لاخرو بس پیٹر کی باری آئی۔ مجلس نے اُسے اور اُس کے تمام جانب داروں کو جمہوریہ کے دشمن قرار دیا اور وہ ایک ایک کر کے مقدس گھوٹن کی قربان گاہ پر بھیج دئے گئے۔

اس دورِ آشوب کا اثر فرانس میں تو وہی ہوا جو آشوبوں کے پیش نظر تھا۔ لیکن غیر ملکوں میں وہ لوگ جو اب تک تحریکِ انقلاب کے حامی تھے اس سے بیزار و برگشتہ ہو گئے۔

مجلس کی مخالفت اور بچاؤ | پیرس میں مجلس کی زندگی معرضِ خطر میں تھی۔ نمایندگان پر یہ بات تجربے سے ظاہر ہو چکی تھی کہ انقلابی حکومت کا بڑا نقص حکومتِ آئینی اور حکومتِ علما کا اجتماع تھا۔

ان دونوں اختیارات کا جدِ اجداد اشخاص کے ہاتھوں میں ہونا دولت کی سلامتی اور مناسب کارپردازی کے لئے ضروری تھا۔ مجلس نے اس غرض سے ایک نیا دستور مرتب کیا کہ پانچ شخصوں کی ایک نظامت کو علما نے اختیار دئے جائیں اور قانون سازی کے لئے دو مجلسیں "مجلسِ پینج صدی" اور مجلسِ قدامتِ منتخب کی جائیں۔ جن کے ایک تہائی نمائندے ہر سال نئے ہوں، یہ خیال کر کے کہ مجلسیں ایسے نازک وقت میں شاہ پسندوں کی بھرمار سے بچ جائیں مجلسِ مدعوہ نے قرار دیا کہ نئے انتخاب کا یہ قانون خود اسی مجلس پر عائد کیا جائے۔ پیرس کے وہ لوگ جو مجلس اور اُس کی کارروائیوں سے اکتا گئے تھے فوراً برہم ہو گئے اور ۵ اکتوبر ۱۷۹۵ء کو چالیس ہزار آدمیوں کا ایک بے ترتیب مجمع دو تہائیوں پر بلونت کے نعرے مارتا ہوا مجلس کی نشست گاہ تیرولری کی طرف بڑھا، لیکن ابھی وہ قریب نہ آنے پائے تھے کہ چھروں کی ایک بوچھاڑ نے انہیں پیرس کے کلی کوچوں میں تتر بتر کر دیا۔

اس چھوٹے سے توپ خانے کا افسر ایک اجنبی نوجوان جزیرہ کارسیکا کا ایک باشندہ تھا۔ آخر کار انقلابِ فرانس نے ایک مردِ میدان پیدا کر دیا جس کی اعانت سے اُس کا نظام و استحکام انجام کو پہنچا۔ اور جس نے بالآخر اسی انقلاب کو اپنی عظمت کا زینہ بنا کر شہرت کا وہ ڈنکا بجایا کہ اک دنیا اُس کی زلزلہ خیز آوازوں سے گونج اٹھی۔

شخصیتیں اور خیالات

اسے ممکن معلوم نہ تھا کہ کوئی بات تھی کہ شکاک نہ تھا
ایک ایسے سوئے خیال پر سارے چنگیز بھڑک اٹھے اور حکم دے دیا
کہ یہ بچہ قتل کر دیا جائے۔

اسے جہاں! جو خیال ایک بار پیدا ہوا وہ فنا نہیں ہو سکتا۔ سچ ایک ہا
بولایا تو وہ زندہ رہے گا حالانکہ تو ہیں جو اس پر گولہ باری کرتی
تھیں جلد زنگ خوردہ ہو چکیں گی!

شخصیتیں جنھوں نے زمین پر اتحاد پیدا کرنے کی پہلی کوشش کی
خصمت ہو رہی ہیں۔

لیکن وہ خیالِ عظیم انسانیت کی وحدت، بین قومی عدالت، ممکن نہ کیا کی فوج،
وہ نہ کئے والا خیال جتنا پساپس کیا جائے گا اتنا ہی آگے کو بڑھے گا قتل ہو گا
لیکن قبل مرنے پر ہر بار تازہ اور تبسم امیدوں کو پیوستہ نہیں اٹھے گا!
تم اسے فنا نہیں کر سکتے جب تک انسانی عقل کو لیاریٹ نہ کر دو، تہلے سے
تمام انکار اس کی بڑھتی ہوئی قوتوں کے نیچے دب کر پس جائیں گے۔
اُس کا آثارِ زم ہے، جنگی بیڑے بار بار دروازہ بن جائیں گے تو ہمیں شہر
ہو جائیں گی کپاہی کسان بن جائیں گے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کی محنت
کا پھل حماقت کی لگ میں جھونکا جائے گا بلکہ کام میں لایا جائے گا
تا کہ دنیا بھی اک بہشت ہو جائے!

سلطنت کا پُرانا اور زہرِ مالا خیال مٹ جائے گا!

وہ خیالِ خیال وہ نئی دنیا کا خیال وہ عالمگیر اتحاد کا خیال زندہ ہے گا!
اور آتشِ جہنم بھی اُس کے وجود کو ضرور نہ پہنچا سکے گی!!

کچھیں

شخصیتیں ناکام ہوتی ہیں، خیالات زندہ رہتے ہیں!
ہم کہہ سکتے ہیں "یہ آدمی اچھا ہے" وہ آدمی بڑا ہے!

شہرت کے انعامات کے لئے ایک شاندار جدوجہد برپا ہے!
شخصیتیں حیات و ممات کے معاملے معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں تک
کہ آدمی جاتا ہے۔ پھر ہم جان لیتے ہیں کہ وہ تو فقط اک حادثہ تھا
اور حقیقی شے وہ خیال تھا جس کے ساتھ اُس نے اپنے تئیں
وابستہ کر لیا!

لیکن قتل کر دیا گیا لیکن آزادی کی ترقی ترقی کر گئی!

مذہب گزر گیا لیکن اُس کے خیالات ایک بڑھکے درخت کی طرح پھیلے
اور حقیقی خدا کو اپنے سانے میں لے لیا۔

سفرِ اکوڑم دے کر کیا جون آت آگ کو جلا کر دینے کا تھک گیا، یا وہ
تو محض بلبلے تھے ندی جوں کی توں بہتی رہی!

جنگِ عالمگیر میں سے اک خیالِ عظیم پیدا ہوا ایسا پر عظمت کہ لاکھوں آدمیوں
کے خون کی قیمت اس کے لئے لڑا نہ گئی۔ وہ کیا ہے؟ دُنیا کی حکومت!
آفرکار دُنیا و اقوام نے دیکھ لیا اگر چہ یہ دیکھنے کے لئے انہیں آتشِ جہنم
میں سے گزرنا پڑا کہ انسانیت کو ایک ہونا لازم ہے!

سلاطانی، احریر، فرانسیسی جرمین، امریکن۔ یہ وقت کے افسانے
ہیں، افسانہ انسانیت، ایک انزلی یقین ہے!

ایک ایسا پُر زور خیال، ایسی حیاتِ آفریں قوت، انسانی ہیروئی
کی یہ غیر انجام ممکنات، اہل دُنیا کے لئے ناقابلِ برداشت تھیں۔

تحقیق الائنہ

یورپ کے محققین الائنہ مختلف اوقات میں امّ الائنہ کے متعلق مختلف رائوں کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ کسی زمانہ میں سریانی کو سب زبانوں کی اصل خیال کرتے تھے بعدہ ایک بڑا گروہ اس بات کا مؤید ہوا کہ سنسکرت امّ الائنہ ہے۔ پھر سمجھنے لگے کہ تورانی تہذیب سب سے زیادہ قدیم ہے اور تورانی کا مسکن وسط ایشیا ہی تمام اقوام کا مخزن ہے۔ بالفاظ دیگر یہ کہ تورانی امّ الائنہ ہے۔

بقول رڈ پاٹھ امریکن اب یہ عقیدہ ہے کہ سب زبانیں آپس میں چھوٹی بڑی بہنیں ہیں اور موجودہ زبانوں میں سے ہر ایک قدیم ہے اور یہ سب کسی ایسی زبان کی شاخیں ہیں جو تاریخی زمانہ سے پہلے ہی محدود ہو چکی تھی اور اب دنیا کے کسی حصّہ میں نہیں بولی جاتی۔

کچھ عرصہ سے علمائے یورپ عرب کے آثار قدیمہ کی تلاش میں مصروف ہیں۔ بہت سے کتبے دستیاب ہوئے ہیں جن سے عرب کی قدامت بعیدہ کا ثبوت ہم پہنچا ہے نیز مزید کتبوں اور معلومات کے حصول کی قوی امید ہے۔ اگر عربی آثار سب سے زیادہ قدیم دریافت ہوئے تو اہل یورپ ہمارے اس دعوے کو ماننے کے لئے تیار ہو جائیں گے کہ عرب اور اس کی زبان تمام اقوام دنیا کی زبانوں کا ماخذ ہے ورنہ اب تک تسلیم نہ کرتے تھے کیونکہ اول تو عرب کی تاریخ قدیم سب قوموں سے زیادہ تاریکی میں تھی جس کا سبب تمام متقدم اقوام کے آغاز تہذیب سے پہلے فراموش ہو جانا تھا۔ دوسرے آثار قدیمہ عرب تک ہدیاء عرب کی غوریز غارتگری و تعصب کے باعث اہل یورپ کی رسائی نہ تھی تیسرے قوموں کا اتنا ثابت کرنے میں سب سے بڑا اصل الاصول زبانوں کا الفاظی اتحاد ہے۔ جس میں ~~خود قبائل کے~~ ہوئی۔ کیونکہ ان کے ابتدائی محققین نے عربی ادب کی محض سرسری واقفیت کے سبب سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ سامی و آریں و تورانی۔ زبانوں کے تین خاندان باہم کلیتہً غیما مل و اجنبی ہیں جن میں کچھ محجّات سات الفاظ کے جو اتفاقاً مشابہ نظر آتے ہیں کوئی مطابقت نہیں ہے، اور اسی غلط فیصلہ پر ~~مستویں و متاخرین یقین~~ مستویں و متاخرین یقین کامل کرتے چلے آ رہے ہیں۔

آثار قدیمہ سے اہل یورپ عرب کی قدامت کا ثبوت حاصل کر لینے لگے مگر ~~اور~~ الائنہ ثابت

کرنے کے لئے ان کو ہدایات ذیل پر عمل کرنا چاہیئے ان ہدایات پر عمل کرنا اہل تحقیق کے لئے اعجازِ ناممکن ہو گا تمام دشواریوں کے پہاڑ جو اس وقت حائل ہیں کا فوراً بن کر اڑ جائینگے اور تمام دُنیا میں بجز عربی کے اور کوئی زبان نظر نہ آئیگی۔

۱۔ اس خیال کو ترک کر دینا چاہیئے کہ مشہور متدہ ممالک کے مقابلہ میں عرب جدید التہذیب ہیں یا اُن متدہ ممالک کی زبانیں انکی خود ساختہ ایجاد ہیں اور ان کے اہل زبان علماء لغت کی تشریح و تجزیہ بالکل صحیح ہے۔

۲۔ ہر لفظ کے لئے خواہ وہ کسی ملک کی زبان کا ہو سہ حرفی عربی مادہ تلاش کریں بڑا لفظ ہو تو تجزیر کریں
۳۔ اگر لفظ تحقیق طلب میں ایسے حرف ہوں جو عربی میں نہیں آتے تو قواعدِ فلوجی کے تحت میں اُن حروف کو عربی حروف سے بدل لیں۔

۴۔ اگر لفظ مذکور بلحاظ صورت و معنی عربی میں مل جائے تو فہما۔ ورنہ غور کریں کہ وہ عربی کے کس مادہ کے تحت میں آ سکتا ہے جب ایک مادہ تجویز کر لیا تو دیکھیں کہ اسی مادہ کے مشتقات میں لفظ مطلوبہ کہے غیر زبان والے معنی کہیں شامل ہیں یا نہیں۔ اگر شامل ہیں تو دیکھنا چاہیئے کہ اُس مادہ سے کسی عربی قاعدہ صرف کے تحت میں لفظ غیر کا ہمشکل بن سکتا ہے یا نہیں مگر بن سکتا ہے تو سمجھ لیں کہ وہ اسی مادہ سے ہے مگر دوسرے قاعدہ عربی سے بنا لیا ہے۔ اگر شامل نہیں تو تحتِ فلوجی دوسرا ہمشکل مادہ تلاش کریں۔ علیٰ ہذا القیاس۔

۵۔ مطابقت کے وقت قلیل الاستعمال قواعد صرف پر بھی نظر رکھیں جن میں سے بعض اگرچہ متداولہ کتب صرف عربی میں مذکور نہیں مگر ان کے تحت میں بنے ہوئے بُت سے الفاظ کتب لغات میں لکھے ہوئے ملتے ہیں۔

۶۔ الفاظ کے معانی کی مطابقت کے وقت انکے خصوصی لوازم کو مقدم قرار دیں صرف عمومی قرینہ پر اکتفا کرنا جیسا کہ علماء یورپ کا طریقہ ہے محض غلطی ہے۔

عمومی قرینہ کو کافی سمجھنے کی ایک مثال مولوی شبلی نے الفاروق میں نقل کی ہے اور وہ یہ کہ دیوانِ دفتر۔ دبستان۔ دبیر۔ چاروں لفظ فارسی مادہ دب سے جس کے معنی نگاہداشتن ہیں بنے ہیں۔ مگر ان چار لفظوں کے پہلے دو و حرف تو قائم مقام دب کے ہیں جو تبدلی یا اصلی حالت میں ہیں اور ستان بمعنی

جگہ فارسی کا متعارف لفظ ہوا۔ باقی وان۔ تر۔ تیر کے کیا معنی؟ یہ نہیں بتایا۔ کہہ سکتے ہیں کہ بان علامت فاعلی فارسی ہے جیسی مہربان میں اس کا مبدل وان ہے مگر تر۔ یر پھر بھی مہجول المعنی رہے۔ مجبوراً تر کے مشہور معنی بسیار لینے عربی میں دیوان کے معنی ہیں فراہم آمد نگاہ کتب و کتاب کہ درآں لشکریان و اہل عطیہ مکتوب باشند یہ معنی اہل عرب کے بیان کئے ہوئے ہیں اور انہوں نے یہ نام اور اس کے معنی اہل فارس سے پائے تھے اس واسطے یہ لفظ مہجول اپنے مفہوم کے فارسی سمجھا گیا ہے۔ ہندوستان کی فارسی میں دیوان کے معنی مختار کل یا وزیر اعظم یا نائب حاکم کے ہیں چنانچہ عالمگیر نے داراشکوہ کے مختار پہاڑاں کو رعایت عالمگیری میں دیوان سرکار برادر نامہربان کہا ہے اور اب تک یہ نام اسی معنی میں مشہور ہے چنانچہ خانقاہ اجمیر شریف کے سجادہ نشین دیوان جی کہلاتے ہیں یعنی خواجہ صاحب کے دیوان اور چیتوڑ کے رانا سری دیوان جی سے مخاطب ہوتے ہیں یعنی انکے دیوتا ایکنگ جی کے (جو پاس کے پہاڑی مندر میں ہیں) دیوان۔

دیوان کے ایک معنی قاضی یا منصف یا جج کے بھی ہیں چنانچہ عبد الباقی دیوانی کے لفظ میں دیوان کے یہی معنی ہیں۔ پانچویں معنی مجموعہ اشعار کو کہتے ہیں چنانچہ شاعروں کے کلام کے مجموعہ کو دیوان کہتے ہیں اب ہم ان سب کی شرح لکھتے ہیں۔

(۱)۔ کتب خانہ عربی دیخ و غن کا مخفف و مبدل ہے کیونکہ دیخ از دوح بمعنی کتاب نگاشتہ و غن بمعنی جائے حفاظت۔

(۲)۔ رجسٹرفوج و اہل عطیہ۔ دیوان از دین مثل جز و اض و جرواط حساب خدمت و پاداش (انعام و تنخواہ) خادمان و بندگان ہدیانت دارندہ۔

(۳)۔ نائب حاکم یا وزیر یا مختار آن دیوان مبدل و دیوان از دین۔ مردے کو درخت کے کارند

(۴)۔ منصف یا قاضی دیوان از دین آیہ مالک یوم الدین میں دین کے معنی عدل و انصاف ہیں۔

(۵)۔ مجموعہ اشعار اصلاً فتح و غن ہے فتح کلام روشن و واضح و غن بمعنی مجموعہ۔

دفعہ کو لنت نویسان عرب نے معرب نہیں بتایا۔ بلکہ خالص عربی قرار دیا ہے۔ مگر محبوبان عجم ہرتی نے جس طرح اوصد ہا عربی الفاظ کو فارسی الاصل ٹھہرا دیا اسی طرح اسکو بھی فارسی کہہ دیا ورنہ یہ اصلاً نفتر مادہ نفتر سے ہے۔ اظہار مبالغہ کے لئے عین کلمہ کو اول میں اضافہ کر کے غفعل کے وزن بنا لیا ہے جیسے رقت سے قرقٹ۔ نفتر کے معنی برگ ہائے درخت، بشتنی یا بشتہ فراہم کردہ اسی واسطے لغات عرب میں نفتر کا

ترجمہ دفتر کیا ہے اور مادہ فتر میں درج ہے۔ تَد متبادل ہیں رواج کا غذ سے پہلے درختوں کے پتوں پر لکھا کرتے تھے۔ ہندوستان میں بھوج پتر لکھنے کے کام آتا تھا اسی فتر سے ہندی پتر بمعنی برگِ درخت بنا ہے ہندی میں چٹھی کو پتری اور برہمنوں کے متعلقہ علائقہ جو تشر کو پتر اسی واسطے کہتے ہیں کہ پہلے پتوں پر لکھے جاتے تھے۔ کاغذ کو پتر اس واسطے کہتے ہیں کہ وہ پتوں کی جگہ کام آیا ہے۔

دبستان میں دَب عربی دَب بمعنی طریقہ مذہب و عدل و نرمی اختیار کروں یا آموختن میں تعلیم کے بہترین مقاصد یہی ہو سکتے ہیں۔ ستان فارسی کو ستھان ہندی کا متبادل بتاتے ہیں۔ مگر ستھان عربی سلطان بوزن انسان بمعنی جائے ہموار یا مکان مُستف ہے دَب ستھان کے معنی تعلیگاہ مذہب و اخلاق و سیات ہوئے جس کا لگاؤ دبستان ہے۔

دبیر اصلاً خیر از خبر بلفظ دال بمعنی کاتب و دفتری و مثلنحوان۔ ض کا د بنالیا اہل نظر دیکھ سکتے ہیں کہ عربی ہر لفظ کی اصلی و حقیقی شرح بتلاتی ہے اور فارسی شرح صرف ایک اوپری بے محل قرینہ ہے جو مقصود سے تقریباً بعید ہے۔ کیونکہ صرف نگہبان سب کے معنی میں کہہ دینے سے تمام الفاظ کی جداگانہ لازمی خصوصیات شائع فارسی کے پیٹ میں رہ جانے کے سبب سے سامع کو معلوم نہ ہو سکیں اور صرف نگہبان کا لفظ عام سمجھ میں آیا جس میں گنجائش ہے کہ دیوار بمعنی نگہبان خانہ۔ دوات بمعنی نگہبان سیاہی۔ دوش بمعنی نگہبان دست دُور بمعنی نگہبان درازئی فاصلہ دیر بمعنی نگہبان درازئی وقت دیر بمعنی نگہبان اصنام وغیرہ اپنے دل میں قرار دیکر سب کو دَب کے مادہ سے سمجھ لیں۔ پس فارسی شرح ایک یخبرانہ تحقیق ہے بھروسہ کے لائق نہیں۔ خود دَب فارسی عربی دَب سے بنا ہے جس کے معنی نکتہ چینی و سیاست ہیں جو نگہبانی کے مرادف ہیں۔ یہ بات کہ عجی لغت نویسیوں کی تشریحات ناقابل اعتبار ہیں مندرجہ بالا تشریحات سے ثابت ہو گئی ہے نیز یہ کہ ان کی اصلاحی غلط ہو جاتی ہے جیسے ضمیر کا دبیر بنگلیا اور یہی ان کے عربی سے غیر ہونے کا سبب ہے۔

۴۔ اہل تحقیق کو خود عربی ڈکشنریاں بھی بعض دفعہ دھوکا دیتی ہیں کیونکہ ان کے لکھنے والے فلو بوج سے واقف نہ تھے نہ انہوں نے الفاظ کے خصوصی لوازم سے سروکار رکھا۔ جن الفاظ کا تلفظ فن کتابت سے پہلے ہی بدل گیا تھا ان کو لغت نویسیوں نے اپنے زمانہ کی مشہور قراءت کے موافق ان مادوں میں درج کر دیا جن کے تحت میں وہ موجودہ قراءت کی بنا پر آ سکتے تھے حالانکہ بلحاظ خصوصیات معنی وہ اس مادہ سے متعلق نہ تھے۔ اس لئے ان کا مفہوم اپنے مندرجہ لغت مادہ سے غیر بن گیا اور اسی مغایرت کی وجہ سے بعض علماء نے انکو مغرب

قرار دیا جیسے لینہ یعنی کھجور کا دخت لین کے مادہ میں درج کرو یا حالانکہ لون سے متعلق تھانیل کو جو دریائے مصر کا نام ہے نہ ی ل میں درج کرو یا حالانکہ نول سے متعلق تھا یا بعیر اوند کا نام اصلاً بحیر تھا مگر اسکا تلفظ فن کتا بت سے پہلے بدل گیا تھا اسلئے بعیر کو ہاں لغت نے بحر کے مادہ میں لکھ دیا پس اہل تحقیق کو چاہئے کہ ہمیشہ عربی لغات میں لکھے ہوئے مادہ پر منحصر نہ ہوں بلکہ اسکے ہر شکل یا دونوں میں لفظ تحقیق طلب کے منصوبی لازم کو تلاش کریں مثلاً اخیر یعنی نوینہ دکاتب غیرہ کی بابت شبہ ہو تو اسکا ہر شکل زیر پر جو وہ ہے کیونکہ اسکے مادہ زیر میں معنی نوشتن و خط و کتابت کردن ہیں جس کی آواز دو ز دونوں کے مطابق ہے۔

تجزیہ کی مثال یہ کہ کٹا کٹساں ہندی لفظ بمعنی سکہ بنایا کٹا کٹا ہے درج حرفی ہے یہ معلوم ہے کہ سال ہندی میں گھر کو کہتے ہیں اسلئے اسکے دو ٹکڑے ٹک۔ سال۔ کر لئے۔ اب ٹک کو عربی صورت میں لا اسنی تلاش کئے تو کٹا۔ نکات۔ تقی بطق سے کچھ پتہ نہ لگا تقی ثلاثی اور کچھ بمعنی معلوم ہوا مگر مطابقت معنی اس میں بھی کچھ نہیں ملی خیال ہو کہ مادہ وقع سے تقی بن سکتا ہے صیغہ وقع سے تقی بنایا جو اصل ہے تقویٰ کی اسی طرح وقع سے تقی بن گیا جو ہم معنی وقع ہے۔ تقی کا مخففت تقی اور ہندی میں ٹک ہو گیا وقع کے معانی کا استنباط ہے۔ دھات کے ٹکڑے کاٹ کر انکو سنگ فسان پر چلا دینا اور صرف نشان نقش کرنا یہی صورت قدیم سکہ سازی کی ہے۔ سال عربی میں ثال فاعل ثل ہے اسکے معنی میں مویشی اور آدمیوں کے آرام کر نیکے لئے آراستہ درخت دار گھر ہندی میں عام ہو گیا اسلئے استعمال غرض ٹکسال کے معنی سکہ بنایا کٹا کٹا ہو اسی مطلوب تھا۔ خیال ہوتا ہے کہ ٹکسال کے معنی ٹکے بنایا کٹا کٹا ہو گا۔ مگر ٹکڑے کو کہتے ہیں اور ٹکسال میں پیسہ روپیہ اشرفی بھی کہتے ہیں اس لئے یہ شرح درست نہیں۔

اصلاً ٹک مخففت و مبذل تہ تہ کا ہے تہ کے معنی دو تہ دوسری صورت وقع کی ہے جیسے ضعتہ دوسری صورت ضع کی ہے۔ تہ تہ کے معنی دو پیسہ یا ٹک۔ اہل یورپ تلاش کرتے ہیں کہ ٹکسال یا ٹک اپنی اصلی صورت میں لکھا ہوا اہل جلے سویا حلوائے بے دو د کہاں رکھا ہے۔ یہ تو بت ہو سکتا تھا جب ہندی سے عربی میں یہ الفاظ منتقل ہوتے جیسے ٹکر ٹھا کر کا مغرب ہے اور اہل عرب نے راجپوت ٹیسان سندھ سے سنا تھا مگر راجپوتانہ میں ٹھا کہتے ہیں ہندی میں اسکی شرح ٹھاہ گرو کرتے ہیں۔ ٹھاہ بمعنی جگہ گرو بمعنی آقا یعنی آقائے مقامی عربی میں ٹھاہ کے مقابل تاہ بمعنی زمین یا قلعہ بلند ہے کہ بمعنی فوجدار و سیاست کنندہ تمام ٹھاہ گروھیاں رکھتے ہیں۔

گرو مذہبی اُستاد کو کہتے ہیں۔ راجپوتانہ میں گرو کہتے ہیں یہ عربی لفظ گروہوزن فعول از کر و بمعنی قائم اہل در عبادت خدا و عظ و ذکر بندگی بسیار گویندہ و باجرت کا کہ کنندہ گرو اپنے چیلوں سے خدمت اور تنخواہ بھی لیتے ہیں۔

باقی آئندہ

تیسری

کلام خسرو پر اعتراضات

تحقیقی جواب

امیر خسروؒ بہ بازی سوئے من آید بہ شوخی دل ز من بست
بدو گفتم چہ خواہی کرد گفت کارے آید
عام محاورہ بکار آمد ہے کار آمد امیر خسرو کے سوا اور کسی کے کلام میں نظر سے نہیں گزرا۔

شعر العجم مولانا شبلی حصہ دوم بیان امیر خسرو صفحہ ۱۸۰

امیر خسروؒ سالما شد کہ نسیا ہم خبر و در کویت دل ویران شدہ را آیم و آواز کنم
من از سر زندہ گردم گر تو یار ایک سخن گوئی تو مے داغ نجوئی لیک من گفتا ریگویم
دعوائے خوں بہائے دل خویش مے کنم یک بوسہ بر لبم زن و مالا کلام کن

امیر نے ایسے بھی بہت سے محاورے باندھے ہیں جو ان کے سوا کسی اور اہل زبان کے کلام میں
نہیں ملتے مثلاً از گردہ او چہ میرود

آواز کردن پکارنا
گفتا ریگویم یوں ہی ایک بات کہتا ہوں
مالا کلام کردن کسی کو ساکت اور بند کرنا

اس بات نے بدگمانوں کو موقع دیا ہے کہ یہ ہندوستان کی سکونت کا اثر ہے کہ ہندی محاورے
ان کی زبان سے نکل جاتے ہیں ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن چونکہ ہم کو اپنے تتبع اور استقراء پر اعتماد نہیں اس
لئے ہم اس بدگمانی میں شریک نہیں ہو سکتے

شعر العجم حصہ دوم صفحہ ۱۸۱ و ۱۸۲

مردن مراست از گردہ او چہ مے رود

شعر العجم حصہ دوم صفحہ ۱۸۲

لے امیر خسروؒ جان میرود زن چو گردہ میرود
کے کلام

اس کو مولنا شبلی مرحوم کی مضمّن نفسی کیسے یا ارادتمندی کہ وہ اس بدگمانی میں بدگمانوں کے ساتھ شریک نہیں ہیں بخلاف اُن مُصنّفین کے جنہوں نے اپنی استقراء اور تتبع پر بھروسہ کر کے اسی قسم کے شبہات کو سنگین اعتراضات کے لباس میں ظاہر کیا ہے عبدالباسط مُصنّف شرع الشعراء نے باب پانزوم در پیروی طریقت شعرا میں لکھا ہے کہ

استواری صارت امیں فن را لازم ست کہ اعتماد بر محاورہ شعرائے ہندوستان نکلند ہر چند از کمال ترینان باشد چنانچہ بعض محاورہ اشعار امیر خسرو دہلوی کہ خسرو شاعران بودست نیز خالی از شبہ ناپسند

مطابق ہندوی دقتے بطریق ظرافت مبتہ باشد — چنانکہ دریں بیت امیر مذکور ہے

اوسے رود بنار و گرہ سے زند بزلالت

مردن مراست از گرہ اوچہ سے رود

از گرہ اوچہ سے رود غالب کہ محاورہ از گرہ اوچہ سے رود مطابق ہندوی مبتہ باشد جائے دیگر بنظر

نیامدہ -

غالباً مولنا شبلی مرحوم کا ماخذ ان شبہات کے متعلق ہندوستانی محققین کی تصانیف ہی ہوگا کیونکہ ایرانی مُصنّف کا کوئی اعتراض اس قسم کا ہماری نظر سے نہیں گزرا۔

ہمارا حسن عقیدت جو ہم کو حضرت امیر خسرو کے کلام و کمال سے ہے ان شبہات کے قبول کرنے سے روکتا ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ امیر خسرو اگرچہ ہندوستان میں بمقام پٹیالی ضلع ایٹ پیدا ہوئے لیکن انکی گھر کی زبان فارسی ہی تھی اُن کی ماں عماد الملک کی بیٹی تھیں جو مشہور امرائے شاہی میں تھے اُن کی گھر کی زبان بھی فارسی تھی۔

اگر والد افغانی کی روایت پر اعتبار کیا جائے تو امیر خسرو باپ کے ساتھ ہندوستان میں آئے ہیں اس صورت میں وہ ہندی نژاد بھی نہیں ہیں۔ لیکن یہ روایت اور تمام تذکرہ نویسوں کے خلاف قابل اعتبار نہیں ہے۔

دس سال کا بچہ ماورے زبان سیکھ جاتا ہے اگر کوئی خاص وجہ غیر اہل زبان لوگوں میں آمیزش کی نہ ہو تو اُس کی زبان بیرونی اشارات سے محفوظ رہے گی۔

امیر خسرو امیر زادہ تھے اُن کے والد سید

ترکستان کے رئیس تھے اور ہندوستان

میں اگر سلطان محمد تغلق کے دربار میں ممتاز عہدہ پر مامور ہوئے پس کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ امیر خسرو کی زبان پر اس قدر جلد ہندوستان کی مانند بود کا اثر پڑا ہو۔

ان وجہ سے حضرت امیر خسرو کی مادری زبان فارسی اور اکتسابی زبان ہندی مروج الوقت قرار پاتی ہے ہمیشہ اکتسابی زبان میں نظم کی پابندی اور خیالات کی ترجمانی سے لغزش ہو سکتی ہے اور اس کی یہ وجہ ہے کہ ہمیشہ جو خیال انسان کے دماغ میں پیدا ہوتا ہے وہ اُس کی مادری زبان میں پیدا ہوتا ہے پھر خواہ اُس کو کسی زبان میں ترجمہ کر کے ظاہر کیا جائے۔

امیر خسرو کی مادری زبان فارسی ہے اُن سے یہ متبعہ معلوم ہوتا ہے کہ جو خیال اُن کے دماغ میں پیدا ہو وہ اُس کو فارسی میں ظاہر کریں دراصل ایک وہ فارسی ہی میں ادا کرنا چاہتے ہوں۔

امیر ابو سعید مسعود سعد سلمان لاہوری بھی حضرت امیر خسرو کی طرح ہندی خزاہیں اور امیر خسرو کی طرح ہندی زبان کے بھی شاعر ہیں لیکن اُنکی فارسی زبان میں ہندی محاورات کی آمیزش بیان نہیں کی جاتی یہ ضروری نہیں ہے کہ جو ہندی خزاہیں اُس کی مادری زبان فارسی نہ ہو اور اُس کی زبان میں ہندی محاورے اور ہندوستان کی سکنیت کا اثر پایا جائے۔

بعض محققین ہند کو اُن کی غایت احتیاط و عزم نے متشکک و متوہم بنا دیا ہے وہ جب تک ایک محاورہ کو چند فارسی شعر کے کلام میں نہ دیکھ لیں اطمینان نہیں ہوتا۔ چنانچہ خان آرزو نے اسی قسم کے اعتراضات تنبیہ الغافلین میں شیخ علی عزہین پر وارد کئے ہیں کہ یہ محاورہ شیخ کے سوا اور کسی کے کلام میں نہیں دیکھا گیا جن میں سے اکثر کے جواب مولوی امام بخش مہسائی نے قول فیصل میں دئے ہیں۔ میرے نزدیک یہ کوئی مقبول وجہ اعتراضات کی نہیں ہو سکتی اور نہ اس کی ضرورت ہے کہ جو محاورہ کسی اہل زبان نے لکھ دیا ہے جب تک ہم اُس کو چند دیگر شعراء فارسی کے کلام میں نہ دیکھ لیں اس پر اعتبار نہ کریں۔

یہ ناممکن ہے کہ کسی زبان کے کل محاورے قید نظم میں آگئے ہوں اور کوئی محاورہ نظم ہونے سے باقی نہ رہا ہو۔ اہل ایران سے ہزاروں ایسے محاورہ سننے میں آتے ہیں جو اب تک کسی نے نظم نہیں کئے ہیں زبان شعر بہت مختصر سی زبان ہے اکثر پیشہ وروں کے محاورے مستورات کا روزمرہ۔ اور تقریبات کی رسمیں وغیرہ نظم میں نہیں آتے۔ اگر شیخی طہمہ کا کلام اور میر سخات اصفہانی کی گل کشتی ہاے پاس نہ ہو تو تم نہ کھانوں کے نام نہ کشتی کے داؤ بیچ سعدی و حافظ کے کلام سے معلوم کر سکتے ہیں اور نہ لوری جو خاقانی کے قصائد اس بارہ

نیں کچھ ہماری مدد کرتے ہیں۔

اسی طرح اور دوسرے پیشہ وروں کی زبان پر قیاس کر لینا چاہیے۔
اس بنا پر میری خوش اعتقاد ہی ان تمام شبہات کو صحیح نہیں سمجھتی جو امیر خسرو کے کلام پر متشککین
نے کئے ہیں +

(۱)۔ امیر خسرو سے بہ بازی سوئے من آمد بشوخی دل من بست بدو گفتم چہ خواہی کرو گفتم کارے آید
کہا گیا ہے کہ عام محاورہ بکار آمد ہے امیر خسرو کے سوا اور کسی کے کلام میں نظر سے نہیں گزرا۔ نظر
سے نہ گزرتا تو کوئی معقول دلیل تغلیط نہیں ہے۔ دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں ہو سکتا کہ جس کی نظر سے
ان تمام شعرا کا کلام گزرا ہو جو آغاز شاعری سے آج تک ہر ملک و ہر دیار میں ہو چکے ہیں۔ لیکن اس کی
نظیر تو ظہیر فاریابی کے کلام سے ہم پیش کر سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ۛ

جائے چاکے در گر بیابانم نہاند
لے ظہیر امروز کار آمد نہ ذہیل

اس کے علاوہ اہل ایران کا قاعدہ ہے کہ وہ حرف ظف کو خواہ یلے موعده ہو یا در ہو اکثر
روزمرہ میں حذف کر دیتے ہیں۔ جیسے ماہے می آید ایک مہینہ میں آتا ہے۔ سالے میر و دایک سال میں
تجاتا ہے شب میر سدرات کو آتا ہے شعر میں بھی اکثر ایسا دیکھا گیا ہے سعدی ۛ

شب تاریک دوستان خدا

مے بتابد چوروز رخشنده

یعنی دوستان خدا در شب تاریک چوروز رخشنده می تابند۔ ظہیر فاریابی ۛ

گرفت عمرو نیا مد شے بسا لینم

بکار من چونیا مد چہ کارے آید

صرح ثانی بکار آمد و کار آمد دونوں کی سند ہے یعنی بچہ کار آمد کی جگہ چہ کار آمد حرف ظف
کو محذوف کر کے کہا ہے عام محاورہ بچہ کار آمد ہے امیر خسرو کا شعر ہے ۛ
ہم رسید جانم تو بیا کہ زندہ مانم پس زندانم نہانم بچہ کار خواہی آمد

سالماتد کہ نیام خبر و در کویت
 دِل ویران شدہ را اَکیم و آواز کُنم (۲)
 آواز کردن خلافت محاورہ بتایا جاتا ہے میں اس کو بھی تسلیم کرنے کے لئے لیاز نہیں ہوں۔
 ظہیر فاریابی کا شعر میرا موید ہے ۷

ناخن بدل زدن بطرب ساز مے کُنم
 آں زہرہ چہرہ را بخود آواز مے کُنم
 اگرچہ ظہیر کی پسند کے بعد کسی دوسری نظیر کی ضرورت نہیں مگر ابو الفضل کا ایک شعر ناخواستہ
 زبان پر آ گیا ہے از دفتر بسوم ابو الفضل ۷

مطرب ترا نہ شب غم سازی کُنم
 غمہائے رفتہ را بخود آواز مے کُنم
 ابو الفضل معمولی شخص نہیں ہے اور جبکہ اُس کی تائید میں ظہیر فاریابی سا سلم الثبوت اہل
 زبان ہے تو ابو الفضل کے کلام کا وہی پائیدہ ثبوت ہو سکتا ہے جو ایک ایرانی اہل زبان کا ہونا چاہیئے
 (۳)۔ امیر خسرو

تومی دامنم نگوئی لیک من گفتار می گویم
 گفتار گفتن محل نظر ہے۔ یہ شبہ دو وجہ سے ناشی ہوتا ہے ایک یہ کہ عام محاورہ سخن گفتن ہے۔ اور
 امیر خسرو نے گفتار گفتن کہا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسکا ترجمہ فصیح اردو میں مولنا شبلی نے دیوں ہی ایک بات
 کتا ہوں) کیا ہے امر اول کی بابت یہ گزارش ہے کہ جو کچھ منہ سے کہا جائیگا اُس کے لئے گفتن ہی کا کوئی
 صیغہ استعمال ہوگا جیسے سخن گفتن شعر گفتن دعا گفتن سلام گفتن ترانہ گفتن تہنیت گفتن
 گفتار گفتن کا حاصل بالمصدر سہی لیکن ہے تو سخن کا مرادف ہم جہاں لفظ سخن بول سکتے ہیں
 وہاں گفتار بھی کہہ سکتے ہیں سخن شیرین گفتار شیرین سخن تلخ گفتار تلخ پھر اگر سخن گفتن کی جگہ گفتار گفتن کہا گیا
 تو اس میں مخالفت محاورہ کیا ہے۔ محض قافیہ کی ضرورت سے بجائے سخن اُس کا مرادف گفتار کہا گیا ہے
 جیسے کوئی پا زدن کی جگہ قدم زدن یا ساغر زدن کی جگہ ساگیں زدن کے تو ہرگز قابل اعتراض نہیں ہو سکتا
 کیونکہ پا اور قدم ساگیں اور ساغر مرادف ہیں۔ اسے کلیہ سمجھنا چاہیئے کہ کسی لفظ کا مرادف لانے سے

محاورہ میں اختلاف نہیں ہوتا۔ الاما شاء اللہ ایسے مواقع پر مطالبہ سند لازم نہیں یہ عام طور پر شائع ہے۔
 دوسرے اس کا ترجمہ روزمرہ اردو کے مطابق نہیں کرنا چاہیئے۔ اہل فارس کا محل استعمال بیش نظر
 رکھ کر ترجمہ کرنا چاہیئے۔ اہل فارس کا محل استعمال صرف یہی ہے کہ میں بات کتا ہوں۔ اس موقع پر بات کی جگہ
 سخن بھی کہیں گے اگر اُس کا مراد گفتار بغیر درت قافیہ کما گیا تو اس میں میرے نزدیک کچھ قباحت نہیں ہے
 (۴۷)۔ امیر خسرو جان میر و دز تن چو گرہ سے زند بزلف

مردن مراست از گرہ اوچہ سے رود

از گرہ گرفتن براعتراض ہے۔ پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جو چیز جس ظرف میں ہوگی جب وہ اُس سے
 نکل جائیگی یا جاتی رہے گی تو اُسی ظرف کی طرف منسوب کر کے کہیں گے مثلاً از دست رفت۔ دامن از کف رفت
 موزہ از پارفت آب از مشک رفت۔ جان از جسم رفت اور جب کوئی چیز کسی ظرف میں موجود ہوگی تو اُسی
 ظرف کی طرف منسوب کر کے کہیں گے مثلاً دامن در دست ہست زرد کف ہست موزہ در پاہست آب
 در مشک ہست۔ یہ محل استعمال عام ہے جو چیز جس ظرف میں ہوگی اُسی کے ساتھ نسبت کی جائیگی۔ اب
 سنئے گرہ بھی ایک ظرف ہے جب کوئی چیز گرہ میں ہوگی تو کہیں گے در گرہ ہست۔ چنانچہ مرزا صاحب
 نے گرہ کو ظرف قرار دیکر کہا ہے ۵

نیست چوں نافہ حاجتِ اظہار

در گرہ مُشکِ ناب اگر داری

اگر مُشک گرہ سے نکل جائے تو اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ مُشک از گرہ رفتہ اب امیر

خسرو کا شعر پڑھئے ۵

امیر و دوز باز و گرہ سے زند بزلف

مردن مراست از گرہ اوچہ سے رود

مقصود یہ ہے کہ میری جان اُس کی زلف میں ہے وہ زلف میں گرہ دیتا جاتا ہے یعنی اُسے
 مروڑتا جاتا ہے اس صدمہ سے مری جان جو زلف میں پھنسی ہوئی ہے نکل جائیگی اور میں مر جاؤں گا

ملہ مولانا شبلی مرحوم نے کسی غلط نسخہ سے یہ شعر نقل کیا ہے صحیح نسخہ یہ ہے ۵ امیر و دوز باز و گرہ میر زند بزلف

شرع الشعرا میں اور ہمارے پاس جو نسخہ ہے اُس میں اسی طرح ہے۔

زلف کی گرہ سے کچھ نہیں جائیگا۔

او کی ضمیر زلف کی طرف راجح ہے نہ کہ زلف والے کی طرف عجب نہیں کہ او کی ضمیر صاحب زلف کی طرف راجح کرنے سے یہ شبہ پیدا ہوا ہو۔

یہ نکتہ فراموش کرنے کے قابل نہیں ہے کہ جیسے امیر خسرو نے گرہ زلف سے مضمون پیدا کیا ہے اسی طرح مرزا صائب نے گرہ نافہ سے مضمون نکالا ہے دونوں شعروں میں بنائے مضمون گرہ ہے اس لئے دونوں شعر ایک حد تک متحد اور ایک ہی محاورہ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

یہ محض اتفاقہ امر ہے کہ اردو کا محاورہ (گرہ سے جانا) اس اسلوب بیان کے مطابق ہے اسی وجہ سے اس شبہ کو زیادہ تقویت ہوئی۔ شرح الشعرا کا یہ فقرہ کہ مطابق محاورہ ہندی بستا باشد کہ جائے دیگر بنظر نیامدہ پڑھ کر مرزا صائب کا مرقوم بالا شعر پڑھیے اور اس کی تحقیق و زباندانی کی داد دیجئے۔

اکثر محاورے فارسی اور اردو کے مطابق ہیں مثلاً فارسی میں تراچہ افتادہ اور اردو میں تھکڑ کیا پڑی دونوں ایک ہی ہیں خواجہ حافظ

برو بکار خود اسے و احتضایں چہ فریاد دست

مرا فتاد دل از کف ترا چہ افتاد دست

ذوق دہوی

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو

تجھ کو پرانی کیا پڑی اپنی نیمیر تو

دھوئے خون بہائے دل خویش می کنم

یک بوسہ بر لبم زن و مالا کلام کن

(۵) امیر خسرو

مالا کلام کردن بمعنی ساکت کردن پر اعتراض ہے۔

ہم نے اس شعر کو نسخہ مطبوعہ و قلمی دونوں میں اسی طرح لکھا دیکھا ہے۔ اگر اس میں کاتب کی غلطی و تصرف نہیں ہے تو ضرور ایک عدالتی اصطلاح ہے مالا کلام بیج قطعی کو کہتے تھے اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اب تک جے پور کی عدالتوں میں (جو اسلامی عہد سلطنت کے کمنہ نقش و نگار ہیں) یہ اصطلاح مروج ہے۔ یہاں اکثر دیگر اصطلاحیں دفاتر شاہی سے منتقل ہو کر آئی ہیں غالباً امیران کی عدالتوں میں یہ اصطلاح مروج ہو گئی یا خاندان تغلق کے زمانہ حکومت کی یہ اصطلاح ہو گئی۔ اس خیال

کا مؤید دعویٰ خوں بہا شعر میں موجود ہے۔ اسکو ہندی محاورہ کا ترجمہ فارسی بھی نہیں کہہ سکتے اردو میں ایسا کوئی محاورہ بھی موجود نہیں ہے کہ یہ خیال کیا جائے کہ ہندی محاورہ کو فارسی میں ادا کر گئے ہیں نہ اس خیال کی گنجائش ہو سکتی ہے کہ ہندی فارسی کے خلاف ایک جدید محاورہ ایجاد کیا گیا ہے۔ قدما کے کلام میں ایسے بہت محاورے ملتے ہیں جو اس زمانہ کی زبان میں نامانوس اور اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ زبان ہر زمانہ میں رنگ بدلتی رہتی ہے چونکہ ہیکو ۷ سو سال پیشتر کی زبان سے کلیتہً واقفیت نہیں ہے ہماری واقفیت صرف اُسی حصہ زبان تک محدود ہے جو بذریعہ کتب ہم تک پہنچی ہے اس لئے ہر ایسا لفظ ہر ایسا محاورہ جو ہم نے مردوجہ کتب میں نہیں دیکھا۔ ہیکو نامانوس وغیرہ فصیح وغیرہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ شاہنامہ پڑھیں کوئی صغہ آپ کو ایسا نہیں ملے گا جس میں چند لفظ نامانوس نہ ہوں اور ان کی سند بھی بجز شاہنامہ کے اور کیں نہیں ملے گی اگر لاکلام کر دن کوئی اصطلاح نہیں ہے تو ضرور اس شعر میں کتابت نے تحریف کی ہے اور یکے بعد دیگرے نقل در نقل ہوتے ہوئے یہ غلطی عام ہو گئی ہے میرا خیال ہے کہ مصرع ثانی اصل میں یوں ہو گا کہ

یک بوسہ بر لبم بزن ولاکلام کن

کاتب نے بزن کی جگہ زن اور لاکلام کی جگہ ملاکلام لکھ کر شعر مسخ کر دیا ہے۔

اس صورت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ جیسے لاجرم لابد لاریب اسی طرح لاکلام۔ امیر خسرو نے یہاں بھی لاکلام کو بے سخن کا مراد استعمال کیا ہے جو شخص بے سخن ہو گا وہ ضرور خاموش ہو گا۔ مصرعہ

یک بوسہ بر لبم بزن ولاکلام کن

ایک بوسہ دیکر مجھے خاموش کر دے۔ واللہ اعلم

علامہ شبلی مرحوم نے شعرا جمع کئے صفحہ ۱۰۹ میں امیر خسرو کی یہ رباعی نقل کی ہے

ہر موئے کہ در دوزخ آں صنم است صد بیضہ عنبرین براں موئے صنم است

چوں تیر بیاں راس دلش را زیراک چوں خر بلوزہ دندانیش درون شکم است

مولانا نے مصرع اول پر نوٹ دیکر لکھا ہے کہ جس نسخہ سے یہ رباعی نقل کی ہے وہ غلط تھا میں نے

اسی طرح نقل کر دیا۔ ہمارے خیال میں رباعی کے مصرعہ اول پر اور کوئی وجہ نوٹ دینے کی نہیں ہو سکتی بجز اسکے کہ اس مصرع کا وزن ناماموس ضرور ہے اسی سے مولانا کو اس پر ناموزونی کا شبہ ہوا اور نہ سنی میں

کچھ اخلاق نہیں ہے۔

بے شک یہ مصرعہ رباعی کے عام اوزان سے ایک علیحدہ وزن رکھتا ہے لیکن ناموزون نہیں ہے رباعی کے اوزان ہی میں یہ بھی ایک وزن ہے۔ مصرعہ موزون ہے اور اسکا وزن عسرو ضیٰ ارب۔ مکفوف۔ مجتبیٰ۔ ازل۔ مفعول۔ مفاعیلن مفعول فاعول ہے اور تقطیع یہ ہے۔

ہر موعئے مفعول کہ درد و زل۔ مفاعیلن۔ فی آاص۔ مفعول۔ نعت۔ مفعول۔
جس شخص کو زحافات عروض معلوم ہوں گے اس کو بھی اس مصرعہ پر ناموزون ہونیکا شبہ نہیں ہو سکتا

راقم
سید مشتاق حسین اطہر ثنائی ہاپوڑی وکیل چمپوڑا

پھول

پھول مایوس دلوں کی اُمیدیں ہیں۔

پھول وہ الفاظ ہیں جنہیں ایک نکتہ پتہ بھی سمجھ سکتا ہے۔

پھول خدا کی سب سے پیاری مخلوق ہے جس میں وہ رُوح پھونکنا بھول گیا۔

پھول ہماری طرف فقط اشارہ کرتے ہیں لیکن اُن کی اصلی باتیں خدا اور آسمان سے ہوتی ہیں۔

پھولوں کی خوشبو فضا میں آوارہ رہ کر زیادہ شیریں ہو جاتی ہے جہاں وہ بے خود و بے تاب رہتی ہے جیسے کسی ساز کے نغمے۔

قادرِ مطلق خدا آسمان پر اپنا نام چمکتے تاروں میں لکھتا ہے اور زمین پر ننھے ننھے پھولوں میں۔

پھول قادرِ قدرت کی پیاری زبان ہے جس کے ساتھ وہ ہم پر اپنی محبت ظاہر کرتی ہے۔

زمین کے تارے یہ پیارے پیارے سنہری پھول!

بُست سے پھول نمودار ہوتے ہیں کہ کھلیں اور اپنی شیرینی رگستان کی ہوا میں کھودیں۔

پھول دُنیا کی خوشیاں ہیں۔ اُمید کا ننھا ساموتی ”مجھے بھول مت“!

پھول حُسن و مسرت اور نکمت و موسیقی کا پیام دیتے ہیں۔

بشیر احمد بیگم

(ماخوذ)

عورت اور مختلف مذاہب

گذشتہ سے پیوستہ

عیسائیت | یہ وہ مذہب ہے جو دنیا میں پیغام امن لیکر آیا تھا، جس نے خدا کے بیٹے کو صرف اس لئے صلیب کی نذر کر دیا تاکہ انسانیت کا دامن حیات گناہ ازلی کی آلائش سے پاک ہو جائے یورپ کو فخر ہے کہ وہ دنیا میں اس وقت بہترین حکمران ہے، وہ ہر انسانی جماعت کے حقوق کا احترام کرتا ہے اس کے دربارِ عدل میں مرد و عورت، امیر و جاہل، عام کسی کی تفریق نہیں ہے، اس کا تمدن دنیا کا بہترین تمدن ہے، ایک سادہ لوح سناج جب پیرس اور لندن کے ایوانِ حکومت میں قدم رکھتا ہے، تو اس کا دل نظامِ جہانبانی کی عظمت و جبروت دیکھ کر دل جاتا ہے، لیکن جب ہوٹلوں اور گلیوں میں پہنچتا ہے، تو سراپا شرم و عبرت بن جاتا ہے!

یہودیت نے اگرچہ عورتوں کی حیثیت کو بہت زیادہ پست اور مبتذل کر دیا تھا، تاہم انصاف یہ ہے کہ عیسائیت نے جو شرمناک طریق عمل عورتوں کے متعلق اختیار کیا، اس کی مثال سے دنیا کی تاریخ بالکل غلطی ہے، یہودیت کی طرح عیسائیت نے بھی آدم اور حوا کے افسانہ کو مذہب کا سنگِ اساس قرار دیا، یعنی سب سے پہلے حوا نے ٹمٹم سے "کو کھایا اور پھر آدم کو کھانے پر آمادہ کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں زمین پر پھینک دئے گئے، اور گناہِ فطرتِ انسانی کا خاصہ بن گیا، چنانچہ جو شخص عورت کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے، گنہگار پیدا ہوتا ہے، اس لئے عالمِ انسانی ایک ایسے شخص کا محتاج تھا، جو اپنے خون سے اس کے دامنِ اخلاق کو گناہ سے پاک کر دے، اور وہ انسانیت کا نجات دہندہ حضرت مریم کے پیٹ سے پیدا ہوا جس نے صلیب کی نذر ہو کر دنیا کو گناہ سے بالکل پاک کر دیا، یہ قربانی حضرت مسیح کو صرف حوا کے اس فعلِ شنیعہ کی وجہ سے کرنی پڑی، جس کی بدولت گناہِ فطرتِ انسانی میں حلول کر گیا، اس بنا پر عیسائیت کے نزدیک عورت گنہگار ازلی ہے، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ مسیح کے خونِ معصوم کی ذمہ دار ہے، یہی وہ جرم ہے جس کی پاداش میں عیسائی دنیا نے اس کے ساتھ وہ شرمناک سلوک کیا، جسکو دیکھ کر انسانی شرافت کی آنکھیں شرم سے بند ہو جاتی ہیں،

بڑے بڑے متقی اور خدا ترس عیسائی بزرگوں مثلاً بزنزد، این ٹینی، گرگیری، جیروم وغیرہ نے جن شرمناک الفاظ میں اس جنسِ لطیف کی تصویر کھینچی ہے، وہ یہ ہے "عورت شیطان کے بازوؤں

کی قوت ہے۔ ”وہ ایک پچھو ہے جو ہمیشہ فیش زنی کے لئے تیار رہتا ہے۔“ وہ مجسم کرو فریب ہے۔“ وہ تمام اخلاقی معائب کا سرچشمہ ہے۔“ وہ ایک آلہ ہے جس کے ذریعے شیطان ہمارے قلوب پر قبضہ کرتا ہے۔ ایک گنہگار زنی کی شان میں یہ الفاظ کچھ باعث تعجب نہیں!

عیسائیت نے عورت کو مرد سے ہر حیثیت سے کم رتہ قرار دیا ہے، چنانچہ دنیا کا شاہزادہ اس عورتوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے ”تیری خواہشات تیرے شوہر کے تابع رہیں گی، اور وہ تیرے اوپر حکومت کرے گا“ لیکن اس سے زیادہ افسوسناک وہ منظر ہے، جبکہ وہ اپنی مقدس ماں کی شان میں یہ عبرتناک الفاظ استعمال کرنا ہے، ”عورت! تو کون ہے؟ مجھ کو تجھ سے کیا مطلب ہے؟“

پولوس مقدس جو عیسائیت کا عظیم خیال کیا جاتا ہے، اس نے عورتوں کی حیثیت کو اس سے زیادہ صاف اور واضح کر دیا ہے، چنانچہ کہتا ہے،

”مرد عورت کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ہے، بلکہ عورت مرد کے لئے پیدا کی گئی ہے“

غرض عیسائیت کے نزدیک عورت ہر قسم کے تمدنی اور سیاسی حقوق سے محروم ہے، اسکی زندگی کا مقصد صرف مرد کی اطاعت و غلامی ہے، انگلش چرچ کے قوانین کے مطابق وہ عملاً ایک ناپاک چیز خیال کی جاتی ہے، چنانچہ وہ منبر اور قربانگاہ کو ہاتھ نہیں لگا سکتی،

چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں جبکہ آفتاب ہدایت کی شمعیں فاران کی چوٹیوں سے بلند ہو کر دنیا کو منور کر رہی تھیں، یورپ میں ایک مذہبی کونسل منعقد ہوئی، جس میں ایک پادری نے یہ سوال اٹھایا کہ آیا عورت واقعی انسان بھی ہے یا نہیں؟ اس نے خود اس کا جواب نفی میں دیا، لیکن دیگر کان مجلس نے زیادہ تر رحم سے کام لیا، بالآخر کثرت رائے نے یہ طے کیا کہ عورت اگرچہ معائب کا مجموعہ ہے، تاہم وہ انسانیت کے دائرہ میں داخل ہے،

انگلستان میں جو اس وقت اپنی عظمت و جبروت کے آگے تمام دنیا کو ہیچ سمجھتا ہے، تیس برس قبل عورتوں کو کسی قسم کا تمدنی یا سیاسی حق حاصل نہیں تھا، اس میں کچھ شبہ نہیں، کہ یورپ میں سب سے پہلے جس ملک نے آئینی حکومت اور سیاسی آزادی کی اہمیت کا اندازہ کیا، وہ انگلستان تھا، لیکن یہ آزادی صرف مردوں تک محدود تھی، چنانچہ جب عورتوں نے اپنے حقوق کا مطالبہ کیا، تو ایک آواز بھی انکی حمایت میں بلند نہ ہوئی، بلکہ انکے ساتھ وہ برتاؤ کیا گیا جو انگلستان کے لئے ہمیشہ باعث ننگ رہا، موجودہ

جنگ کے قتلِ حق طلبی عورتوں کے لئے تقریباً جرم کے برابر سمجھی جاتی تھی، چنانچہ علانیہ طور پر حقوق طلب عورتوں کو مختلف قسم کی تکلیفیں دی جاتی تھیں، اور جب مردوں کے شرمناک سلوک سے تنگ ہو کر انہوں نے عملی شورش و ہنگامہ کا آغاز کیا، تو ان کے ساتھ جانوروں کی طرح سلوک کیا گیا، کیا انگلستان کو اسی حریت پرستی پر ناز ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ عیسائیت بحیثیت مذہب کے چند ناقابلِ عمل اخلاقی اصولوں کا مجموعہ ہے، جو انسانی تمدن و تہذیب کے بالکل منافی ہیں، یورپ نے جو کچھ ترقیاں کی ہیں، وہ خود اس کی ذاتی جدوجہد اور سعی و عمل کے نتائج ہیں، جب تک لوگوں کے قلوب پر مسیحی تعلیم کا اقتدار و اثر قائم تھا، اس وقت تک یورپ پر انسانی ترقی کے دروازے بند تھے، لیکن جب مارٹن لوتھر نے چرچ کی جابرانہ حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، اور اس کی آواز یورپ کی فضاؤں، ہستی میں گونجی، تو اس وقت لوگوں کو محسوس ہوا کہ عیسائیت محض ایک خواب پریشان ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں، اس کے تحت میں رہ کر انسانی ترقی بالکل ناممکن ہے، غرض یورپ نے اب تک جو کچھ ترقی کی ہے، وہ عیسائیت کی غلامی سے آزاد ہو کر کی ہے، چنانچہ اگلی نذر رسل دیتا ہے،

”مغربی تمدن عیسائیت کی حقیقی روح سے بالکل غیر متاثر ہے، بلکہ خود غرضی

اور نفس پرستی کا نتیجہ ہے، یہ ایک سلسلہ واقعہ ہے، کہ عیسائی چرچ نے ہمیشہ

مغربی ترقی و اصلاح کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کی ہیں، چنانچہ اس نے

ہمیشہ ہی خواہاں ترقی کو دبانے کی کوشش کی ہے، حقیقت یہ ہے،

کہ ہم آج جس چہرہ کو عیسائی تمدن کہتے ہیں، اسکی ابتدا آٹھویں صدی

میں ایسین کے مسلمانوں سے ہوئی جبکہ تمام عیسائی دنیا پر جہالت اور

تاریکی چھائی ہوئی تھی۔“

کیا یورپ ان الفاظ کی صداقت کا اعتراف کر سکتا ہے؟

یورپ کو بے شبہ فخر کرنا چاہیئے، کہ اس نے اپنی مادی جدت طرازیوں سے دنیا کو ایک طلسمک بنا دیا ہے، جسکو دیکھ کر عقولِ انسانی مہسوت ہو جاتی ہے، لیکن جب دیدہ حق بین مادیت کے اس زر نگار پر وے کو دفعۃً الٹ دیتا ہے، تو اسکو انسانی ہدایا قیوں کا وہ شرمناک منظر نظر آتا ہے، جس کو دیکھ کر عالمِ کائنات

کاہرہ عہد سے کانپ اُٹھتا ہے، چنانچہ لندن اور پیرس کی گلیوں اور سیرگاہوں میں جس بے محابانہ طریقہ پر عورتوں سے دل لگی کی جاتی ہے، اس کو دیکھ کر ایک خدا ترس انسان کو حیرت ہوتی ہے کہ اب تک قبر الہی کا سمندر کیوں ساکن ہے !!

عورت خدا کی شریف ترین مخلوق ہے، وہ دنیا میں مردوں کی غلام نہیں بلکہ شریک زندگی بن کر آئی تھی لیکن عیسائیت نے ایک مدت تک اس کو مردوں کی صحبت کے قابل بھی نہیں سمجھا، چنانچہ ابتدائی زمانہ میں جبکہ یورپ چرچ کی جابرانہ حکومت کا حلقہ بگوش تھا، پادری عموماً تجرد کی تعلیم دیتے تھے، تعدد ازدواج درکنار خود عقد کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، پولوس مقدس نے یہ قانون بنایا تھا کہ پادری کو صرف ایک بیوی کا شوم ہونا چاہیئے، اسکو عقد ثانی نہیں کرنا چاہیئے، جیروم، امبروس، اور دیگر مشہور علمائے عیسائیت سب تجرد کے حامی اور معلم تھے ۵۹۰ء میں ٹائیڈو کی مذہبی کونسل میں یہ قانون بنایا گیا کہ اگر کسی عورت کے متعلق کسی پادری پر شبہ ہو، تو حج کو چاہیئے، کہ اس عورت کو بیچ دے، اور روپیہ خیرات وغیرہ میں صرف کرنے لگے۔ گریگری اعظم پادریوں اور مذہبی لوگوں کے شادی کرنے کا سخت مخالف تھا، ۶۲۵ء میں بیننویا کے کونسل میں بیننویا کوکٹ ہشتم نے یہ فیصلہ کیا کہ ان تمام بچوں کو جو پادریوں کے پیدا ہوں، غلامی کی نذر کر دینا چاہیئے، یہ شرمناک حالت ۱۶۲۵ء تک قائم رہی جبکہ لوہر نے اس راہبانہ اور مجرد زندگی کے خلاف عملی شورش شروع کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ یورپ کی غلامی سے آزاد ہو گیا، اور لوگوں کو عیسائیت کے معائب کا حسا ہونے لگا۔ چنانچہ تعلیم یافتہ اور صاحب نظر گروہ کے نزدیک خدائے مصلوب کی تعلیمات کے ترانے بالکل بے اثر ہو کر رہ گئے، تاہم عورتوں کی حالت میں کوئی قابل اعتناء صلاح نہ ہو سکی،

نپولین اعظم جس کی ساری عظمت و جبروت محض اس کی ماں کے فیض تربیت کا نتیجہ تھی، اکتاہے کہ عورتوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے، لارڈ بائرن جو انیسویں صدی عیسوی میں انگلستان کا بہت بڑا شاعر گذرا ہے، اس نے عورتوں کے فرائض زندگی ان الفاظ میں گنائے ہیں، ”عورتوں کو صرف خانگی امور کا خیال رکھنا چاہیئے، سوسائٹی سے انکو کوئی تعلق نہیں ہے، انکو مذہب اور کھانے پکالنے کی کتا ہیں پڑھنی چاہئیں، شاعری اور سیاست سے الگ رہنا چاہیئے، وہ رقص و سرود کی محفلوں کی زینت ہیں، انکو کبھی کبھی باغبانی کرنا اور ہل جوتنا بھی چاہیئے۔“ ایک زر پرست قوم کا شاعر جس کا دماغ صرف مادیت کے دلفریب مناظر کا دلدرا ہے، بے شبہ عورتوں کو اس حقارت آمیز نگاہ سے دیکھ سکتا ہے، لیکن ایک ایشیائی شاعر جس کا دل لطیف

اور شریفانہ جذبات کا آپنہ ہے، صنف نازک کی ایک ایک ادا کو اپنے لئے سرمایہٴ حیات سمجھتا ہے، رومو جو فرانس کا بہت بڑا مصنف گذرا ہے، کہتا ہے، ”کر عورتوں کو عموماً کسی فن سے دلچسپی نہیں ہوتی، ان کو کسی چیز کا صحیح طور پر علم نہیں ہوتا، ان میں کسی قسم کی صلاحیت نہیں ہوتی، لیکن ان سب سے زیادہ شرمناک عورتوں کی وہ تصویر ہے، جو جرمنی کے فلسفی شپن ہاؤر نے کھینچی ہے، چنانچہ کہتا ہے

”جر طح اپنی حفاظت کے لئے ہاتھی کو سونڈ اور شیر کو تیز پنچے دے گئے

ہیں، اسی طرح اپنے حصول مقاصد کے لئے عورت کو مکاری کا مادہ عطا

کیا گیا ہے، اگر یہ عورت کی فطرت میں داخل ہے، انکا احترام بالکل

مضحک اور بات ہے، رومن لاکھ طح ان کو ہمیشہ ایک دلی کے تھیں

، دھنا چاہیے، اور ان کو اپنے بچوں پر بھی کسی قسم کا اختیار نہیں دینا

چاہیے، عورتیں چونکہ عموماً تنگ نظر اور مسرف ہوتی ہیں اس لئے انکو

دراشت میں حقوق سے محروم رکھنا چاہیے، عورت صرف پتھے پیدا

کرنے اور انکی پرورش و تربیت کے لئے بنائی گئی ہے، اور یہی تمنا

اس کی زندگی کا مقصد ہونا چاہیے،

ان اقوال سے تم بخوبی اندازہ کر سکتے ہو، کہ سچی دنیا کے نزدیک عورتوں کی کیا وقعت تھی؛

تعدد ازدواج کو اگرچہ یورپ نے اب تک عملاً قبول نہیں کیا ہے، تاہم ارباب نظر کے نزدیک

اس کی حقیقت مسلمہ ہے، چنانچہ لیبان کہتا ہے کہ وحدت ازدواج موجودہ عیسائی ممالک میں صرف کتبوں تک

محدود ہے، عملاً اسکا کوئی وجود نہیں ہے، اس سے سوسائٹی کی حالت بہتر نہیں ہو سکتی، چنانچہ خود فرانس میں

جو وحدت ازدواج کا دعویٰ ہے، ۱۸۲۶ء سے لیکر ۱۸۸۵ء تک زنا میں نو گناہ اضافہ ہو گیا، جرمنی کے مصلحین بھی

سولہویں صدی تک تعدد ازدواج کے قائل تھے، چنانچہ جرمنی کے امرا انیسویں صدی تک برابر اس

اصول پر عمل پیرا تھے، شپن ہاؤر کا قول ہے کہ اس وقت صرف لندن میں اتنی مزار بازار سی عورتیں ہیں، یہ

صرف وحدت ازدواج کا نتیجہ ہے، اس لئے تعدد ازدواج و حقیقت عورتوں کے لئے ایک رحمت ہے،

کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ایک شخص جس کی بیوی بیمار رہتی ہو، یا تولید نسل کی اس میں صلاحیت نہ ہو، یا

بہت زیادہ ضعیف ہو گئی ہو، دوسری شادی نہ کرے، غرض یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے، کہ مغربی

لئے انھارھویں صدی عیسوی کے وسط میں گذرا ہے،

عورتوں کی بد اخلاقیوں کا اصلی سبب وحدت ازدواج کا مسئلہ ہے، جس کی آڑ میں رات دن غیر عورتوں کی عصمت درمی کھجاتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپ میں ناجائز پنچوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے، چنانچہ آکسفورڈ اور کیمبرج ایسے مہذب اور تعلیم یافتہ مقامات میں عوامی پنچوں کی تعداد ہزار میں ۴۵ اور ۵۳ کے قریب ہے، کیا یورپ کو اسی اخلاقی معیار پر ناز ہے؟ یورپ ہموطنہ دیتا ہے، کڑیائی عورتیں اصول تمدن سے ناواقف ہوتی ہیں، وہ مردوں کی صحبت میں علانیہ طور پر نہیں بیٹھ سکتیں، وہ زندگی بھر ایک تنگ و تاریک مکان کے اندر مقید رہتی ہیں، انکی ایک ایک اداسے جہالت اور وحشت نکلتی ہے، انکے خیالات عموماً تاریک، پست، اور مبتذل ہوتے ہیں، بے شبہ یہ صحیح ہے کہ ہماری عورتیں اب تک حد و تعلیم سے دور ہیں، لیکن ہموطنہ فرہے، کہ باوجود اس جہالت اور وحشت کے وہ نازنینان پیرس کی طرح سر بازار عصمت فروشی نہیں کر سکتیں، ایک یورپین لڑکی بے شبہ اپنے والدین کی موجودگی میں غیر مردوں کے بوس و کنار کی متحمل ہو سکتی ہے، لیکن یورپ کو اپنی مشرقی بہنوں سے اس شرمناک بے باکی کی توقع نہیں رکھنا چاہیے، وہ حرم عصمت کی پردہ نشین ہیں، وہ جہالت کو گوارا کر سکتی ہیں، وہ مادی و لفر بیسوں سے بنی ہو سکتی ہیں، وہ دنیائے الگ ایک گوشہ تنہائی میں زندگی بسر کر سکتی ہیں، لیکن انکی غیرت انسانی کسی نگاہ بد یادست گستاخ کی کبھی متحمل نہیں ہو سکتی،

غرض یورپین عورتوں کی اخلاقی پستی اور ابتذال کا حقیقی سبب یورپ کا موجودہ تمدن ہے، جو تباہ خود غرضی اور مادیت پرستی پر مبنی ہے، جو فضائل اخلاق کو دور وحشت کی یادگار سمجھتا ہے، جس کے نزدیک روحانیت ایک صدائے بے معنی ہے، جو صرف انسان کے حیوانی جذبات کو برا نگینہ کرتا ہے، اس بنا پر اگر دنیا موجودہ مصائب و آلام سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہے، تو اس کا فرض اولین یہ ہے کہ وہ اس شرمناک مغربی تمدن کو تباہ اور برباد کر دے، بغیر اس کے حقیقی امن کی تلاش محض ایک خواب پریشان ہے، جس کی کوئی تعبیر نہیں،

سلسلہ سخن میں ہم کہاں سے کہاں نکل آئے، ہموطنہ یہ دکھانا مقصود تھا، کہ عیسائی دنیا نے اخلاقی حیثیت سے عورتوں کے ساتھ جو شرمناک سلوک کیا ہے، اسکی نظر دنیا کی تاریخ میں مشکل سے مل سکتی ہے طلاق عیسائیت نے صرف زنا کی حالت میں جائز رکھی ہے، چنانچہ عدالتوں میں آئے دن جو شرمناک انکشافات ہوتے رہتے ہیں، انکو پڑھ کر ایک خدا ترس انسان کا دل عبرت سے کانپ اٹھتا ہے، ہموطنہ یورپ۔

کی باؤی اور دماغی ترقیوں کا شاندار منظر دیکھ کر اپنی ناداری پر افسوس ہوتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ہم کو یہ تسکین بھی ضرور ہے، کہ ابھی تک ہمارے قلب میں شرافت کا احساس موجود ہے، جو انسان کے تاج کمال کا حقیقی طرہ ہے،

غرض اس وسیع خطہ خاک میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی، جہاں یہ مظلوم ہستی تردد و محبت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی، اس بار لطیف کی ذمہ داری صرف صحرائے حجاز کے لئے مخصوص تھی، جس کا ایک ایک ذرہ اب تک دنیا کے لئے آفتاب ہدایت ہے، یہ خطہ ارض آج یورپ کو اس لئے عزیز ہے، کہ اس کے حدود میں تیل کے خزانے ہیں، لیکن ہنوکہ صرف اس لئے عزیز ہے، کہ وہ وحی الہی کا مبسط اور سرور و علم کا مولد و مسکن ہے

باقی دارد

مرزا احسان احمد دہلوی



ہمسا جھوٹ بگاڑ سکتا ہے بنا کچھ نہیں سکتا۔

-----+

صرف بزدل دروغ گو ہوتے ہیں۔

-----+

دو شیزہ کی زبان نہیں ہوتی بلکہ صرف خیالات !

-----+

سب سے شیریں پسل جو زمین اپنے خالق کے سامنے پیش کر سکتی ہے ایک مکمل انسان ہے۔

-----+

انسان کا مقدر کیا ہے ؟ دکھ سہنا اور مر جانا !

-----+

ب

زندگی کیا ہے ؟ بقائے دوام کا بچپن !

-----+

زندگی ایک چلتا پھرتا سایہ ہے۔

-----+

زندگی خدا کا تحفہ ہے اور اک مقدس شے۔

-----+

زندگی فانی ہے اور فن باقی۔

-----+

دشمنی اور حرص ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔

-----+

حرص عقل کا قید خانہ اور جذبات کی طوفان گاہ ہے۔

(ترجمہ)

دل دینا

عشاق ہر صورتِ زیبا کو دل دے دیتے ہیں۔ شعرا کا دل ہمیشہ کسی کی زلفِ گرہ گیر میں رہا کرتا ہے داستانِ گو دل دینے اور دل لینے کے افسانے بڑے ذوق و شوق سے سنایا کرتے ہیں۔ ناول نویسوں کا سارا زور قلم اس کوشش میں صرف ہوا کہ کیسے کوئی دل دیتا اور کوئی لیتا ہے؟ خلاصہ یہ کہ دل دینا ایک نہایت ہی آسان شغل سمجھ لیا گیا۔ اور ہمارے عاشق مزاج نوجوان دل ہاتھوں میں لئے پھرنے لگے کہ کوئی اچھی صورت دیکھیں اور حوالے کر دیں۔

مگر افسوس صحیح طور پر آج تک کسی نے دل دیا۔ نہ کسی نے لیا اور نہ کوئی سمجھا کہ دل دینا کیا چیز ہے اور کیسے دل دیتے ہیں۔ صد ہا عاشقوں اور معشوقوں کی داستانیں دلدہی و دلیری کے دلچسپ نمونے سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن غور کرو تو نہ کسی نے دل دیا نہ کسی نے لیا۔ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ سچے اور صحیح معنوں میں دل دینے کا کیس پتہ نہیں۔

لیکن ہاں یورپ کا ایک واقعہ جو قرونِ وسطیٰ میں پیش آیا تھا وہ البتہ دل دینے اور لینے کا سچا معاملہ ہے چونکہ ہمارے عاشقوں اور شاعروں کے کان اس سے نا آشنا ہیں۔ اس لئے ہم اس واقعے کو اُن کے سامنے پیش کئے دیتے ہیں کہ لوگ دیکھیں اور سمجھیں کہ دل دینا کیا چیز ہے؟

جن دنوں صلیبی لڑائیوں کے معرکے درپیش تھے۔ اور بیت المقدس کو مسلمانوں سے چھیننے کے لئے سارا یورپ اُٹھ اچلا آتا تھا فرانس میں نواب شاپہین کے دربار میں ایک بڑا معزز سردار تھا لارڈ کوسی جو خوبصورت اور قابل ہونے کے ساتھ اپنے وقت کا بڑا بانکا بھی تصور کیا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں ہاں ایک اور بڑے معزز رئیس تھے لارڈ فائل۔ لارڈ فائل کی نازنین دزہرہ جبین بیوی لیڈی فائل اپنے حسن و جمال اور ناز و انداز کے لحاظ سے سارے ملک میں منتخب تھی۔ اور فرانس کی ساری مہ جبینوں کے حسن کی شمعیں لیڈی فائل کے آفتابِ رخسار کے سامنے مانتھیں۔ دونوں کی خوبیوں نے یہ شرمناک کرشمہ دکھایا کہ لارڈ کوسی اور لیڈی فائل ایک دوسرے پر فریفتہ ہو گئے۔ اور ناجائز اُلفت نے دونوں کے دلوں میں عشق کی شمعیں روشن کر دیں۔ لارڈ فائل بیوی کے اس شرمناک عشق سے ناواقف نہ تھا۔ ہر طرح کی روک تھام کرتا

مگر کچھ زور نہ چلتا۔

اسی اثنائیں نواب شاپین تیار ہو کر ارض مقدس میں جا کر مسلمانوں کے مقابلے میں جہاد کرے جو مجاہدینِ فرانس اُس کے ہمراہ روانہ ہونے والے تھے اُن کے زمرے میں لارڈ کوئسی نے بھی اپنا نام لکھوا دیا۔ اپنے اس ارادے کی خبر جب اُس نے لیڈی فائل کو کی تو معشوقہ دِلنواز کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے روئی اور رلایا۔ مگر آخر ضبط سے کام لیا۔ دل میں کہا اچھا ہے۔ لارڈ کوئسی کے چند روز باہر رہنے سے لارڈ فائل کی آتشِ رقابت ٹھنڈی پڑ جائیگی۔ اور شاید اُن کی بدگمانیاں دُور ہو جائیں۔

اس کے بعد ہنسی خوشی عاشقِ دلدادہ کو گلے لگا کے رخصت کیا۔ اور کہا لو یہ ہماری الفت و محبت کی یاد گاریں ساتھ لیتے جاؤ۔ اور ان کو ہمیشہ اپنے دل سے لگائے رکھنا۔ یہ یاد گاریں چند انگوٹھیاں تھیں۔ کچھ جواہرات تھے۔ اور سب سے زیادہ قیمتی ایک نازک ڈوری تھی جس کو لیڈی فائل نے اپنی سنہری زلفوں کے بالوں کو ریشم کے دھاگے میں گوندھ کے بنایا تھا۔ اور اُس کے دونوں سروں پر دو بڑے بڑے موتی گھنڈیوں کی وضع میں لگے ہوئے تھے۔ ان دونوں یورپ کے بانکوں اور فرنگی سرداروں کی دُجج تھی کہ اپنے فرغل کو ایک خوب صورت ڈوری سے خود میں اٹکا لیا کرتے۔ اور اسی مقصد کے لئے لیڈی فائل نے یہ ڈوری خود اپنے ہاتھ سے بنا کے اپنے عاشق کو دی تھی۔ الغرض بصد حسرت و اندوہ عاشق و معشوق جدا ہوئے۔ اور لارڈ کوئسی نے شاپین کے نواب کے ہمراہ ارض مقدس فلسطین کی راہ لی۔

یہ ۱۸۵۷ء کا زمانہ تھا جبکہ فلسطین کے مشہور ساحلی شہر عکہ کا مشہور محاصرہ قائم تھا۔ شہر کے اندر مسلمان تھے۔ لاکھوں فرنگیوں کی خلعتِ عظیم چاروں طرف سے یورشین کر رہی تھی۔ اور ان محاصرہ کرنے والوں کو سلطان صلاح الدین اعظم خشکی کی طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ خونریزیوں کا سلسلہ جاری تھا اور سبھی کسی طرح شہر پر قابو نہ پا سکتے تھے۔

نواب کوئسی نے نئے مجاہدینِ فرنگ کے ساتھ ساحلِ فلسطین پر قدم رکھا تو وہ بھی زور و شور سے دھاوے کرنے لگا۔ اور ایک دن ایسے جوش و خروش سے دھاوا کیا کہ تیروں پتھروں اور آتش باری کے قہقہوں کو دھال پر لیتا ہوا عکہ کی شہر پناہ کے نیچے جا پہنچا۔ اور سیڑھی لگا کے اوپر چڑھنے لگا۔ فیصل کے اوپر سر کھلاہی تھا کہ کسی مسلمان نے تلوار کا ایسا زبردست ہاتھ مارا کہ کاری زخم کھاکے نیچے آ رہا۔ اور لوگ

فوراً پیسے میں اٹھالے گئے۔

پیسے میں لیٹ کر لارڈ کو کسی نے خیال کیا کہ اب میری زندگی کے چند ہی لمحے باقی ہیں۔ ساتھ ہی مجھ کو جلال اور یاد آئی اور ارادہ کیا کہ زندگی کے ان باقی ماندہ لمحوں کو اسی کی یاد میں صرف کرے۔ چنانچہ لیڈی فائل کے نام ایک عاشقانہ خط لکھا۔ اور اپنے ایک قدیم وفادار و حال نشاں لازم کو دے کر کہا ”میرے مرنے کے بعد تم فرانس میں جانا اور اس خط کو میری ولد ارمانہ جبین کے ہاتھ میں دے دینا۔ اس کے ساتھ یہ تمام چیزیں بھی جو اُس نے مجھے یادگار محبت کے طریقے سے دی تھیں اُسے واپس کر دینا۔ اس کے علاوہ جب میں مرجوں تو سینہ چاک کر کے میرا دل نکالنا۔ اور اُس کو تیل میں ڈال دینا کہ سڑنے نہ پائے۔ اور اس کو بھی لیجا کر اُسی آفت جاں کی نذر کر دینا“

یہ وصیتیں کر کے لارڈ کو کسی مر گیا۔ اور وفادار ملازم نے ان پر پورا عمل کیا۔ سفر کر کے فرانس میں پہنچا۔ اور لارڈ فائل کے قصر کے قریب جا کر پھانک کے سامنے جنگل میں چھپ رہا کہ لارڈ فائل کہیں باہر جائے تو قلعہ میں داخل ہو کر اپنے آنجنابی آقا کی امانتیں اُس کی محبوبہ کے حوالے کرے۔ اسی انتظار میں کھڑا تھا کہ لارڈ فائل کی نظر پڑ گئی۔ دیکھتے ہی پہچان گیا کہ لارڈ کو کسی کا ملازم ہے اور اپنے آقا کا کوئی پیام لے کر میری بیوی کے پاس آیا ہے۔ غیظ و غضب کے ساتھ اُس کے سر پر جا پہنچا اور کہا ”سچ بتا یہاں کس لئے آیا ہے ورنہ تیری جان کی خیر نہیں“ لازم نے قسمیں کھا کر کہا ”میرے مالک تو اراض مقدس میں مسلمانوں کے ہاتھ سے ماسے گئے اب پیام دینے والا کون ہے؟“ لارڈ فائل کو اس کا یقین نہ آیا۔ سمجھا کہ فضول باتیں بنا رہا ہے۔ تلوار بیان سے کھینچ کر اُس کے سر پر بلند کی اور ڈپٹ کے کہا ”بتا ورنہ سر زمین پر پڑا لوٹنا ہوگا“ خادم ہنم گیا۔ ہوش و حواس جاتے رہے۔ اور جان کے خوف سے ساری باتیں قبول دیں جو چیزیں ساتھ لایا تھا اس کے سامنے رکھ دیں۔ اور لارڈ کو کسی کا خط بھی اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔

خط پڑھ کر لارڈ فائل کے غصے کی انتہا نہ تھی۔ اور جوش غضب میں ارادہ کیا کہ بیوی سے ایک نئے طریقے کا انتقام لے۔ فوراً قصر میں آکر اپنے باورچی کو بلایا۔ اور وہ لارڈ کو کسی کا دل اُس کے ہاتھ میں دیکر کہا ”اُس کو اور گوشت میں ملا کر بہت اچھے نفیس کباب پکاؤ“ کباب لیڈی فائل کی نہایت ہی مرغوب غذا تھی۔ جیسے ہی پک کر آئے لارڈ فائل نے میز پر بیٹھ کر اُن کو بیوی کے سامنے پیش کیا اور کہا ”تمہارے شوق کے مطابق ان کو بڑے اہتمام سے پکوا یا ہے“ بیوی نے اُن کبابوں کو بڑے شوق سے لاسا

لے لے کر کھایا۔ اور جب کھا چکی تو میاں نے ایک زہر خند کے ساتھ پوچھا ”کیسے پکے ہیں؟“ جواب ملا کہ ”بہت اچھے پکے ہیں۔ اور مجھے بہت مزہ آیا“ کما ہاں یہ مزہ آنے کی چیز ہی تھی۔ تمہارے مرغوب ہونے ہی کے خیال سے میں نے اسکو بڑی کوشش سے تیار کرایا۔ اور تمہیں پسند کیوں نہ آتا؟ یہ خاص لارڈ کوٹسی کا دل تھا جس کی قدر تم سے زیادہ کون کرے گا؟“ لیدی فائل کو اس کا یقین نہ آیا مگر جب میاں نے ساری سرگزشت من و عن بیان کردی۔ اور بیوی کے دئے ہوئے یادگار محبت تحفوں کے ساتھ لارڈ کوٹسی کا خط بھی نکال کے سامنے رکھ دیا تو کانپ گئی۔ اور یقین آیا کہ شوہر نے جو کچھ کہا سچ ہے۔

اُس کے خون شدہ دُکھے دل پر یاس و نامرادی کا ہجوم ہوا۔ مگر ضبط کیا۔ اور استقلال کے تیور دل سے بولی ”ہاں سچ کہتے ہو۔ یہ دل میرا محبوب تھا۔ کیونکہ یہ محبت کرنے کے قابل دل تھا اور کبھی اس سے زیادہ شریف دل نہیں دیکھا گیا تھا۔ اور میں نے چونکہ ایسا اچھا اور شریف گوشت کھایا ہے اور میرا معدہ ایک ایسے بہترین اور قیمتی دل کا مقبرہ بن گیا ہے لہذا اب میں کوئی اس سے کم درجے کی چیز نہ کھاؤں گی۔ نہ اس اچھے دل کو کسی ذلیل چیز سے آلودہ کر کے ناپاک کر دوں گی“ یہ کہتے کہتے پُر حسرت زبان رُک گئی۔ اُٹھ کر اپنے کمرے میں گئی اور اندر سے دروازہ بند کر کے بیٹھ رہی۔ دوستوں۔ عزیزوں۔ ملازموں اور خود شوہر نے لاکھ کہا اور قسمیں دلائیں مگر دروازہ نہ کھولا۔ یہاں تک کہ اسی رنج میں فاقے کرتے کرتے چوتھے روز ملک عدم کی راہ لی۔

محمد عبدالحلیم شرر

قابلیت اک ذمہ داری ہے۔ قوت کے ذرے ذرے میں فرض پنہاں ہے!

قابل آدمی کی بہت نرم لفظوں اور پختہ کاموں میں نظر آتی ہے۔

سہ۔ وہ کام کر سکتے ہیں جو کسی نے کیا ہو۔ ۱

زبیدہ

زبیدہ اپنی زندگی کی نیند پوری کر چکی اور اب کسی زیادہ مستقل اور حقیقی دنیا میں جاگ رہی ہے۔
لا متناہی زندگیوں کے ظلمات میں سے تنگ و دو کر کے میرے حافظے کی آسمانی روشنی پر صدیاں
اور قرن ایک بھاری اور اندھیری کُنر کی طرح بیٹھ چکے ہیں۔ لیکن میرا فرسودہ دماغ تخیل کی شدت سے تپ کر
اُس روشن تاریکی۔ اُس پُر شور سکوت کو ایک لطیف تصور کی جھلک کی طرح یاد کر سکتا ہے۔ جب میری اور
زبیدہ کی روجوں نے اپنے تجرد کے عالم میں محبت کا مستقل پیمانہ دفا باندھا تھا۔

شادی کے بعد میری رُوح نے زبیدہ کی سیاہ اور تیز آنکھوں کی گہرائیوں کو دیکھا۔ تو اُس سکوت تجر
میں میرے سُن حافظے نے پہلی مرتبہ ایک کر دٹ لینے کی کوشش کی۔ اور ماضی کی اُس ویران تاریکی۔ اُس
مہیب چُپ چاپ۔ اُس عظیم خود فراموشی پر دو بارہ نظر ڈالنی چاہی۔ جس میں زندگیاں آئیں۔ اور گزر گئی تھیں
خوابوں میں خواب دکھائی دئے اور مٹ گئے تھے۔ میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کہ وہ رفاقت جو اس کی آنکھوں
میں ایک پیمانہ ازل بن کر روشن تھی کہاں کہاں میری ہم سفر رہی ہے۔

مجھے اپنی آواز اپنے کانوں میں آئی ”زبیدہ! میں تمہیں جانتا ہوں“ اور زبیدہ کے ہونٹوں نے ہلکے
سے کہا ”تم اس خواب کی تعبیر ہو۔“

زبیدہ کا وسیع مطالعہ اور اعلیٰ تعلیم اس فطری شوق کا نتیجہ تھا۔ جس نے اس کی آنکھیں تمام
مشاغل اور دلچسپیوں سے ہٹا کر کتابوں کے صفحوں پر لگا دی تھیں۔ عورتوں کا وہ مرغوب شوق جسے
سنگھار کہتے ہیں۔ اس کے لئے مطالعہ سے زیادہ دلفریبی نہ رکھتا تھا۔ تزئین بھی اس میں ایک عجیب
رعنائی پیدا کر سکتی تھی۔ لیکن اس کا سُن میرے نزدیک سنگھار سے بے نیاز تھا۔ اس کا قد کسی قدر لمبا
تھا۔ اس کا چہرہ بیضادی اور رنگ کُندنی۔ تمام چہرے میں اس کی بادام نما سیاہ اور گہری آنکھیں سب سے
زیادہ نمایاں تھیں۔ ان میں سے ایک ایسی تیرسی تیز نظر لگتی تھی۔ جس کے سامنے ضمیر مجرم تھرتھرا اُٹھے
جو نقابوں کو پارہ پارہ کر ڈالے۔ اس کی پلکیں باہم ملتیں تو معلوم ہوتا تھا۔ کہ ایک دنیا تھی۔ کہ سو گئی ہے
اس کی بھوؤں کے قوس بہت واضح تھے۔ ناک کا سُن تراش کچھ اس قسم کا تھا۔ کہ اس کا پورا لطف

اے پہلو سے دیکھنے میں آسکتا تھا، اُس کے ہلکے گلابی ہونٹوں پر کوئی حسرت آمیز تمنا برستی تھی، اس کے کالے سیاہ اور لمبے بال سیدھے تھے۔ اور کچھ کچھ پیشانی پر جھکے رہتے تھے۔

آہ میں کس قدر کہتا تھا ”زبیدہ! مجھے ایک تصویر اتار لینے دو۔ اس طرح کہ تمہارا چہرہ تمہارے شانے کی طرف پھرا ہوا ہو۔ اور اس کی نفیس تراش کا صُنع واضح دکھائی دے رہا ہو۔ تمہاری نظریں جھکی ہوئی ہوں۔ اور ایک نازک بُندے کا دُروانہ تمہارے گھنے اور کھلے ہوئے بالوں میں سے جھانک رہا ہو میں تمہیں تمہارے پیچھے کھڑا ہو کے دیکھوں اور اس شکیب سوز منظر کو ایک تصویر میں محفوظ کر لوں۔“

مگر وہ مسکرا کر کہتی ”اور اگر اس وقت ہم اپنی زندگی کے خوابوں کی منزلوں میں سے جاگتے چلے جائیں“ میں تھر تھرا اٹھا کرتا۔ مجھے زندگی کے خواب کا نازک جال لرزتا ہوا معلوم ہوتا۔ زندگی کی رزق اور ارادے اس کے فلسفہ حیات کے مقابلے میں کس قدر ذلیل اور گرے ہوئے نظر آتے۔

زبیدہ کا یہ فلسفہ صرف مطالعہ کا نتیجہ نہ تھا۔ بلکہ وہ اس فلسفے کو ساتھ لیکر دُنیا میں آئی تھی۔ اسی قسم کے خیالات اس کی اوائل عمر کی خواب ناک حیرت کے رفیق تھے۔ وہ پہلا اہم مسلہ جس نے اس کے شعور کو مصروفِ جستجو کیا۔ ماضی و مستقبل کی پُر اسرار تاریکی تھی۔ وہ ہمیشہ حافظہ پر زور دالتی کہ وہ کہاں سے آئی اور کہاں کو جا رہی ہے۔ یہ کیا ہے۔ کہ دو لامتناہی اندھیروں کے درمیان صرف ایک در اسی جگہ پر روشنی کی جھلک پڑتی دکھائی دیتی ہے! کیا انسان محض ایک بادل کے ٹکڑے کی طرح ہے کہ ایک افق سے اُٹھ کر دوسرے میں ڈوب جائے۔ یا اس کی ہستی میں کوئی معنی۔ اس کے ظہور میں کسی سلسلہ کا تسلسل مضر ہے۔

جب تک اس کو اپنے متعلقین کی ہستی میں زندگی کی دیواروں سے باہر کی کوئی محبت اور نفرت یاد دلاتی تھی۔ وہ محبت اور نفرت جو اس کی زندگی کے نہایت واضح جذبے تھے۔ جو اسے پہلی نظر میں پیدا ہوا تھا۔ اور وہ انکشاف کی اس دھار کے ساتھ ساتھ جو ماضی کی تاریکی میں سے نکل کر حال کی روشنی میں سُکراتی تھی۔ زندگی کے ماخذ تک پہنچنا چاہتی تھی۔ اسی معنی کو سمجھانے کے شوق میں وہ مطالعہ کی طرف راغب ہوئی۔ اور قدیم یونانی فلسفے کے سمندروں میں غرق ہو گئی۔ وہ علوم جن کا تعلق عمل سے تھا۔ اسے کبھی پسند نہ آئے۔ وہ کتنی چشمک برق اور تبسم شرار میں کس چیز کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے؟ اسے صرف ذہنی علوم سے شغف تھا۔ اور ان میں سے بھی خصوصاً وہ جن کا تعلق روح کی ماہیت۔ عالم کون و فساد

کی توجہ سے تھا۔ ان میں اسے بہت سے ایسے خیالات مل گئے۔ جو اس کے دل و دماغ میں بے قرار رہتے تھے۔ اور اس کے قیاسات نے یقین کی صورت اختیار کر لی۔

اس دیوانہ وارجتجو کی شکل وہ موسیقی سے فرو کرنا چاہتی تھی۔ لیکن شاید اس کی موسیقی کو بھی اس کشمکش سے قریبی تعلق تھا۔ جس میں اس کا دل و دماغ مصروف رہتا تھا۔ اس نے ایک عجیب موسیقی ایجاد کر لی تھی۔ جو کانوں کے لئے کوئی خوش آئند آواز نہ تھی بلکہ بدن کے روئیں کھڑے کر دیتی تھی، وہ ایک معطر نیند کی طرح دماغ پر مسلط نہ ہو جاتی تھی۔ بلکہ دماغ میں عجیب مبہم خیالات بحالت بے قراری بیدار کرتی تھی۔ اگر اس کی مدہم آوازوں کی ہیبت ناک لرزشیں دنیا کے شہود کے پیچھے پیچھے رہنے والی حقیقت سے ہم آہنگ ہونا چاہتی تھیں۔ تو بلند آوازوں کا درد و کرب و حشت کے عالم میں پردہ ہستی کو چاک کرتا معلوم ہوتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ موسیقی کو اتنی ترقی دی جاسکتی ہے کہ اس کی لئے میں یہ کائنات خواب پگھل کر رہ جائے۔

شادی سے پہلے اس کے سرود میں مشرقی موسیقی کی مانند ایک تلاش تھی۔ شادی کے بعد مغربی موسیقی کی بے قراری۔ وہ کتنی شادی سے پہلے مجھے معلوم تھا کہ میں اور تم یکجا ہو جائیں گے۔ میری زندگی کا مقصد تمہاری تلاش تھا۔ میں ماں باپ سے محبت کرنے کو پیدا نہ ہوئی تھی۔ وہ تمہاری تلاش کا ایک ذریعہ تھے۔ میں تمہیں واپس لے جانے کو اس دنیا میں آئی تھی۔ اگر خدا خواستہ میں تمہیں حاصل نہ کر لیتی۔ تو یقیناً اس پریشان خواب سے جاگ اٹھتی۔

اس کی ان باتوں سے میری آنکھیں تپ جاتیں۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے پھوٹ آتے دنیا ایک تصویر کی طرح کھڑی ہوئی معلوم ہونے لگتی۔ اور دماغ میں کوئی چیز نقاہت کے عالم میں اٹھنے کی کوشش کرتی۔ میں ڈر کر کہتا۔ "زبیدہ یہ ہم کس مصیبت میں گرفتار ہیں؟"

اور وہ جواب دیتی "خواب میں۔ میرے پیارے خواب میں۔ جس طرح اس زندگی سے ہم خواب کی چھوٹی چھوٹی سینکڑوں دنیاؤں میں ہو آتے ہیں۔ اسی طرح گزشتہ زندگی کے مقابلے میں یہ زندگی ایک چھوٹا سا خواب ہے۔ اور نہ جانے ایسے ایسے کتنے اور خواب ہم اس زندگی میں دیکھیں گے اور وہ زندگی ایک اُس سے پہلی زندگی کے بہت سے خوابوں میں سے ایک چھوٹا سا خواب ہے یہاں تک کہ یہ سلسلہ ازل سے جا ملتا ہے۔ ازل اور ابد ایک ہیں۔ ازل سے ہم زندگیوں

میں بڑھتے آرہے ہیں۔ اور پھر اب میں ہم بیدار ہو جائیں گے۔ عالم خواب کے نظام اور ان میں داخل ہونے کے طریقے مختلف ہیں۔ موجودہ زندگی کے خواب میں ہم ماں باپ کے ذریعے داخل ہوتے ہیں۔ لیکن اس زندگی کی نسبت سے جو خواب ہیں ان میں ہم ماں باپ کی امداد سے بے نیاز ہیں وہ عمر موجودہ زندگی کی نسبت سے ذرا سی ہو۔ لیکن گزشتہ زندگی کے مقابلے میں اس زندگی کا خواب یہی حیثیت رکھتا ہے +

میں کتنا زبیدہ بس کرو۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے میرا دماغ پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ اور وہ کہتی "تو پھر میرے پیارے۔ جب تک ہم اس خواب سے نہ جاگیں آؤ۔ ہم وہ باتیں کریں جو اس کے لئے سوزوں ہیں + آؤ ہم اس خواب کی تمام افتوں سے اپنے سینے لبریز کر لیں۔ چاند کی روپہلی روشنی میں پھولوں کے معطر سائے میں بیٹھ کر میں تمہیں اپنی محبت سناؤں اور سورج کی سنہری روشنی میں کسی گنجان پھولوں سے لدی ہوئی جھاڑی کی خنکی میں تم اپنی محبت مجھ سے کہو۔ ہم اپنی محبت کے مدارج میں ترقی کرتے جائیں۔ ہم چاند اور سورج۔ زمین اور آسمان کو اپنی محبت سے تھکا کر ایک وہم بنادیں۔ زندگی کا یہ طلسم توڑ دیں۔ ہماری محبت کے بلند آہنگ گیت ساز حیات کے ایک ایک تار سے بے نیاز ہوتے ہوئے آخر صرف ہماری رُوح میں شعلہ بن کر سما جائیں۔ اور ہم حقیقت میں بیدار ہو جائیں +

میرا تیز اور سما ہوا تنفس اس سے پوچھا کرتا "اور زبیدہ۔ اگر ہم میں سے کوئی پہلے جاگ اٹھا" وہ ہنس کر جواب دیتی "تو وہ دوسرے کو جگا دے گا" میں کہنا چاہتا "لیکن زبیدہ —"

اور وہ ہنستی "میرے پیارے ڈرو مت۔ خوشگوار خواب سے کوئی جاگنا نہیں چاہتا لیکن جاگنے کے بعد خواب کی تمام دلفریبیوں کی قیمت صرف ایک قبسم ہوتی ہے" میں پھوٹھ کہنے کو بے قرار ہوتا "میری زبیدہ —"

اور وہ پھر بات کاٹ دیتی "مگر میرے پیارے تم اس خواب کی دلفریبیوں کو اپنے اوپر اثر ہی نہ کرنے دو۔ ورنہ تم اس عظیم سلسلہ سے ٹوٹ کر الگ ہو جاؤ گے اور ایک چھوٹے سے ذیل امتحان میں پھنس جاؤ گے + اس جھوٹی زندگی کی تمام لذتیں تم کو اپنی آماجگاہ بنالیں گی تم سمجھ لو

کہ تم ایک سایہ ہو۔ پھر تم تمام مصیبتوں۔ تمام بیماریوں۔ تمام خوشیوں۔ بلکہ موت تک سے بھی بالا ہو گے۔ تمہیں ایک سیاہ جالی کے پردے میں سے گزشتہ زندگی کے مدھم نقش دکھائی دیتے رہینگے میرے پیارے میری نشہ آفت روح کو اس زندگی کی نسبت کسی زیادہ حقیقی زندگی میں سیراب کر نیو چلو آہ مجھے اس کی باتوں کی تہ میں ایک خوفناک حقیقت سرسراتی ہوئی نظر آتی تھی۔ میں ڈر کر اپنی آنکھیں بند کر لیا کرتا۔ لیکن اس کے الفاظ کسی افق کے اس پار سے آنے والے گھنٹے کی آواز کی طرح میرے کانوں میں گونجتے رہا کرتے۔ مکان کی پختہ دیواریں ایک نازک کریب معلوم ہونے لگیں جنہیں میری انگلی کا مس منہدم کر سکتا تھا۔

اور زبیدہ ایک قوی روح جو اس خواب کے پیچیدہ جال کی الجھنوں میں سے مخلصی دلا کر پھر مجھے کسی حقیقت کو کھینچ لے جانے کے لئے آئی تھی دنیا کی مادیت کے درمیان ایک ایسے مسلح سپاہی کی طرح کھڑی تھی جس پر تیروں کی بوچھاڑ پڑ رہی ہو مگر اس کی آنکھوں کا تبسم انکو اپنے سے مکرانہ کر دلت اور عاجزی سے نیچے گرتا ہوا دیکھے۔ بیماریوں نے اس کی کمزور صحت پر حملہ کیا مگر اس کی اجیت روح سے کھسائی ہو کر پھر گئیں۔ عیش و عشرت اور تنم نے میرے گھر میں اس کے لئے دامن پھیلایا۔ مگر اس کی مستثنیٰ روح نے اس کی تضحیک کی۔ ماں باپ کی وفات کے صدمے نے بیاہ بادل کی طرح اس کے سر پر سیاہی پھیلائی۔ مگر اس کی سنگینی استقلال نے اسکو ایک نظر دیکھا۔ اور وہ پارہ پارہ ہو گئے۔ وہ ایک سرکش شعلہ تھی۔ جسے حوادث کی پھونکیں نہ لرزاسکتی تھیں۔ جس کی فنا و بقا کسی عظیم قوت کے منتظم ہاتھوں میں تھی۔ اور آخر وہ شعلہ بجھ گیا۔ ایک نخت جیسے کوئی خواب سے چونک پڑے۔ زبیدہ جاگ اٹھی۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ قدرت ایسی ظالم نہیں۔ کہ ازل آشاد و حوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دے۔ یہ خواب ہے خواب! زبیدہ کا خواب ختم ہو گیا۔ میں اس خواب میں اپنے آپ کو بھول جانے کا آرزو مند تھا۔ وہ اپنے آپ کو ڈھونڈھ لینا چاہتی تھی۔ میں دوسری قوی روح کو بھی اپنے ساتھ برباد کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک گزشتہ زندگی کا پینام تھی میں حقیقت عظیم سے آشنا ہونے کے قابل نہیں۔ مجھے اس کا کفارہ ایسے ایسے کئی ہوس انگیز خوابوں کی بھول بھلیاں میں گم ہو ہو کر ادا کرنا پڑے گا۔ لیکن آہ بیداری۔ بیداری۔ اس مرتبہ بیداری! زبیدہ سے ایک عارضہ

لیکن حقیقی قرب مجھے آئندہ زندگی میں دھوکا نہ کھانے دیگا۔ زبیدہ کی رُوح کو دوسرے امتحانوں میں میرے پیچھے پیچھے ندائے غیب بن کر نہ آنا پڑے گا۔ میں حقیقت کو نظر سے اوجھل نہ ہونے دوں گا۔ میں پتھر بن جاؤں گا۔ بس میں جاگ اُٹھوں۔ اس خواب سے جاگ اُٹھوں۔ یہ خواب پریشاں میرے ٹھکے ہوئے دماغ کی برداشت سے باہر ہے۔ میں بیدار ہونا چاہتا ہوں۔ جگادے۔ زبیدہ مجھے جگانے کیا ایک دوسری زندگی میں مجھے سویا ہوا دیکھ کر تو میری بے بسی پر ہنس رہی ہے؟ میرے خود بخود جگانے سے پہلے مجھے جگادے۔ اسی طرح جیسے تو ایک رات میں ایک نوح جگالی گئی۔ اف وہ کیسی خوفناک رات تھی۔ دُنیا کا رنگ ایک مضبوط رُوح کو اپنے افسوں سے متاثر ہوئے بغیر رخصت ہوتے دیکھ کر فرق تھا ہو اساکت تھی۔ اور فضا طول۔ آوازیں اور روشنیاں کمزور اور کمزور۔ میری رُوح میرے سر و جسم میں سے نکل کر کسی غیر محسوس چیز سے چمٹ جانا چاہتی تھی۔ اور میں اپنے بہت بڑے کمرے کے ایک کونے میں بیٹھا اپنے دل کے مبہم مدشوں کو ایک اخبار کے مطالعے میں فنا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نوکر چاکر سو گئے تھے۔ زبیدہ شاید اپنے کمرے میں تھی۔ اور میں تنہا۔

بار بار مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اس چُپ چاپ میں کوئی بھاری پردوں میں سے سرسرا کر گزر گیا۔ دیواروں پر بڑے بڑے فریم چٹخے۔ کسی پوشیدہ ہاتھ نے گھڑی کی آواز کا دم گھونٹنا چاہا۔ میں ڈرتا ڈرتا پلکیں اُٹھاتا۔ اور رنجیدہ سکوت کو دیکھتا۔ تمام سامان ڈوبا سا جا رہا تھا۔ چیزوں کے گرد ایک ہلکی ہلکی کڑ تھی۔ معلوم ہوتا تھا۔ فرینچر اس کُڑ میں سرک رہا ہے۔ مگر میرے دیکھتے ہی تھم جاتا ہے۔ سامنے انکٹھی میں آگ کے شعلے کسی تلی کی پُراسر آرائیوں کی طرح میری طرف تک رہے تھے۔ میرے پیچھے کوئی کھڑا ہوا مانتے پر تیوری چڑھانے مجھے غصے سے گھور رہا ہے۔ اور میں ان دہشت ناک اوبام میں گھرا ہوا سہم کر بیٹھا تھا۔ کہ پردے سر کے اور مجھے زبیدہ دروازے میں کھڑی ہوئی دکھائی دی۔ لیکن اپنے سفید شبِ خوابی کے لباس اور لمبے سیاہ بکھرے ہوئے بالوں میں وہ ایسی معلوم ہوتی تھی۔ جیسے ایک سست رفتار دھوئیں میں اس کا چہرہ ساکت ہے۔ اس کی نظریں میرے دل میں اتر کر کچھ کھینچ رہی تھیں +

میں نے اپنے خشک تالوے بمشکل آواز لیکالی ”زبیدہ تم ابھی جاگ رہی ہو؟“
زبیدہ نے کہا۔ شاید اس کی آنکھوں نے کہا ”میں سوچتی۔ میرا دل ساز بجانے کو چاہتا ہے“

بہت دُور سے ایک آواز ہوا میں لرز رہی تھی۔ ”زبیدہ سوچتی“

شاید اس آواز میں مقسوم انسانی بول رہا تھا۔ کہ سنتے ہی میرا دماغ ٹھنڈا ہو کر جم گیا۔ اور میں اور کچھ نہ سن سکا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ اور پھر میرا دماغ چکر کھاتے کھاتے اس وقت ساکت ہوا جب اس کے ساز کی مدہم ہیبت درد و کرب کی اونچی چیخوں میں بدل چکی تھی۔ دُنیا کے خواب کا طلسم چٹخ رہا تھا۔ غیر مرئی دُنیا سے آزاد روحوں کے قہقہے بیدار ہو چکے تھے۔ سُنان رات میں چھت کے اوپر جیسے بہت سے قدم دُڑ رہے تھے۔ کمرے کے پردوں کے پیچھے کوئی حقیقت ظاہر ہونے کو لرز رہی تھی۔ اور میری آنکھوں کی دہشت باہر اُبل پڑنا چاہتی تھی۔ میں اٹھنا چاہتا تھا کہ زبیدہ کا ہاتھ پکڑ لوں۔ مگر ایک مضبوط گرفت نے مجھے کُرسی کے ساتھ جکڑ رکھا تھا۔ اور میرے ہاتھ کُرسی کے بازوؤں کو نوچ نوچ کر رہ جاتے تھے۔ ساز کی تیز باریک آواز میری رُوح کے بندھن کو کاٹ رہی تھی۔ میں اس خواب سے بیداری کی سطح تک پہنچ چکا تھا کہ ساز کے تار ایک فلک شکاف چنچ کے ساتھ ٹوٹ گئے۔ کمرے کی دیواریں دروازے اور پیشے یک نخت تھر تھرائے۔ زمین کے نچلے طبقات میں سے لاتعداد روحوں کے کراہنے کی گرج سنائی دی۔ سطح زمین نے ایک کروٹ لینے کی کوشش کی۔ آسمان پر تِزاق تِزاق ستارے ٹوٹے اور ٹوٹتے چلے گئے۔ اور پھر اندھیرا۔ ساٹا۔ دیرانہ — زبیدہ اس خواب کے رنگین جال سے آزاد ہو چکی تھی۔ اور اب میری رُوح پر ایک سفید بھاری۔ برف سے ہاتھ کا بوجھ ہے۔ لمبی لمبی چھپی ہوئی انگلیاں میرے سینے کی گہرائیوں میں کسی چیز کو ٹٹول ٹٹول کر باہر کھینچ لینا چاہتی ہیں۔ زبیدہ مجھ کو جگا رہی ہے شاید اس گہری نیند سے بیدار کرنے کے لئے مجھے جھنجھوڑ رہی ہے۔

سید امتیاز علی تاج

تاروں کی دُنیا

تاروں کی دُنیا میں خدا جانے وہ کیا ہے جو مجھے اپنی جانب کھینچتا ہے؟ وہ کیا ہے جسے دیکھ کر
 اک مطمئن اضطراب دل غمیدہ میں جاگزیں ہو جاتا ہے؟
 میں دیکھتا ہوں کہ ان تاروں میں کچھ ایسے ہیں جو ساکن و خاموش رہتے ہیں جیسے غم کی یابی! اور کچھ دھندلے اور دُور دراز جیسے گئے گزرے دنوں کی یاد!
 کچھ روشن دُتاباں ہیں جیسے کسی پاک و صاف دل رکھنے والی محبوبہ کی آنکھیں!
 اور کچھ ٹمٹماتے ہیں جیسے اُس ماں کی محبت بھری نگاہیں جو آبدیدہ ہو کر اپنے پچھڑے ہوئے
 بچوں کو پکارتی ہو!

۷۹ تو کیا ان آئینوں میں حیات انسانی عکس ریز ہے؟
 یا کیا یہ چراغ اپنی روشنی میرے رنج و راحت پر ڈالتے ہیں اور ہر رات اپنے اشاروں میں
 میری زندگی کی گونا گوں کمانی سُناتے رہتے ہیں؟
 اور اگر یہ نہیں تو پھر اس تاروں کی دُنیا میں اُد کیا ہے جو مجھے اپنی جانب کھینچتا ہے؟
 جسے دیکھ کر میرا دل کبھی شاداں ہے اور کبھی رنجور!

میں جانتا ہوں کہ میں اک مسافر ہوں رہِ راست سے بھٹکا ہوا اور گو فطرتاً آزاد روش ہوں
 لیکن خواہشاتِ رنگین سے محصور!
 گونا گوں دُکھ پیوں کا پیلا ہوں لیکن اسرارِ خودی سے بے خبر!
 ہر شے کا متلاشی رہتا ہوں لیکن حصولِ مدعا پر اپنی آرزو سے بیزار! — میرے دن
 دُکھ پی سے خالی ہیں اور میری فضا پر وارِ تخیل کے لئے تنگ اور ناموزوں!!
 لیکن

اک تنہا سامانِ مسرت میرے لئے موجود ہے کہ ہنوز میری راتیں اسی سوچ میں کٹتی ہیں کہ حُسن کے

ان نفعی روشن کھلونوں میں کیا وہ روشنی عیاں و پنہاں ہے جسے میری تاریک و نایاب قیمت ڈھونڈتی ہے؟
 کیا وہ محبت ہو یا دلپوشیدہ ہے جسے میرا گناہ آلود ضمیر تلاش کیا کرتا ہے؟
 کیا وہی راز منظور و مستور ہے جس کے لئے میرا نفس خراب و خستہ حال ہو رہا ہے مگر سرکشگی سے
 پناہ کہیں نہیں؟ — اور اگر یہ نہیں تو پھر تاروں کی اس دُنیا میں اور کیا ہے جو مجھے اپنی سمت
 کھینچتا ہے؟

یہ میں سمجھتا ہوں کہ میری زندگی کا سب سے اہل جذبہ جذبہ عشق اور کائنات کا صادق ترین
 جلوہ جلوہ حسن ہے۔ اور مجھے اس کا احساس بھی ہے کہ جب میں ان دور دراز روشنیوں پر نگاہ دوڑاتا
 ہوں تو میری محبت تلاطم میں آجاتی ہے اور میری ساری زندگی درہم برہم نظر آنے لگتی ہے! اُس
 وقت میرا دل جان لیتا ہے کہ اُس نے قابل حصول آرزوؤں کے تعاقب میں قوت ضبط کو کھدوایا، اپنی
 انمول فطرت کو سیم و زر کے بدلے بیچ ڈالا۔ اور محبت کو جہاں مردت کا نام و نشان نہ تھا بکھیر دیا!
 اک عمر بونہی کٹی کہ میں نے محبت کو غرض کے ساتھ ہلکا کر پایا، وفا کو جفا سے دو چار ہوتے دیکھا،
 ضمیر کو اپنے ہی نفس سے دست و گریباں ہوتے نظارہ کیا! میرے دن یونہی گزر گئے! — افسوس!
 — لیکن صد شکر کہ اک تنہا سامانِ انبساط میرے لئے باقی ہے کہ ہنوز میری راتیں اُن حسین روشنیوں
 سے معمور ہیں جن کے پر تو نے دلِ حیرت میں اک اچھوتی آرزو پیدا کر دی! میں نے جان لیا کہ آرزو حصول کے لئے
 نہیں کہ عشق حقیقی وہ ہے جو وصل سے نا اُشار ہے کہ حیاتِ انسانی کا صحیح سکون سکون اضطراب ہے!!
 میں نے جانا کہ سچی کشش وہ ہے جو ہمیشہ دل کو اپنی طرف کھینچتی رہے! سچی آرزو وہ ہے جو کمال
 کی محبت نہ ہو اور سچی محبت وہی ہے جو مدعا ئے محبت کے لئے جدوجہد کرتی رہے اور اس جدوجہد
 ہی کو مآلِ حیات تصور کرے!!

میں کیا ہوں ؟

پھولوں سے بار بار پوچھا۔ 'سنا سمجھا سب نے۔ گردن ہلاتے بھی نظر آئے مگر ہمیشہ مسکرا کر چپ رہے۔ اے ظریف طبع پری زادو! تمہیں سب کچھ معلوم ہے مگر تم بتاتے نہیں۔
بادلوں سے۔ کن بادلوں سے؟ وہ جو شب ماہ میں چاندنی کی جھولیاں بھر بھر بچپن کی ادا لئے بھاگے بھاگے پھرتے ہیں بار بار یہی سوال کیا مگر وہ ہمیشہ یہ کہہ کر کہ پھر ملیں گے تو بتائیں گے ملتے رہے۔

تاروں سے۔ اُن پیارے تاروں سے جن کی پیام محبوب رساں کرنیں ولولہ انگیزی تخیل پرور کی سحر کابریاں کرتی ہیں برسوں ہی تکرار رہی مگر نتیجہ ندارد!
پھولوں میں، بادلوں میں، تاروں میں ایک ہی سازش خموشی کا اثر ہے۔ یہی میرے دوست ہیں اور یہی دلدادہ حسنِ ستم روائی!

کیا کروں! کس سے پوچھوں؟

ہاں! وہ ایک بھولی بھالی لڑکی پانی بھرنے لئے گاگر سر پر تولے ہوئے دامن کوہ والے چشمے کی طرف خوشی خوشی جا رہی ہے۔ کیا مجھے معلوم ہوتا ہے یا واقعی زمین اُس کے پاؤں چوم رہی ہے؟ نہیں نہیں! سچ مچ پک ڈنڈی کے ادھر ادھر کے پھول اُس کی طرف جھک رہے ہیں۔ اے لو! دیکھو! دیکھو! چھوٹی چھوٹی شربیلی جھاڑیاں جھوم جھوم کر اُنہیں پر نظر کادم کر رہی ہیں۔ اُسے دیکھ کر ایک کبوتر نے خوشی سے بازی لگائی۔ چڑیاں نلچ کرنے لگیں۔

ارے! ایک دلیر تنکے نے لپک کر اس کا دامن جالیا۔ ہیں ہیں وہ اسے کیا کہہ رہا ہے؟

تنکا۔ آپا تم کل کیوں نہ آئیں؟

لڑکی۔ لو! الٹی بات۔ میں تو کل آئی تھی، تم میں سے کوئی تھا ہی نہیں!

تنکا۔ یہ بھی کبھی ہو سکتا ہے؟ آپ نے کل وہ برقع پہن لیا ہو گا جس کی تاثیر سے بھولی لڑکیاں

ہماری نگاہ سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔

لڑکی۔ کیسا برقع؟

تینکا۔ بی آپا برا نہ مانو توصاف صاف کہہ دوں۔

لڑکی۔ (مسکرا کر) بھائی! تمہاری دل لگی کی عادت نہ گئی۔ میں اور تمہاری بات کا بُرا مانوں؟

تینکا۔ بی آپا۔ اس بُرقع کا نام خود بینی ہے۔

اے غضب پھر تم نے وہی پہنا۔ اچھا رخصت!

یہ کیا ہوا؟ پھول تنکے۔ جھاڑیاں کبوتر چڑیاں سب اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ اس بھولی لڑکی کو اب کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ چلوں اس لڑکی سے پوچھوں کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ نہیں کیا پوچھنا ہے۔ نہ اس کی وہ چال ہے نہ وہ نگاہ ہے۔ یہ پل کی پل میں کیا طلسمات کا کھیل ہوا۔ وہی دامن کوہ، وہی گارگر مگر لڑکی بدل گئی۔ لونا گُل کھلا۔ گارگر میں اور پانی میں باتیں ہونے لگیں۔

چشمے کا پانی۔ کب سے تمہاری راہ تک رہے ہیں۔ دیر سے بلا رہے ہیں کہ تم آؤ اور ہم تمہاری گود میں شہر کے گھروں کی سیر کرائیں۔ لو آؤ۔ اٹھا بھی لو۔ ہم اور تم مل کر گائیں گے۔ گارگر۔ مجھے تمہارے بغیر کب چین آتا ہے۔ آؤ شوق سے مگر ذرا میں بھی تو نہ مانوں۔

کیا خوب! پھر سین بدلا۔ پھر وہی اصلی لڑکی ہے۔ گارگر کو مانجھ رہی ہے۔ گارگر خوب جھمکانے لگی۔ چشمے کا پانی تالیاں بچلنے لگا کہ آپا آئیں آپا آئیں۔ چلوں اب اس لڑکی سے پوچھوں کہ میں کیا ہوں؟ میں کیوں ہوا؟ میں کیا ہوں؟

لڑکی۔ کانوں میں انگلیاں دیکھتے تب میں بتاؤں۔

اس لڑکی کی پانی کی۔ ہوا کی آواز اس وقت ایک ہے! میرے جھمکانے کا بند ہو گئے۔

آنکھیں بھی! میں میں نہیں ہوں اور یہ سن رہا ہوں:-

پانی۔ ہوا۔ لڑکی۔ پھول۔ تنکے۔ (ایک زباں ہو کر) آپ دیوتا ہیں۔ بلکہ اس سے بھی بالاتر۔ آپ کچھ بھی نہیں بلکہ اس سے بھی کمتر۔ انحصار صرف اس بات پر ہے کہ آپ کی نیت کیا ہے۔ اے عزیز اپنا دھوبی آپ بن اور دل کو دھو ڈال۔ قلی بن اور نیکی کی گٹھڑی اٹھا۔ خود پسندی چھوڑ

جگ پسند بن۔ سمجھ سمجھ! خدمت کو ایمان۔ ایمان کو جان!!

بات تو صرف اتنی تھی کہ میں گزر رہا تھا اور میں نے معمولی طور پر ایک بھری گاڑی کو سر پر دھروانے میں مدد دی۔ اس ایک ٹانٹے میں اتنا ڈراما کس طرح ہو گیا؟ مگر میں نے حقیقتاً سب کچھ دیکھا۔ سب کچھ سنا۔ اور سب کچھ بھونگے۔
میں بعض دفعہ آنا فنا کس طرح بدل جاتا ہوں۔ کیا میری بیداری غفلت ہے اور میرے یہ کبھی کبھی آنے والے خواب حقیقی بیداری؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا ہوں؟

عبدالعزیز

یہ تم سے نہ ہو گا

نہیں! کلیوں کو شگفتہ کرنا، یہ تم سے نہ ہو گا!
کلی کو ہلاؤ، اُسے جھٹک دو لیکن یہ تمہارے بس میں نہیں کہ اُسے شگفتہ کر سکو۔ تمہارا اُسے خراب کر دیتا ہے تم اُس کی پنکھڑیوں کو پاش پاش کر دیتے ہو اور پھر انہیں خاک پر منتشر کر دیتے ہو لیکن نہ اُس میں رنگ آتا ہے اور نہ خوشبو پیدا ہوتی ہے۔

آہ! کلیوں کو شگفتہ کر دینا، یہ تم سے کبھی نہ ہو گا!
وہ جو کلی کو کھلا سکتا ہے کس سادگی کے ساتھ اُسے کھلاتا ہے۔ وہ صرف اُسے اک نظر دیکھتا ہے اور خونِ حیات اُس کلی کی رگوں میں دوڑ جاتا ہے۔ اُس کے نفس پر پھول اپنے پر پھیلا دیتا ہے اور ہوا میں پھر پھڑکتا ہے۔ رنگ دل کی اُنگوں کی طرح اُس میں بھر جاتے ہیں اور خوشبو اک شیریں سارا آتشکار کر دیتی ہے۔

وہ جو کلی کو کھلا سکتا ہے کس سادگی کے ساتھ اُسے کھلاتا ہے!

بزم تحقیق

اس عنوان کو بھی ہم مستقل کرنا چاہتے ہیں اس کے ذیل میں اردو زبان کے متعلق تحقیق طلب سوال اور ان کے متعلقہ جواب درج ہوا کریں گے کسی خاص مسئلہ زبان پر مشاہیر اہل زبان کے خیالات باہمی اختلافات پھر ان پر مجاہد کے شائع ہوں گے ذیل میں اردو زبان کے اہل الرائے کی توجہ منقط کرنے کی غرض سے چند سوالات درج کئے جاتے ہیں۔ امید ہے کہ ماہرین زبان اپنے گرانقدر خیالات سے مستفید فرمائیں گے !

(۲) (۱) - اردو گرامر کی رو سے غیر فارسی غیر عربی لفظ کی اضافت فارسی عربی لفظ کی طرف نہیں ہو سکتی ایسی طرح اس کے برعکس انگریز اس قدر غلو سے کام لیا جاتا ہے کہ وہ عربی و فارسی لفظا جن کے ہندی استعمال میں ذرا سا اختلاف حرکت و لہجہ پیدا ہونے کی وجہ سے انہیں مُندہ کا خطاب دیا جاتا ہے ان کی اضافت بھی جائز نہیں مثلاً لفظ "موسم" بکسرہ سین عرب نثر ادا ہے۔

”صادق موسم الخیف عجمان العیض“

اردو میں "موسم" بفتح سین استعمال ہونے کی وجہ سے یہ مُندہ ہو گیا ہے اور اس کی اضافت بصورت مُندہ جائز نہیں چنانچہ مرہم گل کا قافیہ اگر موسم گل باندھا جائے تو غلط سمجھا جاتا ہے کیونکہ اضافت کی حالت میں موسم مرہم کا ہفتاویہ ہو گا نہ کہ مرہم کا۔

(ج) - وہ اسم صفت جو کسی اسم و امر کی ترکیب سے بنایا جاتا ہے جیسے دل دار - دوریں - اس کے متعلق بھی یہی حکم ناطق ہے کہ اس مرکب میں امر کے ساتھ جو اسم ہو عربی یا فارسی ہو نا ضروری ہے۔ ضرورت

(۱) - اردو زبان کو ہندوستان کی مشترکہ لٹری زبان قرار دینے کے لئے اسکو وسعت دینے کی ضرورت ہے تاکہ ہر قسم کے خیالات مضامین - دقیق سے دقیق علمی مسئلے اس کے ذریعہ سے بطور احسن بیان کئے جاسکیں، دوسری علمی زبانوں کے ترجمے اس شان سے اردو میں ہوں کہ اصل زبان کا زور کلام، فصاحت و بلاغت، لہجہ و ظاہر ہونے کے ساتھ ہی اردو بھی اپنی صفات سے پہچنی ہو جائے، اس مقصد ہم کے حصول کے لئے ضرورت ہے کہ

۱۔ اردو مصادر کو وسعت دی جائے۔

ب۔ الفاظ کی صفات متحرکہ کی حدود وسیع کی جائیں۔

ج۔ تشبیہات کو طویل الذیل بنایا جائے۔

د۔ اردو گرامر کی محدود چار دیواری کو منہدم کر کے حد نظر تک محیط قلم تعمیر کیا جائے۔

۵۔ دبی اور گھنٹوں کی بجائے بند شول سے اردو کو آزاد کر کے لامرکیت کے صول رائج کئے جائیں۔

و۔ اردو نظم کو معینہ بخور و آواز ان میں محدود رکھنے کی بجائے بلیک ورس اور اسی قسم کی نثرناظموں کو رواج دیا جائے۔

بھی ”صحیح“ کو فعل کے وزن پر نہیں ادا کرتا بلکہ صحیح ہونے کی استعمال ہوتا ہے تو کیا اردو کو مستقبل کی عام ملکی زبان بنانے کی غرض سے اس قسم کے الفاظ کی کتابت کو مردہ تلفظ کے مطابق بنایا جاسکتا ہے؟

— — — — —

میں چاہتا ہوں کہ ان معروضات پر وسیع انجیالی کو پیش نظر رکھ کر اہل ادب غور فرمائیں۔
جوابات مختصر۔ مدلل۔ متین ہوں اور تحریر سے مکابرہ کی شان نہ پیدا ہوتی ہو۔

حضرات ذیل سے خاص طور پر توجہ فرمائی کی دعا
ہے۔ :-

علامہ طباطبائی لکھنوی۔ مولانا شوق قدوائی لکھنوی۔
مولانا شاد داں لکھنوی۔

حضرت ناصر زید فراق دہلوی۔

لالہ سریرام ایم لے مولف فحشاۃ جاوید۔

مولانا وحید الدین سلیم (عثمانیہ یونیورسٹی)

مولانا عبدالحق بی اے۔ (انجمن ترقی اردو)

پندت برج زائن چکبست مدیر صبح امید۔

حضرت بیخود دہلوی ؟

تاجور

ہے کہ ان سختیوں کو کسی اصول کے تحت کم کیا جائے۔ سوال کے دونوں پہلوؤں پر غور کی بہت گنجائش ہے۔

حصہ (الف) میں سائل کے منشا کی تائید

”لب مرکب“ ”مزدور پارٹی“ ”آپ رواں“ ”یگیا قوم“

ایڈیٹر زمیندار وغیرہ الفاظ کرتے ہیں۔

یہ الفاظ روزمرہ میں داخل ہو کر فصاحت کی زبان قلم و

دہن پر بھی قابض ہو چکے ہیں۔ سامع کو حکم بنا کر ایسے بہت

سے مرکب تراشے جاسکتے ہیں جنہیں کثرت استعمال کچھ

دلوں میں فصیح بنا کر اردو لغات میں مستند بنا دیا نہ کرے گی۔

حصہ (ب)۔ پر عملدرآمد کی سفارش الفاظ ذیل

کا استعمال کر رہا ہے۔

سمجھ دار۔ لچھے دار۔ لٹو دار۔ گاڑیاں وغیرہ

(۳)۔ سنسنی خیز۔ رہائش۔ فوق البہرک۔ ہر سال

بالا کو کثرت استعمال نے قبولیت کا جامہ پہنا دیا ہے۔ میں

چاہتا ہوں کہ زبان سے بولنے والے ان سے دلوں کو

بھی صاف کر لیں۔

(۴)۔ لفظ صحیح ہر وزن فیصل ہندوستان کی علمی دنیا

میں بھی اب صرف زبان قلم پر باقی رہ گیا ہے۔ بولنے والی

زبان اس سے قطع تعلق کر چکی ہے۔ اُن مٹھی بھرنے والی

کو چھوڑ کر جو اپنے روزمرہ میں صرف حلق کو حجازی لہجہ

میں ادا کرتے ہیں فصاحت اردو میں سے غالباً کوئی متنفس

نسوانی دُنیا

میں اپنی کمین دُنیا کے قابل ترین ہیئتِ دالوں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے۔ وہ آلہ کے ذریعے ایک نظریں تاروں کے فاصلے کا اندازہ کر لیتی ہے، عنقریب وہ ایک فہرستِ انجم شائع کرنے والی ہے جس میں اُس نے سات لاکھ ستاروں کا درجہ بدرجہ ذکر کیا ہے +

اسال چیرنگ کر اس (لندن) کے طبی مدرسے میں سترہ انعامات میں سے بارہ انعام عورتوں نے حاصل کئے اور صرف پانچ مردوں نے۔ ڈاکٹر فیٹن نے جلسۂ تقسیم انعامات میں تقریر کرتے ہوئے بیان کیا کہ یہاں سب مردوں عورتوں کو برابری کے درجے پر رکھا جاتا ہے۔ اور کہا کہ فہرستِ انعامات پر ایک نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو لوگ مردانہ فوقیت پر پھولے نہیں سماتے وہ کس قدر گمراہ اور حقیقت سے بعید پڑے ہیں۔

امریکہ میں تیس شہروں میں پولیس کے محکمے میں عورتیں موجود ہیں۔ نیویارک میں ایک پولیس کی چوکی میں صرف عورتیں ہی ہیں مرد کوئی نہیں۔ انگلستان میں بھی اس وقت پندرہ سو عورتیں پولیس کا کام سیکھ رہی ہیں اور وائی کونٹ ایسٹر کا دعو ہے کہ یہ صرف ایک تجربہ نہیں بلکہ عورتوں کی قابلیت کا عملی طور پر ثبوت مل چکا ہے +

حکومتِ انگلستان نے فیصلہ کیا ہے کہ برطانیہ کی حدود کے اندر رسولِ سرور میں مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی دخل کا حق عطا کیا جائے لیکن عورتوں کی تنخواہ کم ہوگی +

معاصر العراق (بغداد) خبر دیتا ہے کہ بغداد میں ملک فیصل کے حکم سے وزیرِ تعلیم لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ایک بڑے مدرسہ کی بنیاد رکھنے والے ہیں۔ دُور دُور سے معلومات بٹلائی گئی ہیں + العراق (بغداد)

ۛ

السلام (مصر)

السلام دمدم

(۲۲)

لغات الحجابین

آدم۔ ڈارون کی گم شدہ کڑی۔ ڈارون کا ایک بزرگ جس سے وہ منکر تھا۔ (جٹ)

ایڈیٹر۔ وہ "ہم" جس سے منظم ساری دنیا مراد لیتا ہے۔

وہ نمایندہ۔ جس کی ہستی سے ان لوگوں میں سے کوئی بھی واقف نہیں تھی، یہ نمائندگی کا ادعا رکھتا ہے۔

وہ بیکار پڑھا لکھا۔ جو دنیا کے تمام تجربوں میں ناکام ہو چکا ہے۔

وہ عجیب الخلق انسان۔ جو اکثر حالات میں اپنے اخبار یا رسالہ کا مینجر بھی ہے۔ کلرک بھی ہے۔

چراسی بھی۔ کسی دفتر کا ملازم بھی۔ اور پھر ایڈیٹر بھی۔ اور یورپ کا وہ خوش قسمت سیاست دان بھی۔

جس کی ایک جنبش قلم نظم سلطنت میں انقلاب برپا کر دیتی ہے۔ (تا جبر)

بھائی۔ ایک شخص جو تمہارے ساتھ رہ کر تمہاری تمام کمزوریوں سے واقف ہو چکا ہے اور تمہیں کبھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔ ایک شخص جو تمہارے دوستوں کی بیوقوفی پر ہنستا ہے۔ (جٹ)

بیرسٹر۔ (یاد دل) ایک قوم جو لوٹ مار پر گزارہ کرتی ہے۔ ایک پُر منطق جھگڑالو جو کچھری کے آڈے میں کرائے پر رہتا ہے۔ اور جس کا کام کبھی جھوٹ کو بیچ اور کبھی سچ کو جھوٹ ثابت کر دکھانا ہے۔ لفظ بیرسٹر بیر اور رائے اور رائے معاملے سے مرکب ہے۔ لوگوں کے بیر اور رائے بازی سے فائدہ اٹھا کر اپنی حاصل رائے پیش کرنے والا شخص۔ ایک منہ پھٹ صاف گو آدمی جس سے حکومت اور رعایا دونوں ناخوش ہیں۔ (جٹ)

وہ فاقہ مست جنٹلمین جو بینکوں کے رحم پر زندگی گزارتا ہے۔ جس کی جائداد۔ گاڑی۔ گھر اور اس کا سامان، سب قرضہ ہوں کی نگرانی میں رہتا ہے۔ جو براہ راست فیس کے متعلق کسی موکل سے گفتگو کرنا اپنی توہین سمجھے لیکن دلال کے ذریعے (جس کی آمدنی بیرسٹر صاحب سے کہیں زیادہ ہوتی ہے) دور روپے پی پیٹی پر رہتی ہو جائے جو کسی دعوے کے متعلق یہ یقین کرتے ہوئے بھی کہ یہ پہلی ہی پی پیٹی میں ڈسمس ہو جائیگا۔

موکل کو اس کی کامیابی یا دگر کرنے میں فصاحت کے دریا بہا دے۔ (تا جبر)

تقدیر۔ نکھٹوڈ کا بہانہ۔ قوانین قدرت جو انسان کی فہم سے بالاتر ہیں۔ تدبیر نہ چل سکے کا نام۔ جو کچھ انسان کی مرضی کے خلاف ہو۔ مسلمانوں کا ایک عذر خواہ اصول۔ خدا پر الزام دھرنا۔ (جٹ)

جنتلمین۔ نمائش کا عاشق زار۔ قرض کا ٹھیکہ دار۔ باتیں کرنے والا حیوان۔ سب کچھ جان بوجھ کر نادان۔ آمدنی سے زیادہ خرچ کرنے والا تفریق امین کا محسن، مجسم دیوالا۔ دوکانداروں کا دوست۔ اپنا دشمن سیٹی بجا کر چلنے والا بھجن۔ اچھی خاصی نظر کے باوجود عینک لگانے کا شوقین اپنا، اور دوسروں کا وقت ضائع کرنے کی مشین۔ ”تھینک یو“ اور ”آئی بیگ یو“ پارڈن کے دوروں میں مبتلا۔ ان پڑھی کتابوں کو خوبصورت الماریوں میں سجانے کا شیدا۔ وہ کالنج کا بنا ہوا میر و جس کی قبر پر یہ کتبہ لکھا جاتا ہے:-

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا (ا۔ش)
ایک قسم کا آدمی جو تپلوں کوٹ اور داسکٹ، کالر ٹائی اور جراب، انگوٹھی گھڑی اور عینک سے آراستہ ہو کر اپنی چھڑی نے اپنی ایڑی کو پیچھے کی طرف سے ٹھکراتا ہے۔ بات کرتے وقت آسمان کی طرف دیکھتا ہے کھاتے وقت اپنے ساتھی پر نگاہ رکھتا ہے اور ہنستے وقت اپنی ٹھوڑی سے اپنے کار کو چھو لیتا ہے، ”مرو لطیف“ جس نے عورت کی ادائیں سیکھی ہوں، ایک حیوان جس کے گلے میں تہذیب نے اپنا پھندا ڈال دیا ہے، ایک ”تدن زدہ“ ہندوستانی جس نے نقالوں سے تبدیل لباس کا فن سیکھا ہے۔ (دب)

جو بڑی صفائی کے ساتھ ٹھنڈی سڑک کی دوکانوں سے رومال اور جرابوں کی چوری کرے (الطاف حسین)

س دل لگی۔ (مشرقی) ایک دلبر موبہوم کی یاد میں برسوں صحرائے وحشت کی خاک چھاننا۔

(مغربی) دو دن میں دس لڑکیوں کے ساتھ محبت قائم کرنا۔ (دب)

پُرانے فیشن کے مولویوں سے مذہبی بحث کرنا۔ (اسد)

س ڈاڑھی۔ بالوں کا ایک پریشان مجموعہ جو کشش ثقل کے اقتضا سے نیچے کو ٹٹکتا ہے۔ بالوں کی بنی ہوئی ایک شے جو سروں میں گلوبند اور گرمیوں میں پانی چھڑکنے سے خس کی ٹٹی کا کام دیتی ہے، چہرے کے نق و نق میدان کے متصل ایک گنجان مرغزار جہاں ایک ٹھسار ہر صبح گھاس کاٹتا ہے۔ کبھی کبھی گھاس کاٹتے وقت ایک خون کا چتر بل پر تباہ تو گھسیارا اس پر سفید لکھ ڈال دیتا ہے۔ یہ گھاس جتنی کٹتی ہے اتنی زیادہ بڑھتی ہے۔ (دب)

مسجد میں سے جو تیاں پُرنے کی آڑ۔ خدا سے بھی بڑھ کر پردہ پوش۔ (محمد اسد خان۔ سلمان)

وہ جرم جو نئی روشنی کے دربار میں گردن زدنی قرار پا چکا ہے۔ وہ مولویت کی سند جس کے ہوتے عربی اور دینیات کی تحصیل ضروری نہیں۔ وہ کچھ دار عزت جس کی جانب گستاخ ہاتھ سب سے پہلے بڑھتا ہے

(تاجور)

محفل ادب

یورپ کے علم و فن پر اسلام کا اثر | سٹریچ اے سلیم سی۔ آئی۔ ایم پروفیسر عربی کنگس کالج لندن اپنی

تصنیف ”سلطنت عرب کا عروج و زوال“ میں ایک جگہ علم و فن کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ اس مادہ میں نئی روح پھونکنے کا فخر صرف عربوں کو حاصل ہے۔ یہ عرب ہی تھے جنہوں نے گم شدہ یونانی مصنفوں کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اہل عرب نے علم کی وہ شمع روشن کی جس نے تاریخ کے سیاہ صفحات کو چمکا دیا۔ اور یقیناً اگر عرب نہ ہوتے تو یورپ کی تاریخ اتنی شاندار نہ ہوتی۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ قوموں کی علمی ترقی بجائے تصنیفات کے تراجم و تالیفات سے شروع ہوتی ہے اور عرب کے فضلا اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہ تھے۔ وہ دنیا کے شکر یہ کہ مستحق ہیں کہ ترجموں کی بدولت سنسکرت اور یونانی مصنفوں کو جن کو دنیا بھول جانے والی تھی زندہ جاوید بنایا اور صرف یہ ہی نہیں بلکہ یونانی فلسفہ کو ترقی دی۔ جبر و مقابلہ۔ علم نباتات وغیرہ کو ایجاد کیا اور انتہائی درجہ تک پہنچایا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹیکا کا جلد ۱ (صفحہ ۵۹۶) نے اقرار کیا ہے کہ انچازمی کی تصنیفات نے یورپ والوں کے لئے جو البحرے کے نکات حل کرنا چاہتے تھے رہبر کا کام دیا۔ موجودہ علم کیمیا ابو موسیٰ جعفر کو فی الحقیقت شاق کا نتیجہ ہے۔ (عبرت) ہندوستان اور چین کا سیاسی رفاہ | اس عنوان کے تحت میں معاصر صوفی نے صدر جمہوریہ چین کی سیاسیات حاضرہ پر ایک تصنیف کا دلچسپ اقتباس درج

کیا ہے سطور ذیل اُسی روشنی کا عکس ہیں۔

”ہم لوگ چین میں اپنی گورنمنٹ کو موجودہ تہذیب کے معیار پر لانا چاہتے ہیں اور قریب قریب یہی حال ہندوستان کا ہے جہاں کی پر جوش نوجوان جماعت حکومت و نظام حکومت کے لئے مغربی معیار کو پیش نظر رکھتی ہے۔ لیکن یہ ایک اصولی غلطی ہے کیونکہ قومیت کا سیاسیات و نظام حکومت کا اختلاف ہے۔ اور مشرق میں وہی حکومت باعث امن و خیر ہو سکتی ہے جو مشرقی تہذیب کی حامی ہو۔ جس طرح مغرب کی حکومت مغرب تہذیب کے دوش بدوش ترقی کر سکتی ہے۔ ضرورت ہے کہ جو ملک ترقی کرنا چاہتا ہے وہ اپنی ہی زمین کے تجربات و مشاہدات، اپنی ہی قوم کے دیرینہ روایات و اخلاق و تہذیب پر حکومت کی بنیاد

قائم کرے۔ ورنہ حقیقتاً اختلاف مذاق اک ایسا اختلاف ہے کہ باوجود تمام کوششوں کے اُن میں تصادم ہو جانا ضروری ہے۔
(صوفی)

مرنے کے بعد | ذیل میں مشہور ہندی شاعر ہریش چندر کی اک دلگداز ہندی نظم کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے:-

مرنے والے کا چہرہ وہی ہے جسے زندگی میں چاند کا لقب دیا جاتا تھا۔

وہی باز وہی جن سے بہادری کے بڑے بڑے کارنامے ظاہر ہوئے۔ آہ! وہی پاؤں ہیں جن پر بہت سی پیشانیاں جھک جاتی تھیں۔ وہی سڈول جسم وہی سحر کار زبان جس کی شیرینی گفتار امرت کا کام دیتی تھی وہی ہاں وہی دل دو ماغ ہے جس میں عالی جذبات اور بلند ترین خیالات جگمگا رہے تھے۔ سب چیزیں وہی ہیں۔ صرف اک جان کی گم شدگی سے وہی پیارا جسم زمین پر پڑا ہوا ہے۔ آہ زندگی میں جس کو سب پیار کرتے تھے جو سب کے دل بھاتا تھا صرف ایک جان کے نہ ہونے سے اسے سب دکھتی ہوئی آگ میں جلانے پر کمر بستہ نظر آتے ہیں۔ اُن جن کی نزاکت پُھول کے بوجھ کی بھی متحمل نہ تھی جنہیں دردِ سر کی بھی سہار نہ تھی آج ان کے جسم پر بھاری بھاری لکڑیوں کا ڈھیر ہے۔ انکے سروں کی کپال کر یا ہو رہی ہے۔ جنہوں نے اپنے عزیز و اقربا کو کبھی نہ چھوڑا تھا آج سب انہیں چھوڑے جاتے ہیں۔ آہ وہ آنکھیں چیل کوڑوں کی غذا بن رہی ہیں جن کی جنبش التفات کبھی بڑے بڑے راجاؤں کی اُمیدوں کا مرکز تھی۔ جو اپنی بہادری اور فتوحات کی وجہ سے ساری دُنیا میں بھی نہیں سما سکتے تھے آج دو گز کفن میں مُنہ چھپائے پڑے ہیں۔ اب راجا اور پر جا کا کوئی فرق نہیں رہا وقت نے سب کو ایک ہی نظر سے دیکھا۔ اس وقت خوبصورت و بدصورت۔ امرت اور زہر۔ ایک ہی قیمت رکھتے ہیں راجہ پرو اور راجہ دیہج موت نے کسی کا نشان نہیں چھوڑا۔

صرف کتابوں میں نام کی زندگی بسر کر رہے ہیں + (ستتہ ہریش چندر)

قومیت کیا ہے؟ | ہم نے ممالک غیر کے اخبارات و ادبی رسائل منگائے ہیں اُمید ہے کہ آئندہ نمبروں سے عراق، مصر، و ایران کے جراید کا بہترین انتخاب زینتِ افروز ہمارا ہو کر لگا۔ گاہے ماہے مرہٹی، ہندی،

اور بنگالی کی لکچر کا فن کے درخشاں جواہر بھی نظرِ نوازی کیا کریں گے۔

مُناظرہ اعلیٰ (مصر) نے اپنے تازہ ترین نمبر میں قومیت کیا ہے؟ کے عنوان سے ایک جاذبِ نظر مقالہ شائع کیا ہے۔ محفلِ ادب کی تنگ دامانی کو اس کی تمام فراوانیوں کے لئے ناکافی دیکھ کر اس کا مختصر اقتباس

ہیڈ التغات کرتے ہیں +

”افراد انسانی کے ہر مجموعہ کو گروہ اور قوم کا خطاب نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ قومیت کا اعتبار افراد سے نہیں بلکہ ان رابطوں سے ہوتا ہے جو افراد کو باہم منضبط کرتے ہیں۔ اور حقیقتہً انہیں روابط سے افراد میں روح قومیت پیدا ہوتی ہے۔ ان ہی کے قوت و ضعف سے کوئی قوم ترقی یافتہ و منزل پذیر کلماتی ہے یہ رابطے گویا شعور قومی ہیں۔ قومیت اس شعور قومی کے سوا کچھ ہے۔ یہ شعور افراد میں یکسانیت پیدا کر کے ان میں یہ سمجھنے کا احساس پیدا کرتا ہے کہ وہ ایک ایسی جماعت ہیں جس کی زندگی باہم مشترک ہے۔ اس حیاتیہ مشترک کی حفاظت پر وہ جان و مال قربان کر دینے میں مضائقہ نہیں سمجھتے۔ پھر یہ رابطے یا شعور قومی جن اسباب سے پیدا ہوتا ہے جن امور کے وجود پر اس رابطہ کا ظہور و قوت ہے ان میں سب سے اہم ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) اتحاد جغرافیائی (۲) اتحاد جنسی (۳) اتحاد لسانی (۴) اتحاد مذہبی (۵) اتحاد تاریخی الخ

ہندوستانوں کی اہم ضروریات اطرکے۔ ایل۔ رلیارام ہماری اہم ملکی ضروریات بیان کرتے ہوئے سب سے پہلے اشاعتِ تعلیم پر زور دیتے ہیں:-

آج ہندوستان میں چار دیہات میں سے صرف ایک گاؤں میں اسکول ہے اور تیس کروڑ بچے جنہیں او ایل عمر میں تعلیم ملنی چاہیے ان پڑھ رہتے ہیں + ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق اکتیس کروڑ پچاس لاکھ ہندوستان میں سے صرف ایک کروڑ پچاس لاکھ اشخاص جن میں ایک کروڑ انتہر لاکھ مرد اور سولہ لاکھ عورتیں تھیں پڑھے ہوئے تھے جس سے ۸۵ فی صدی کی تعلیمی اوسط ملتی ہے + اس کے مقابل میں جاپان کی اوسط ۹۵ فی صدی برطانیہ کی ۹۴ فی صدی اضرلاع متحدہ (امریکہ) کی ۹۰ فی صدی ہے + برطانوی ہند میں ابتدائی تعلیم کے ۲۰۳، ۲۰۲، ۱۰۴ اسکول ہیں جن میں ۵۳، ۱۸، ۵ طلبا پڑھتے ہیں۔ ان میں ۴۱۱، ۸، ۵ لڑکے اور ۶۳، ۳، ۱ لڑکیاں ہیں + اگر ہم ہر قسم کی درس گاہیں شمار کریں تو آبادی کے ہر ۱۷۱ اشخاص کے حصے میں صرف ایک درس گاہ آتی ہے + زیادہ ترقی یافتہ ملکوں میں اسکول میں پڑھنے والے اشخاص آبادی میں ۱۵ سے لے کر ۲۰ فی صدی تک ہیں + صنعتی تعلیم کا حال تو سخت افسوسناک ہے۔ ۱۸۷۱-۱۹۱۱ء میں سارے ملک میں صرف ۱۶، ۵۹۴ اشخاص صنعت و حرفت کی تعلیم پا رہے تھے + اسی تعلیمی کمی کی وجہ سے کہ اخباروں و رسالوں کی مانگ ملک میں کم ہے۔ ۱۹۱۶-۱۷ء میں صرف ۳۹، ۷۸ اخبارات و رسائل تھے + ہندوستان میں دس لاکھ اشخاص کے حصے میں ان کی اوسط ۱۲ برطانیہ میں ۱۹ جاپان میں ۵۰ اور اضرلاع متحدہ میں ۲۲۵ ہے +

’ملک کی دوسری بڑی ضرورت زراعت کی ترقی ہے +

موجودہ ہندوستان کے لیے یہ امر باعثِ ننگ ہے کہ حالانکہ اُس کی آبادی کے تین چوتھائی حصے کا صرف زراعت پر گزراں ہے لیکن تاحال اس کام کے لئے دنیا کے جدید ترین ایجادات کو ملک میں رائج نہیں کیا بلکہ انہیں دنیا نوسی چیزوں کو استعمال کرتے ہیں +

صحت عامہ کی بہتری ایک اوزر ضروری چیز ہے +

یہ امر مسلمہ ہے کہ شہروں اور قصبوں میں حفظانِ صحت کا انتظام شرمناک ہے۔ پچھلے دس سالوں کی شرحِ موت کی اوسط ۳۱ء ۳۱ رہی ہے اس مدت میں جاپان کی اوسط ۱۷ء ۱۷ کینیڈا کی ۱۵ء ۱۵ برطانیہ کی ۱۴ء ۱۴۔ اضلاع متحدہ کی ۱۳ء ۱۳ اور آسٹریلیا کی صرف ۱۰ء ۱۰ ہے۔ یہ بات دلچسپی کا موجب ہوگی کہ ایک ہندوستانی کی اوسط عمر ۲۳ برس ہے جب کہ مغربی ملکوں میں یہ اوسط ۴۵ سے لے کر ۵۵ تک پہنچ جاتی ہے۔

(ینگ مین آف انڈیا)

شذرات

[illegible]

بہت گرامی و قدس کا جن کا گھر آؤ جان عبدالرحیم صاحب باریت لائبریری کی سیلوا سبلی۔ یہی علی مغضط صاحب باریت لائبریری ڈاکٹر الحسن سرور دی پی ایچ ڈی میجر محلہ واسیلی۔
(ریگان) یہی علی مغضط کی بی بی نے باریت لائبریری کی صفحہ نمبر ۱۰ پر ڈی وی آر پر فیروز کھٹونو پور کی شیخ زہد صاحب باریت لائبریری۔ یہی علی محمد صاحب اختر بی بی۔ یہاں محمد اسلم صاحب صفحہ نمبر ۱۰ پر
کا قصہ خواجہ شہر آباد کی جاتا ہے کہ ان حضرات نے باہر تخریک "تھانوں" کی اشاعت میں سرگرم حصہ لیا اور ان کا ذکر ہے بھاس کے قریب اور ٹالانہ لڑکر مرنے میں شہید ہوئے۔
جنوری کے "تھانوں" میں فردی نمبر ۱ کی قلم کی فہرست دی گئی تھی۔ اس میں سے اکثر حضرات کے مضامین درجوں میں ہو چکے تھے اور کچھ مضامین کی نلے تھے اسلئے
اس امر کا اندازہ لگنے بغیر اس فہرست میں قلم کے مضامین ایک نمبر میں سما بھی سکتے۔ فہرست شائع کر دی گئی۔ فردی نمبر ۲ کی ترتیب دیتے وقت یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ مستقبل کے لئے کوئی عدد
پڑے گا جسے نہیں لے کر چھوڑے۔ مندرجہ بالا فہرست میں قلم کے مضامین دو سائلوں پر بھی شکل سے سما سکتے۔

مشیرِ اعظم کی گرفتہ توجہ کا ہم شکر یہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ انکی بیکار توجہ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آج جنوری کی ۲۴ تاریخ ہے اور ہم جون

”بزم تحقیق“ کے متعلق جو حضرات کچھ تحریر فرمائیں ان سے سودا باندہ درخواست ہے کہ حد سے زیادہ اقتصاد سے کام لیں کیونکہ دوسرے مضامین کی کثرت نے ”بزم تحقیق“ کو چادر دیکھ کر پاؤں پھینا، ”کا حکم نساہا ہے“ (تاجور)

حصہ نظم کلام اکبر

سکوں ہوتا نہیں دل کو مرادیں بر نہیں آتیں
شب غم کو بسر کر صبح راحت کی امیدوں میں
یہ آہیں عرش تک جاتی تو ہیں کچھ کر نہیں آتیں
مگر دیکھیں کہ یہ کب تک تہ خنجر نہیں آتیں
بلاؤں سے نہ ڈر خاموش رہ۔ کس پر نہیں آتیں
(غیر مطبوعہ)

رباعیات گرامی

ذیل میں مولانا گرامی کی چند بیروں فروز رباعیاں صبح کی جاتی ہیں۔ ہمارا ارادہ تھا کہ رباعیات گرامی کے بالمقابل سجاوٹی بھٹی۔ عمر خٹیم۔ ابو حنیفہ۔ سرمد۔ جامی کی ہم مضمون رباعیاں شائع کر کے ان پر بھی کہ کی خدمت نقادان سخن کی رائے کے سپرد کر دیں مگر افسوس ہے کہ اس مرتبہ ہم اس ارادہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکے کیونکہ ابوسید کی رباعیات (مرتبہ پروفیسر کشوری موسیٰ صاحب تہرا ایم اے) زیر طبع ہیں اور سرمد کی رباعیاں دستیاب نہیں ہوئیں۔ امید ہے کہ آئندہ نمبر میں ہماری جستجو مکمل طور پر کامیاب ہو جائے گی۔ (تاجور)

بر عرش بنویش در ستیز آمدہ ایم
بر ماتمیان آرزو حرف مگیر
آخر بزمین فتنہ خیز آمدہ ایم
ماگر یہ کشتان دسجدہ زیز آمدہ ایم
از کنگر لاسکاں بزیر آمدہ ایم
در دامگہ بلا اسیر آمدہ ایم
ہاں اے اجل! انداز تغافل تا چند
کو سیر نظر فہیب سیر آمدہ ایم
مادش دگان ز لاسکاں آمدہ ایم
از کشور جاں بخاکداں آمدہ ایم
اے مرگ! یکے ز آستین دست برآر
در بخیرہ جسم بجاں آمدہ ایم

پیام امید

نغمہ دیو دھم بھر دے ہیں اک تار میں
اور پرودے دا ڈتسج کوڑتا رہیں

چھوڑ کر پستی کو اوپر دیکھنے والا ہو تو
اک درخشاں لعل ہو۔ تاریک کانہند میں
اور ہمالہ کی بلندی سے تخریر میں
یعنی جسم قوم میں اک دیدہ بے خواب ہو
خون دل سے سینچ اپنے گلشن اُمید کو
پھول ہیں نکلے ہوئے پھل میں ذرا سی دیر ہے
دیدہ نرگس سے اڑ جائیگے آثارِ خسار
قبضہ تاراج خزاں کا مختصر ہو جائے گا
برق بن کر گرمن و تو کے خس و خاشاک پر
اہل دل روشن کریں اس آگ سے اپنے چراغ
تیرے ہر انداز میں اک جادوئے تسخیر ہو
خضر کے انداز اب پیدا ہیں۔ رہزن میں بہت
سوز سے بھر پور ساز روح کا ہر تار ہو
شمع کے بھی پھول ہو جائیں گے تا وقتِ سحر
گر پڑے گی خاک پر زنجیر باطل ٹوٹ کر
پھنس نہیں سکتا ہے پھر ہرگز کوئی تزییریں
(خلیفہ عبدالحمید امیہ سے)

فتنہ شیخ و برہمن سے بہت بالا ہو تو
مثل نقد جاں ہو تو جیب زریاں ہند میں
آپ گنگا کی روانی ہو تری نقیر میں
ملک کی تاریک شب میں صورتِ ممتاز ہو
شامِ غم میں دیکھنا چاہے جو صبحِ عید کو
نخل کی ہر ایک رگ آپ بقا سے سیر ہے
باغ کا ہر برگ اور ہر پھول ہو گا ہوشیار
داغ ہر لالے کا سینے پر سپر ہو جائے گا
ہو نہ کچھ نقشِ تعصب تیری روح پاک پر
رہنمائی کے لئے شعل بنا سینے کا داغ
تو دنیا فی القوم کے ساغر سے لذت گیر ہو
باغبان ہیں برقِ فطرت۔ اپنے گلشن میں بہت
پر تر اداں بادہ اپنا رے سرشار ہو
جل گئے گو ظلم کی آتش سے پروانے کے پر
رنگ لائے گا طلسم نازِ قاتل ٹوٹ کر
ہو کے دانا اتیا نور پور و زنجیریں

لذتِ عرفان

(۱) عقل ہے دھنِ شرمِ نادانی
پھول اس پر نہ مرغِ بستان
رخصت۔ اے حسنِ بستی غانی
مسکنت کیلئے؟ سلطنتِ
رنگِ فطرت ہے عجیبِ ایرانی
گلِ طرینِ نفس نہیں گلِ باغ
حسنِ باتی نے دل کو کھینچ لیا
طرحِ زر کیلئے؟ عافیتِ سوزی

رازدان مدعا کو کہتے ہیں
دل ہے دھنِ رجبِ رحمِ وکرم
برقِ نظارہ ہے فروغِ حیات
یوسفِ روح بھر تو دس میں جا!
حسنِ الفت کا داغِ پیشانی
جلا ہے نذرِ رضا نے رتانی
بارِ دل کیوں نہ ہو گلاں جانی
تن کو چھوڑا ہے عزیزِ زندانی

غم نہ کہ ہے نفیق ابر بے سار
دل ہے ۱ ہ کے اَلَمِ گن لوں
اب میں تھی کہ ہے فطرتِ خودی
مفت ہے بغت ہے۔ خدا کی قسم
کر سکے طے نہ ملک عرفان کو
کنیز بے علوم ہیں لا اِعلم
تو نے سب کچھ پڑھا۔ پچھ نہ پڑھا
قوتِ برقی روح کو نہ سمجھ
عرش کے کنگرے پر طائرِ قدس
کہ ہے انسانِ طہم شانِ خدا
بند کیس اس نے جب ذرا آنکھیں
حسنِ احمد ہوا غمور پذیر
آجکل مادہ ہے زوروں پر
عشق کے فلسفہ کو چھوڑ دیا
ٹھوکر کھائے کیوں قیاس پرست
جس عمل کا قیاس ہے آفاذ
حال پوچھا تھنا ہے جب آکر
چارہ روحِ فلسفی ہے نہ شیخ
عشق کی خرد میں نے دکھلایا
خاک میں اچھائے ہستی پاک
بہد میں قرب۔ پردہ میں جلوہ

خشکی موسمِ زمستانی
دیکھی جائیگی سب گردانی
انسا باہشتِ لا فانی
جان کے بڑے کمالِ روحانی
روحانی و مغربی و کرمانی
عربی سیکھ۔ خواہ عبرانی
نہ پڑھا علمِ نفسِ انسانی
سحر۔ افسونگری پر غیانی
رات کرتا تھا یوں خوشِ عالمی
قدر اپنی نہ اُس نے پہچانی
کھل گیا رازِ بزمِ اسکانی
تھی کیس کُور کی خود افشانی
الغیثا لے حکیمِ روحانی
دیکھنا عقل کی تن آسانی
دیدہ دل اگر ہو نورانی
اس کا انجام ہے ہشامی
رہ گئی ساری فلسفہ دانی
ایک وہمی ہے۔ ایک خفہانی
قطرہ میں طہلِ عرضِ عثمانی
ذرہ میں مہر کی درخشانی
جنس کی وقتِ قحط۔ ارزانی

(۲)

بجر غم میں ہے سخت لطیفانی
کب تک بے علمِ حوس ایک
روئے دھوئے بے جان کھنڈے
درودِ دواؤں کو سنا
دشیتِ وحدت۔ دشیتِ وحدت
بے خبر اپنے نقشِ کر دل پر
مادرِ رشک۔ یاں بضاعتِ بر
پیلے صدقہ ماسوی اندکا
چاہئے ہر نذرِ جنسِ گراں
صدقہ فکر سے نکال گمر

آج اک بے نواسہ ہے دست
ہر قبولِ جنابِ سلطانی
ہر کیا۔ ایک سادہ دفتر
لکھ کے لائی مول لفظِ لائانی
دین ہے گفت۔ وطنِ فغانِ شان
عرفِ محنوں ہے۔ پیشہ حسانی

نہ رخ۔ شرف علی گڑھ

لے تین مشہور صوفی شہزادے عشقِ حقیقی سے مراد

جذباتِ عالیہ

طباطبائی

آپ کو میرے دل زار سے کچھ کام نہیں؛
 رشکِ نجمِ سحری ہے ترا آویزہ گوش
 مجھ کو طوطی کی طرح ذوقِ نوا سنجی ہے
 ابر کی طرح سبکِ رُوح گزر جاتے ہیں
 شعلہٴ شمع نہیں ہوں میں ہوں دامنِ نسیم
 مرکزِ صبر و سکون زیرِ قدم ہے اپنے
 سعد و نحس اپنا ہے۔ اپنا ہی سکون و حرکت
 اپنا منہ اشکِ ندامت میں نظر آتا ہے
 اُس کے جلتے ہی پہلی چاندنی بھی گھرے مے
 موجِ مائے جو غمِ دل تو فلک تک پہنچے
 میں جگر بند و پیہر کا ہوں شیدائے نظم؛

خیر یونہی سی۔ تکرار سے کچھ کام نہیں
 اس ستارہ کو شبِ تار سے کچھ کام نہیں
 در نہ آئینہٴ رخسار سے کچھ کام نہیں
 خلشِ وادئی پر خار سے کچھ کام نہیں
 مجھ کو خارِ سردیوار سے کچھ کام نہیں
 گردشِ گنبدِ دوار سے کچھ کام نہیں
 کوکبِ ثابت و ستار سے کچھ کام نہیں
 مجھ کو آئینہٴ پندار سے کچھ کام نہیں
 کُٹھے اب در و دیوار سے کچھ کام نہیں
 اس کو لیکن لبِ اظہار سے کچھ کام نہیں
 پسرِ ہند جگر خوار سے کچھ کام نہیں

وحشت

ترا حینِ خود آرا دہر میں ہے جلوہ گر مجھ سے
 نتیجہٴ موجبِ عبرت ہے شب کی بزمِ عشرت کا
 نمونہٴ تیرگیِ قبر کا ہے شب کی تاریکی
 معافی کے نہ تھی قابلِ محبت کی خطا شاید
 تغافل ہے ادا اور میں ادا دانِ محبت ہوں

ترے اندازِ پیدائش با نازِ درِ گھر مجھ سے
 کہا رو کے قصہٴ شمع نے وقتِ سحر مجھ سے
 کفن کا ذکر کرتی ہے سپیدے سحر مجھ سے
 کہ جب بگڑے تو بگڑے ہی رہے وہ عمر بھر مجھ سے
 خبر ہے خوب مجھ کو تو نہیں ہے بے خبر مجھ سے

وہ جرم عشق کی تفتیش میں ہیں۔ دل لرزتا ہے
 چھپائی جائے گی کیونکہ محبت کی نظر مجھ سے
 مجھے دینا نہیں منظور اُن کو طعن بیدادی
 کہا جائے گا کیونکہ قصہ در و جگر مجھ سے
 طوائف کتبہ مقصود اب قسمت میں ہے وحشت!
 تقاضا سجدے کا کرتا ہے اُس کا سنگ در مجھ سے
 رضاعی وحشت

وجاہت

کیوں لغزب وضع نہ ہو مہر وادہ کی
 دونوں یو پیاں میری کی کھلائی
 آنیوں اپنی لعل کو وہ کان تک نہ
 یہ ترجمان سے مرے حال تباہ کی
 عشق میں ان بھی اُن کا طغیان ہو گیا
 نیت بدل گئی ہے ہلے گواہ کی
 رکھے یہ لاک اُس شغوبان کجاں نشا
 بگڑی ہوئی تمام عیت شاہ کی
 بٹھی سے سیکرے کی ہم اشج بویرگ
 بنیاد و الدین کے ترخی نقاہ کی
 کہیں میں اب نہیں کوئی صورت پناہ کی
 لکھو ہائے غاؤ دل سے تم اے بتوا
 خنجر چلا ہے یہ حلقہ دم پر مے
 تصویر کھینچ لے کوئی اب قتل گاہ کی
 قاتل پڑا نہیں مے ان نشانِ غم
 تصویر کھینچ گئی ہے یہ تیری گاہ کی
 دقت سفر قریب وجاہت حین ہے
 کچھ نہ چلا بیٹے تجھے اب زوارہ کی

جوش

مجھے تعلیم دی ہے یہ مری فطرت نے بچپن سے
 چمن میں زور رہا ہے کون بل بل کر نشیمن سے
 ادب کو نفل نے اس بحر میں لہریں ہیں وحدت کی
 بلند ہی عرش کی اُس کی سرفرازی سے جھلکتی ہے
 بھرے آنکھوں میں آنسو غم و خواہی کے لئے آیا
 ہلائے ہیں یہ کس استاد نے پردے کہ آتی ہیں
 پنچا اور کے لئے حسن ازل لایا ہے اک شاعر
 کوئی روئے تم آنسو پوچھ لینا بڑھ کے دامن سے
 کوئی کہہ دو کہ شادابی اڑی جاتی ہے گلشن سے!
 اخبارِ ماسوا! ہٹ کر ذرا شاعر کے دامن سے
 تری حرمت پر جس کا سر جدا ہو تپا ہے گردن سے
 صفائے نفس تو نے کہد یا میرے دشمن سے؟
 صدائیں ایک سی اب بر بڑ شیخ و برہمن سے
 چنے ہیں اُس نے تازہ پھول کچھ فطرت کے گلشن سے!!

الہ آباد اب ہم عنقریب اے جوش جاؤ گے

پلٹ کر روئینگے جی کھول کے اکبر کے مدفن سے

تپش

جب ہے دل حسرت نوا ہوش ہے سرگرا بخانی سے بارودش ہے
 آرزو میں موت کی مرتا ہوں میں زندگی میری فنا آغوش ہے
 منتظر ہے کس کی؟ لے باؤ خزاں! میری شیخ آرزو گلہوش ہے!
 رنگِ رخِ تفسیرِ حریفِ مدعا جنبش لبِ معنی خاموش ہے
 اشکِ گلگونِ شیخِ افروزِ حیات دروغِ طاقتِ ربانے ہوش ہے
 دیدہ ہر شوق کیسا انتظار؟ حسرتِ فردا تو محدودش ہے!

دے رہی ہے موتِ تکیوں میں درودِ دلِ دھال سے ہم آغوش ہے
 ہو گئی پیشِ نظر دینائے یاس یہ تماشا ہے دماغِ ہوش ہے!
 شعورشِ نظارہ ہے تشنشاں ذرہ ذرہ طور در آغوش ہے
 نقشِ حیرت ہو گیا طرزِ جنوں سازِ حشتِ نعمۂ خاموش ہے

لے تپش! سرشار میں سستانِ عشق
 ہر طرف گلابِ نگاہِ نوشاوش ہے!

تاجور

حشر میں پھر وہی نقشہ نظر آتا ہے مجھے
 خلشِ عشق گئے مے دل سے جب تک
 رونقِ چشمِ تماشا ہے مری بزمِ خیال
 عبرت آموز ہے۔ برباد ٹی دل کا نقشہ
 وادئی عشق ہے وحشت کدہ دیرانی
 اُن کا بلنا ہے نظر بند ٹی تدبیر اے دل!
 دیکھ کر تجھ کو ہوئے نذرِ تحیر مے ہوش!!
 رہتی ہے غمکدہ دل میں غبلی اس کی
 بُت کو بُت جان کے پوچھ نہیں کا فر اے شیخ!
 تجھ سے میں کیا کہوں؟ لے سوختہ جلوہ طور!
 دل کے پردے میں چھپایا ہے ترے عشق کا راز
 بچ رہا تھا فقط اک تاجور شعلہ سراز

آج بھی وعدہ فردا نظر آتا ہے مجھے
 دل ہی بیٹ جائیگا۔ ایسا نظر آتا ہے مجھے
 اس میں وہ انجمن آرا نظر آتا ہے مجھے
 رنگِ نیرنگی و شبِ نظر آتا ہے مجھے!
 ایک اک ذرے میں صحرانظر آتا ہے مجھے!
 صاف تقدیر کا دھوکا نظر آتا ہے مجھے
 کیا بتاؤں تجھے؟ تو کیا نظر آتا ہے مجھے؟
 دل میں اک داغِ مٹنا نظر آتا ہے مجھے
 بُت میں بُت ساز کا جلوہ نظر آتا ہے مجھے
 دل کے آئینے میں کیا کیا نظر آتا ہے مجھے
 غلوٹِ دل میں بھی پردا نظر آتا ہے مجھے
 وہ بھی بربادِ مٹنا نظر آتا ہے مجھے

فہرست مضامین بابت ماہ مارچ ۱۹۲۲ء

جلد ۱	حصہ نثر	صفحہ	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ	حصہ نظم	نمبر
	ہمایوں کی جانب سے پورے کا انعام	۲	ایڈیٹر	خاموشی۔ ترجمان حقیقت ڈاکٹر شیخ محمد قبال کے لیے پراچند دیواریا	۵۴		
	شذرات	۳	"	کلام اکبر۔ سان العمر حضرت اکبر مرحوم	۵۵		
	جہاں نما	۴	"	رباعیات گرامی۔ مولانا گرامی استاد حضور نظام	"		
	علمی شاعری	۶	"	نچھول۔ ششی جہا راج بہادر برقی کے لیے۔ دہری	"		
	نسوانی دنیا	۸	"	حسن فردا۔ میاں صدق حسین صاحب خالہ بی کے لیے (آنرز)	۵۶		
	تصویر خزاں	۹	"				
	خواں	۹	"				
	تحقیق الالسنہ	۱۱	مولانا قیصری				
	فن تنقید۔ مرزا محمد سعید صاحب کے لیے اسٹنٹ میکر برقی کا تعلیم حرکت ہند	۱۶					
	ز۔ خ۔ ش۔	۲۰	یلدرم				
	لحم خنزیر۔ رائے بہادر پنڈت شمیم بیڈر۔	۲۱					
	عورت اور مختلف مذہب۔ مرزا احسان احمد صاحب کے لیے ایل ایل بی	۲۳					
	آرزو۔ نواب ذوالفقار علی خان صاحب سی آئی جی برکٹس آن ٹریٹ	۳۱					
	افسانے عشق۔ سید مجاہد سید یلدرم کے لیے رجب راکم بونیرشی	۳۶					
	خیالات۔	۴۲	ایڈیٹر				
	مختل ادب	۴۴	"				
	نغات السجا بلین	۵۰	یاران بزم				
	یاد آیام	۵۲	ایڈیٹر				
	بزم تحقیق	۵۳	"				

جذبات عالیہ

- ۱۔ مولانا حسرت موہانی کے لیے ایڈیٹر اردوئے معلیٰ
- ۲۔ حضرت آبرقہ دانی لکھنوی ایڈیٹر کٹر ریاست رام پور
- ۳۔ وقار الاعظم حضرت شرفند (جادوہ)
- ۴۔ ابوالمعالی حضرت یاس عظیم آبادی
- ۵۔ حضرت ندرت میرٹھی
- ۶۔ حضرت غریب سہارن پوری
- ۷۔ ایڈیٹر
- ۸۔ ہمایوں کے متعلق رائیں

ہمایوں کی جانب سے سوپے

انعامی مضمون

اُردو رسالوں میں غالباً ہمایوں سب سے پہلا رسالہ ہے جسے حالات کی مساعدت نے یہ موقع دیا ہے کہ وہ اہل قلم کو بیگاری کے درجہ سے بالاتر سمجھے۔ اسی لئے اُسکے پہلے نمبر میں یہ عام اعلان کر دیا گیا کہ جو پُر مغز و پُر معلومات اچھوٹے مضامین محنت و کاوش سے لکھے جائیں گے صاحب مضمون کے ایما پر انکا مقبول معاوضہ پیش کیا جائیگا۔ اسی سلسلہ میں اب یہ تجویز کیا گیا ہے کہ ذیل کے اہم عنوان پر انعامی مضامین لکھوائے جائیں۔

اُردو ہندوستان کی ملکی زبان کیونکر بن سکتی ہے؟

(۱)۔ سب سے بہتر مضمون پر جو منصفوں کی رائے میں اولیت کے معیار پر پورا اترے ہمایوں کے سرمایہ سے ساٹھ روپے اور اسی حیثیت میں دوم نمبر کے مضمون پر چالیس روپے بطور انعام پیش کئے جائیں گے۔

(۲)۔ اور اگر مضامین میں سے مقرر کردہ معیار پر کوئی بھی پورا نہ اترے مگر ان میں بعض مضامین مفید اور جاذب توجہ ثابت ہوئے تو اول و دوم پر انعام کی مقدار منصفوں کی رائے پر مقرر کی جائیگی۔

(۳)۔ تمام مضامین ایک کمیٹی میں پیش ہونگے۔ جسکے ایک رکن آنرےبل خان بہادر شیخ عبدالقادر بی نے باریٹ لالچ ہانی کورٹ پنجاب ہونگے باقی دو ہمایوں کے دونوں اڈیٹر۔

(۴)۔ مارچ کا ہمایوں چھپنے کے بعد سے تین ماہ تک مضامین کا انتظار کیا جائیگا۔ یہ سہ ماہی مدت اس لئے تجویز کی گئی ہے تاکہ زیادہ غور و مطالعہ کے بعد مضامین پر مغز و پُر معلومات اور مدلل پیرایہ میں لکھے جائیں۔

(۵)۔ مضامین فلسفیکپ سائز کے زیادہ سے زیادہ تین اور کم سے کم دس صفحات پر ہونے چاہئیں۔

شذرات

ہماری خواہش ہے کہ ”ہمایوں“ کا حصہ نظم باعتبارِ انتخاب بہت بلند پایہ ہو۔ اس میں حتی الامکان کوئی ایسا شعر خواہ وہ کسی کا ہو درج نہ کیا جائے۔ جو غیر متین، غیر موثر ہو۔ جسے بھرتی کا کہا جاسکے جس میں کوئی بات نہ پیدا کی گئی ہو۔ تخیل کی ندرت اور اسلوب بیان میں کوئی اچھوتا پن نہ ہو اگر حضرات سخن طراز ہماری مدد کریں تو یہ خواہش ناممکن الحاصل نہیں ہے اسکی آسان صورت یہ ہے کہ اہل نظم پہلے ایک غیر جانب دار نقاد کی حیثیت سے اپنی نظموں کو خود دیکھیں اور انتخاب کا حق ادا کریں۔ اسکے بعد پھر یہ غیر خوشگوار فرض یہ کہتے ہوئے ہمیں سونپ دیں کہ

”تو دانی حساب کم و بیش را“

ہم چشم پوشی و مروت کو پسند نہیں کر کے جو اشعار درج کر دیں تو ہماری جائز قطع و برید پر جس بجبیں نہ ہوں۔ ذرا سے اشار کی ضرورت ہے۔ ان دو انتخابوں کے بعد جو شعر درج ہونگے یقیناً پھوٹے شہزادوں جیسے لیلِ نمار کی گردش اُن پر اُٹا ناز نہ ہو سکیگی کہ پہلے اس نصیحت پر ہم کار بند ہوتے ہیں اور اپنے بائیں اشعار میں سے مذکورہ بالا دو بیدریوں کے بعد چھ شعر درج کرے ہیں۔ ہمیں اسید ہے کہ نیک کے ایہ ناز سحر نگا لپٹی چھائی ہوئی شہر توں اور جفا داری شخصیتوں کا لحاظ نہ کرتے ہوئے اس قابلِ تدار اشار پر بخندہ بیٹنی آمادہ ہو کہ اردو شاعری کو زندہ قلوب کی شاعری بنانے میں سرگرم عمل ہو جائیگے۔

اس علم دوست شخصیت نے سان بھر کے لئے پانچ ایسے مستحقِ طالب علموں کو ہمایوں مفت عطا کی جو ہر ظاہر کی ہے جو ادبیات سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ ہم نے مدارس ذیل پر اس عطیہ کو تقسیم کر دیا ہے۔ دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء، مکتبۃ التبیات، جامعہ اسلامیہ علی گڑھ۔ بنارس، ندوۃ اہل انوار، مدرسۃ المتطہرین کی خدمت میں التماس ہے کہ اپنی اپنی درس گاہ سے ایک ایک ایسے طالب علم کے نام سے ہمیں مطلع فرمائیں جو اردو ادب سے دلچسپی رکھنے کے ساتھ ہی کوئی دینی رسالہ پڑھنے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔

ہم ہمارے مدرسہ جرنل کا جو چھوٹی چھوٹی دلچسپ و فنی تجویز لکھنا یا لکھنے کی وجہ سے سناجیک پریم چند کہلاتے ہیں، شکر یہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے محفلِ ادب کے لئے ہندی اور گجراتی زبان کے بلند پایہ رسالوں کے ساتھ تین ہفتوں میں دلچسپ و فنی تجویز لکھنا یا لکھنے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔

ہندوستان کی لسانی دنیا میں زرخ۔ ش۔ صاحبہ جوہر کی اچانک موت کی خبر سچ و اندوہ سے سنی جا چکی۔ یہ پیکرِ کامل نہ صرف سلسلہ عورات کے لئے بلکہ کل ہندوستان کی ہندوستانی طبقہ کے لئے سرمایہ ناز تھی۔ اس قابلیت کی عورتیں ہندوستان میں بہت کم ہونگی مگر جو اردو کی ایک غیر معمولی شاعرہ تھی انکی آخری نظم ”گلابِ عرفان“ جو انہوں نے خاص ”ہمایوں“ کے لئے لکھی تھی فردوسی کے ”ہمایوں“ میں باصرہ فردز ہو چکی ہے۔ خدا نے تعالیٰ مرحومہ کو جو رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل +

جہاں نما

ہم خود حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو آج کل ہندوستان ہی ہمارے لئے جہاں نما ہے۔ دُنیا کی تازہ ترین تحریک کا مرکز یہی ملک ہے۔ دُنیا بھر کی نظریں ہماری طرف لگی ہیں اور خود ہم کتنا بھی باہر کو نگاہ دوڑانا چاہیں ہماری آنکھیں اندرونی حالت دیکھنے کو بند ہوئی جاتی ہیں، ہم نہیں جانتے ہم کہاں ہیں اور کدھر کو جا رہے ہیں۔ پہلے ہم مُردہ قوموں میں شمار ہوتے تھے آج اتنے زندہ ہو چکے ہیں کہ زندگی کے جوش میں ہم میں سے بعض آتش موت میں قدم رکھنے سے دریغ نہیں کرتے۔ آخر وہ کونسا انقلاب ہے جس نے خاموشی کے ساتھ خواب کو بیدار مجبور ہی کو رضا کاری اور غفلت کو ہوشیاری میں تبدیل کر کے پُرانی دُنیا کو اک نیا جنم دیدیا ہے، سب جماعتیں اقرار کرتی ہیں کہ ہندوستان آؤر کا اور ہو گیا ہے لیکن سبھی اس کا احساس بھی کرتی ہیں کہ موجودہ حالت جتنے سے خالی نہیں۔

”مصورِ فطرت“ کے لفظوں میں ہم بھی دستِ بدعا ہیں کہ ”اے ہر دوار کے دوارے رہنے والے! سن اور دیکھ! امیدیں ڈوب رہی ہیں۔ ارمان جل رہے ہیں۔ ماتم برپا ہے لوگوں کا شور مچ رہا ہے یہ ملک ہندوستان! اس کو تیری امان! فساد و خونریزی، قحط و بیماری کا ہلی و بیکاری سب آفتوں سے جو زمین کی ہوں یا آسمان کی، مشرق کی ہوں یا مغرب کی، دین کی ہوں یا دُنیا کی حفاظت دے۔ حفاظت دے!!“

قرض خواہ مغرب۔ فتح مند اتحادی امریکیوں کے بارِ قرض کے نیچے دیکے پس رہے ہیں! انگلستان پر امریکہ کا فرضہ ایک ارب پچیس کروڑ پونڈ تک پہنچ چکا ہے، انگریزی اخبار آڈٹ ٹک اہل امریکہ کو مخاطب کر کے لکھتا ہے: ”صاحبو! ہم نہیں کہتے کہ اس بارِ عظیم کا ہمارے سر سے اٹھالینا آپ کی فیاضی یا عالی ہمتی ہوگی بلکہ ایسا کرنا آپ ہی کے لئے مفید ہوگا۔ آپ کی تجارت ہمارے مقروض ہونے کے باعث خستہ حالت میں ہے آپ کے لاکھوں مزدور اسی سبب بیکار پڑے ہیں اور آپ کی صنعتیں اسی وجہ سے پریشان حالی میں ہیں۔ ہماری رائے میں آپ یہ قرضہ ضرور ہی چھوڑ دیں گے۔“

انگریزی چانسلر نے اعلان کیا ہے کہ انگلستان نے اس بھاری قرضے کا سود ادا کرنے کا تہیہ کیا ہے۔ سود پچاس کروڑ پونڈ سالانہ ہوگا۔

جلسہ آفرینی - دنیا میں کم بیشہ دروں کو ایسے عجیب کام سے سابقہ پڑتا ہوگا جیسے اُس شخص کو جو پارلیمنٹ کی ممبری کے امیدواروں کے لئے لوگوں کو گلی کوچوں میں جمع کرتا ہے۔ مشہور گذرگاہوں میں تو وہ سڑک کے بیچ میں کھڑا ہو کر آسمان کی طرف ایک فرضی چیز کو دیکھنے لگتا ہے لیکن چپ چاپ کوچوں میں اُسے اس کام میں بہت سی دقتیں پیش آتی ہیں۔ وہ کھڑا ہو کر ایک فرضی آدمی کو "ہی ہی" کر کے پکارتا ہے اور چند لمحوں کے بعد نہایت زور سے چیختا ہے کہ "جون جون" اُم جاری ہے ہو؟ دیکھئے دیکھئے جواب تک نہیں دیتا "یہ شور و غل سُن کر لوگ جمع ہونے شروع ہو جاتے ہیں اتنے میں مقرر آدمی ہلکتا ہے اور تقریر کرنے لگتا ہے۔"

شادی اور شادمانی - بحرالکابل کے جنوبی حصے میں (نیو ہیریڈ کے مجمع الجزائر میں) ایک جزیرہ مالی گولا ہے جہاں کی اکثر شادی شدہ عورتوں کے دو اگلے دانت نہیں ہوتے۔ گاؤں کی بڑھیا عورتیں لڑکی کی منگنی کے وقت اُس کے دو دانت اکھاڑ دیتی ہیں جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اب وہ شیرنگی کا زمانہ ہو چکا۔

ایک اور عجیب دستور یہ ہے کہ ہرنی پگ کی سر کے گرد ایک رسی مضبوطی کے ساتھ باندھ دی جاتی ہے جس سے اُس کا سر بیضوی رہنے کی بجائے آہستہ آہستہ مخروطی شکل اختیار کر لیتا ہے جن لڑکیوں کے سر اس وضع کے بن جائیں وہ خوش نصیب سمجھی جاتی ہیں۔
معلق گاڑی - برلن اور ہیم برگ کے درمیان ایک ریل گاڑی چلتی ہے جس کی لائن بجائے تین پر نصب ہونے کے ہوا میں معلق ہوتی ہے۔ یہ لائن ایک نہر کے اوپر بنائی گئی ہے جس کے ساتھ لٹک کر گاڑی دو سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہے۔
(بے)

نیویارک (امریکہ) میں "ولورٹ" دنیا کی سب سے بڑی عمارت ہے۔ سطح زمین سے (۴۴۰) قدم بلند اور زمین میں اس کا عمق (۱۵۰) قدم تک ہے۔ اس کی ساٹھ منزلیں ہیں۔ چار سو دو ارمطال ہیں اس عمارت کا اک اعلیٰ انسر ہے جس کے ماتحت چار سو آدمی عمارت کے مختلف حصوں کا انتظام کرتے ہیں۔ سات لاکھ پونڈ سالانہ اس کا خرچ ہے۔

علمی شعاعیں

موج خیال۔ ایک حیرت انگیز آلہ ایجاد ہوا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شعاعیں آنکھ میں سے نکلتی ہیں اور انہیں قلمبند کیا جاسکتا ہے، یہ آلہ ایک قسم کا ”برق پیمائش“ ہے جس کے ذریعے سے تنہی سے تنہی برقی موجوں کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ جب ”نظر برقی پیمائش“ پر جمادی جاتی ہے تو ایک قسم کی حرکت پیدا ہوتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظریں کوئی ایسی شے ہے جو باہر کو ضیاء دینے ہو کہ خود بخود حرکت پیدا کرتی ہے تعجب نہیں اگر آئینہ یہ دریافت ہو کہ ہر نگاہ کے ساتھ خیال بھی ہم کا بننا ہے۔ اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ خیال اثر میں حرکت موج پیدا کر سکتا ہے تو پھر اس بات میں بھی کچھ شک نہ رہے گا کہ ایک شخص ہندوستان میں بیٹھا ہوا لندن میں ایک ہم جنس پر اپنے خیالات کا اثر ڈال سکتا ہے، + اثر کی موجیں طوالت میں مختلف ہوتی ہیں۔ ”عسلی“ شعاعیں اتنی چھوٹی ہوتی ہیں کہ لاکھوں ایک ہی انچ میں سما جاتی ہیں اور بے تار کی موجیں بعض اوقات پانچ پانچ میل طویل ہوتی ہیں، ممکن ہے کہ خیال کی موج ہزاروں میل طویل ہو یا شاید بہت چھوٹی سی ہو اور اس حالت میں ایک خیالی موج جو کسی زبردست خیال کے باعث حرکت میں آئے ہزاروں میل کا فاصلہ طے کریں گی حتیٰ کہ وہ ایک ہم خیال دل تک رسائی پالے +

ایک موم بتی۔ نیویارک کے ایک گرجے کو ایک موم بتی مشہور مننی کیر و زو کی یادگار کے طور پر ہدیہ دی گئی ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ یہ بتی ۶۹۲۱ء تک برابر جلتی رہے گی (داگر دنیا کا اس سے پہلے ہی خاتمہ نہ ہو گیا) اس کا وزن ۵۰۰ سیر ہے۔ اس پر حضرت مسیح کی تصویر منقوش ہے اور تمام ان لوگوں کے نام بھی اس پر کندہ ہو گئے جنہوں نے اس کے تیار کرنے کے لئے چندہ دیا، موم بتی ہر سال کیر و زو کی پیدائش کے دن ڈونومبر کو روشن کی جائے گی اور اس میں اتنا موم ہے کہ وہ پانچ ہزار برس تک جل سکے گی، + وہ متواتر ایک لاکھ بیس ہزار گھنٹے جل سکتی ہے یا تقریباً ۱۴ برس نیویارک کے اطالوی یتیموں نے یہ موم بتی گرجے کو دی ہے۔ کیر و زو نے ان بچوں کی اپنے کمال فن سے عمر بھر اعانت کی +

امریکی اخبارات۔ دول متحدہ (امریکہ) میں ۲۳ ہزار سے زائد اخبارات چھپتے ہیں۔ ان میں ۲۵۰۰ روزانہ اخبار ہیں باقی ہفتہ وار یا ہفتہ میں دو یا تین بار چھپنے والے۔ رسالے ان میں شامل نہیں ہیں + شکاگو کے شہر میں ۴۰ روزنامے ہیں جن میں سے صرف ۱۲ انگریزی زبان میں ہیں۔ باقی ماندہ جرمن۔ بوہیمی۔ پولی۔ ہنگری۔ اطالوی۔ سلوویکی زبانوں کے اخبار ہیں۔ لیکن فرانسیسی کا کوئی روزنامہ نہیں ہے + امریکی لوگ اخبارات کے اتنے مشتاق ہیں کہ پچیس ہزار کی آبادی والے چھوٹے شہروں میں بھی ایک روزنامہ ضرور ہوتا ہے۔ کاروباری آدمی کی بھوک ہر روز تین چار اخباروں سے پوری ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی بیوی بچے اور اخبار پڑھتے ہیں + اس جوع الاخبار کی وجہ ہے کہ ایک ایک امریکی اخبار دن میں کئی دفعہ چھپتا ہے۔ اور یہ عجیب واقعہ دیکھنے میں آتا ہے کہ صبح کے اخبار شام تک چھپ چھپ کر بکتے ہیں اور شام کے اخبار صبح کے نو بجے تک اپنا آخری ایڈیشن شائع کرتے رہتے ہیں +

دنیا نے اسلام میں یہ خبر مسرت سے سنی جائیگی کہ دولتِ خدا واد افغانستان کی علمی بیداری اب ایک عظیم الشان یونیورسٹی کی صورت میں رونما ہوئی ہے۔ کابل کے سفیر یورپ جنرل واما محمد خاں اس یونیورسٹی کے لئے سائنس کے فرانسیسی اور امریکن پروفیسرز بہم پہنچا رہے ہیں +

تاجور امان افغان

لاہور کی مشہور نو تعمیر کردہ بوٹوں کی دکان ”کرنال شاپ“ کی پیشانی پر ہندوستان کے حیرت کار خوشنویس منشی دین محمد صاحب نے جلی حروف میں چوبیس ایچ قط کے قد آدم فلم سے ”کرنال شاپ“ لکھا ہے۔ جس کا لام اٹھارہ فٹ لمبا ہے۔ اور جب بائیں فٹ لمبی سبکدستی کا کمال یہ ہے۔ کہ اپنے تئذ کی برابر قلم سے یہ حروف لکھے ہیں۔ مگر حروف کی نوک پلک اور باصرہ فروزی کو دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ قلم کے قط کی چوبیس ایچ چڑاٹی و حروف کی بائیں فٹ لمبائی فنِ کتا بت کی خوبیوں میں حارج ہوئی ہے۔

مالکانِ دکان نے ان دو حرفوں کی اجرت دو سو روپے ادا کئے ۷



نسوانی دنیا

مستوراتِ مصر کی مرکزی سیاسی انجمن کا ایک وفد لارڈ کرزن کی پیش کردہ شرائط کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی غرض سے لارڈ ایلنبی گورنر مصر کی خدمت میں حاضر ہوا تھا عزیز علی فوزی صاحب نائب ناظم کی جانب سے روزنامہ "المقطم" (مصر) میں وفد کا بیان شائع ہوا ہے۔ اس بیان کے تہور آمیز لہجہ کو دیکھتے ہوئے مصر کی حیرت انگیز نسوانی بیداری کا اندازہ ہو سکتا ہے + (المقطم مصر) ہمارے اس بزرگمقام میں بھی یادش بخیر اک "آل انڈیا لیڈیز کانفرنس" قائم ہوئی تھی۔ لیکن مدت ہوئی وہ خواب پریشاں کثرتِ تعبیر کی نذر ہو چکا +

مصر کی اک مشہور انشا پرداز سیدہ روز خدا نے "مجلۃ النساء" کے نام سے ایک گرائیوہ علمی۔ ادبی۔ اجتماعی۔ نسائی ماہوار رسالہ جاری کیا ہے۔ یہ رسالہ مصر کے منتخب ادبی رسالوں میں شمار ہوتا ہے + ہندوستان میں بھی بنگالی اور ہندی زبان کے بلند پایہ رسلے عورتوں کی ادارت میں شائع ہو رہے ہیں لیکن ایک بدقسمت اردو ہے کہ ہندوستان میں سب سے زیادہ رائج گوشہ گوشہ میں اس کی تعلیم مگر اس کا ایک بھی ایسا قابلِ ذکر نسوانی رسالہ یا اخبار نہیں جو کسی تعلیمیافتہ عورت کے مطالعہ کے لائق ہو۔ (السلام مصر) کے تازہ نمبر میں "المرآة المجدیدہ" (جدید زمانہ کی عورت) کے عنوان سے ایک محرکہ الآراء مضمون شائع ہوا ہے جس میں دورِ جدید کی مشرقی و مغربی عورتوں پر بسیط تبصرہ کے بعد عورتوں کے متعلق مشاہیر اہل الرائے کے اقوال درج کرتے ہوئے قابلِ مضمون نگار اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ لڑکیوں کے سرپرست و مربی اثنائے تربیت میں یہ خیال ضرور رکھیں کہ عورت کا سب سے پہلا اور ضروری فرض یہ ہے کہ وہ امور خانہ داری میں دلچسپی لے۔ اپنے بچوں کی غور و پرداخت کا خیال ہر وقت پیش نظر رکھے۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے نازک کندھوں پر ذمہ داریوں کا کتنا بوجھ ہے، اور وہ ان ذمہ داریوں سے کیونکر سبکدوش ہو سکتی ہے +

تاجور السلام

ہندوستان کے سخی شدہ طبقے کو مبارکباد ہو کہ لیجسلیٹو اسمبلی نے بکثرت رائے پر تجویز منظور کر لی ہے کہ عورتوں کو حقِ انتخاب دیا جائے۔ ہا

خزاں

خزاں کا دن تھا! — زرد پتیاں درختوں سے جھڑ جھڑ کرتی بننے والی آج بچوں گرتی تھیں اور بچے جاتی تھیں، مچھائے ہوئے پھولوں کی پنکھڑیاں ہوا میں چاروں طرف منتشر ہو رہی تھیں اور پارہ پارہ ہو کر گردِ راہ ہوئی جاتی تھیں!

وہ اپنے درپے میں بھی مٹن قدرت کی پڑمردگی کا یہ سماں دیکھتی تھی اور اُس کے خیالات فضا کے گلشن میں اداسی کے ساتھ مچو پرواز تھے۔ خود اُس کی فطرت کو کوئی غم لاحق نہ تھا کیونکہ اُس کے لئے زندگی بہارِ شباب کے پھولوں سے معطر تھی لیکن ان غافل خوشیوں میں قدرت کے مٹن کی پریشانی کی سبک نفس پر اکِ برباہ کی طرح چھائی ہوئی تھی!

”مجھے یہی حال میرا ہوگا، وہ بولی، دودن کی بہار پر بحث غرہ ہے جب آخر مٹن کو زشت نہائی کا سامنا ہے جب یوں بہار کو خزاں سے واسطہ ہے اور زندگی کو موت سے! گلشنِ فطرت میں کوئی کیوں پھلے پھولے؟ بزمِ عشرت میں کوئی کیا محوِ طرب ہو جب مسرت کا انجام مشقت اور گوبائی کا نتیجہ ابدی خاموشی ہے!“

× × × اور اداسیاں پھر اُس کے دل پر تاریکیاں بن کر چھا گئیں!

چوں چوں کرتی اک چڑیا اُس کے پاس سے گذر گئی، دخت کی پتیاں ہنوز جھڑ جھڑ کر ہوا میں بکھر رہی تھیں لیکن چڑیا اپنے چہموں میں مصروف و مطمئن تھی اور چاروں طرف خوشی کے نغمے گاتی ہوئی اڑ رہی تھی! اُس نے حیرت سے چڑیا کو دیکھا اور کہا کہ ”تیرے پھول مڑھ گئے، جن پتیوں میں تیرا کاشنا تھا وہ زرد و ہو کر مٹی میں مٹی ہو گئیں اور تُو اپنا گانا گارہی ہے!“

”ہاں! لیکن خوشی کبھی نہیں مڑھ جاتی“ چڑیا نے مسکرا کر کہا ”اور یوں بھی پڑمردگی مٹن کی بہترین نگہ دار ہے“ حسینہ نے اک آہ بھری اور کہا ”پڑمردگی اور مٹن! میں نے تو حُسن کو ہمیشہ شگفتہ ہی دیکھا ہے۔ اے چڑیا! کیا تو خزاں کا پیغام سنا کہ بہار کے دلدادوں کی پھبتی اڑاتی ہے؟

ہلکی ہلکی نسیم کے غمازِ جھونکوں نے یہ باتیں بھی پنکھڑیوں کی طرح جن کے کونے کونے میں پھیلا دیں!

چڑیا چوں چوں چوں کرتی اڑ گئی اور سوکھے ہوئے درختوں ویران گلزاروں کا چکر لگاتی ہوئی اک جھاڑی کے قریب جا بیٹھی جس میں چند ہرے پتے اور صرف ایک کھلا ہوا پھول موجود تھا اور بانی حسن کی موتیں ہیو نہ خاک ہو چکی تھیں! ”اب میں تجھ سے جدا نہ ہوں گی“ وہ گویا ہوئی ”شیریں پھول! تو مجھے پیارا ہے“ لیکن بہار کے آخری پھول نے منہ پھیر لیا اور کچھ جواب نہ دیا۔

چڑیا نے ذرا حسرت سے کہا محبت بھی کتنی دشوار ہے ”لیکن پھول نے کچھ جواب نہ دیا۔ ہاں اسکی کھلاتی ہوئی پنکھڑیوں سے یہ ٹوٹی ہوئی آواز پیدا ہوئی کہ اگر پرمردگی حسن کی بہترین نگہداشت ہے تو اسے چڑیا! شگفتگی لا حاصل ہے! تو پھول کی وہ باتیں بھول گئی اور پھول آزاد ہو گیا۔

چڑیا بدحواس ہو کر اڑی اور سوکھے ہوئے درختوں اور ویران گلزاروں کا چکر لگاتی ہوئی اُسی دیکھے کے قریب جا پہنچی جہاں اک انسانی پھول اپنی بہار کے خیال سے سرنگوں ہو رہا تھا۔ چڑیلے کان میں یہ لفظ گونج رہے تھے ”تو پھول کی وہ باتیں بھول گئی“ اُس کا دل شاید ہمیشہ کیلئے پرمردہ ہو جاتا اگر حسینوں کی دنیا میں اپنے محبوب کی بھولی ہوئی باتوں کی یاد تازہ کرنا اُس کی زندگی کی تنہا باقی مسرت نہ ہوتی۔

چڑیلے کما اے حسینہ! غم نہ کر جس پرمردگی و شگفتگی سے آزاد ہے اور آزادگی ہی حسن کی بہترین نگہبان ہے غم نہ کر اے حسینہ! اور اُن رس بھری باتوں کو مٹنے سے جو ایک بوستانی پھول نے شاید اک انسانی پھول کی شادابی کے لئے میرے گوش گزار کی تھیں۔

”حسن کی دنیا میں ظاہر باطن سے جدا نہیں! جو کچھ نظر آتا ہے وہ اُن دیکھے کا جلوہ ہے! لیکن جو کچھ تو دیکھتا ہے وہ بھی فریب کاری نہیں اگر تیرا دل ہی تجھے دھوکا نہ دے۔ زشت نمائی تو محض بھٹکی ہوئی آرزو کی کج نظری ہے اور اُس کا وجود حقیقت میں نیستی پس ہر جگہ بکھرا ہوا ہے اور کونسی شے حسین نہ ہوگی جب حسن ہی کائنات کا پیدا کرنے والا ہے! چند روزہ حسن کو دل نہ دے اور دل دے تو اُس کی خزاں کو بہا سے جدا نہ دیکھ! کیونکہ بہا حسن کو یا ہے اور خزاں خاموشی حسن! بسکون کہہ سکتا ہے کہ شاید حقیقی کی خاموشی اُسکی گویائی سے زیادہ دلکش نہیں! اُسکی کونسی آدا دل دینے کے لائق نہیں! او! کونسا جلوہ ہے جس پر دنیا حسن کے ہزاروں پھول نچھاور نہ کر دے؟

بہار و خزاں تو نگاہ کوتاہ ہیں کی سرب آفرینیاں ہیں اور اگر تو چاہتا ہے کہ حسن کو ہمیشہ شگفتہ دیکھے تو راست روی اختیار کر کہ فقط راستی ہی ابدی مسرت ہے اور صرف حقیقی مسرت دائمی حسن!!

تحقیق الاسنہ

گذشتہ سے پیوستہ

(۸) عربی شرح تمام دنیا کے الفاظ کی لازمی خصوصیات کو ظاہر کر دیتی ہے۔ برخلاف عجمی زبانوں کی شرح کے جن میں قلت الفاظ کے باعث صرف سطحی مناسبت کے اظہار کی بھی بمشکل گنجائش ہے۔ اس لئے علوم کے اصطلاحی الفاظ کی شرح میں صرف اس خیال سے مایوس نہ ہونا چاہیئے کہ عربی جاہل بدویوں کی زبان ہے جن کو آج تک کبھی علم کی ہوا بھی نہیں لگی۔ یا الفاظ اصطلاحات یورپین زبانوں میں ہیں اور زمانہ حال کی ایجاد ہیں اور ان کے ترجمہ یا خود الفاظ اب تک یورپ کے سوا دوسرے ممالک میں شائع و رائج نہیں ہوئے ہیں۔ کیونکہ عربی دراصل ابتدائی زبان انسان کی ہے اور اپنے حال پر اب تک قائم ہے یہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح دوسری قدیم زبانوں کے بہت سے الفاظ متروک ہو کر گم ہو گئے۔ یا بعض موجودہ الفاظ کے سابقہ معانی میں سے کچھ گم ہو گئے۔ اسی طرح عربی کے الفاظ و معانی بھی گم ہو گئے ہو گئے۔ مگر اب تک بھی عربی میں اس قدر گنجائش باقی ہے کہ ہر زبان کے ہر قسم کے الفاظ کی شرح کے لئے صرف ایک کتاب منشی الارب کافی و دافی ہے۔ میں نے ہزار ہا الفاظ مختلف زبانوں کے مشکل سے مشکل انتخاب کر کے اس کتاب میں دیکھے اور اسی کام میں تیس پانچ برس سے لگا ہوا ہوں مگر آج تک ایک لفظ کی بابت بھی ناکامیابی نہیں ہوئی۔ چنانچہ ایک روز خیال آیا کہ ستاروں کے ہندی نام جو ہفتہ کے دنوں سے منسوب ہیں انکو سنسکرت بتایا جاتا ہے۔ یہ اگر عربی سے حل ہو جائیں تو سنسکرت اور عربی کے اتحاد کی عجیب دلیل ہے۔ دیکھنا شروع کیا۔ تو تین گھنٹہ کی محنت سے مندرجہ ذیل شرح حاصل ہوئی جس کے بیان کرنے سے پہلے یہ بات بتا دینی ضروری ہے کہ ستاروں کی لازمی خصوصیت جس نے انسان کو ان کی طرف متوجہ کیا ہے ان کی چمک دمک اور روشنی ہے۔ اس لئے روشنی کا ذکر ستاروں کے ناموں میں ضروری ہے اور روشنی کے معنے رکھنے والے مادے ہی ان ناموں کی اصل ہونگے باقی خصوصیات فروعی ہیں ان کا ذکر بھی ساتھ ساتھ ہوتا گیا ہے۔

سورج کا نام ایٹ جو ایتو اریں ہے۔ مادہ اے کا اسم فاعل مٹوٹ ہے۔ معنی عربی سورج

کے ہیں۔ ثنوث اس لئے کہا گیا کہ عربی میں سورج کو ثنوث بولا جاتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں آیا ہے ”وَإِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ“

سورج کا دوسرا سنسکرت نام آوت ہے جو بکرادت (بکرماجیت) میں شامل ہے یہ عربی آء ضیئت کا مخفف و تبدل ہے۔ آء اسم فاعل آئے کا بمعنی آفتاب ضیئت اصلاً ضنوت بلفظ دال بوزن غفریت اسم فاعل ضنوء کا تھا مگر واقبل مکسوری سے بدل جاتا ہے اس لئے ضیء و ثنوت بن گیا جس کا مخفف و ثنوت ہے بمعنی مجموعی۔ آفتاب روشن۔ ہوئے۔

سورج کا تیسرا ہندی نام بھان ہے وہ عربی باحان از لوح مثل جابان از جوہ ہے باحان کے معنی آفتاب نور آمدہ۔ یا فقط باحاً ہے یا بان۔ از بن۔ معنی سب کے آفتاب ہیں۔ سور یہ شعر یہ ہے یا سورج کا تبدل کیونکہ ج می سے بدلتا ہے۔

سورج فاعل سرچ کا ہے جس سے سراج بنا ہے سورج کے معنی اسپ سفید رنگ و سُرج یعنی زہین کسا ہوا و روشن کنندہ

سن سورج کا انگریزی نام ہے عربی سن بمعنی جرم بلند و سخت روشن و تابان
شید سورج کا نام زبانِ ثندیس ہے یہ عربی مادہ شود سے بنا ہے جیسے حیل بالفتح حوٰل سے معنی شید آفتاب۔

سورج کا عربی محو از حرّ آفتاب بسیار گرم
سور تیسرا فارسی نام سورج کا۔ خور ستارہ سخت روشن یا اور آفتاب آتش رنگ یا خور از حرّ آفتاب۔

خور چوتھا فارسی نام سورج کا۔ عربی غور آفتاب نیمروز یا قریب افق نمودار سے
در خور از کوہ یکروز سر بر زرد

آفتاب۔ عربی میں آب طاب ہے آب از اب بمعنی نیمروز طاب از طب بمعنی سورج لینے
مہر نیمروز۔

شمس عربی بمعنی آفتاب و اسپ سپید تیز و دمار
سورج کے جس قدر نام دُنیا بھر کی زبانوں میں آئے ہیں ان میں سے اکثر میں معنی گھوڑے

اور سانپ وغیرہ کے آئے ہیں اسی سبب سے ایرانی اور ہندو عقائد میں سورج کے ساتھ گھوڑا اور سانپ معبود قرار پائے۔ مگر یہاں بخوف طوالت زیادہ تشریح کو ملتوی کیا گیا کچھ بھی دوتاؤ کے حالات میں لکھیں گے۔

سوم یا چاند

سوم عربی میں سُوم از سَم ہے معنی ستارہ سخت روشن باشعاع
سُوس دوسرا نام چاند کا ہے عربی سَسَخ بمعنی ماہ اندک یا مَحْصُص مثلاً از حَصّ۔ سیم رنگ
مون۔ انگریزی مخفف مَوہ یا مونہون بوزن حمدون کا ہے بمعنی جرم نیکو تابان و درخشان
چاند عربی سَعْنَد از سعد ہے معنی ستارہ سخت روشن میمون س سچ متبادل
قمر عربی ہے معنی ستارہ پسید باندک تیرگی۔

ماہ فارسی از مَوہ بمعنی ستارہ نیکو تابان و درخشان۔ سیم رنگ۔ اہل جوتش چاند کا رنگ
سفید مانتے ہیں اور سورج کا سنہرا کیونکہ سریتہ جس کو سنسکرت میں سور یہ کہتے ہیں بمعنی آتشیں ہے۔
منگل

عربی مُنْکَل از نکل ہے خواہ رَحَب کے وزن پر فاعل سمجھو۔ خواہ ظرف معنی آتش دار سُرخ
عقوبت و عذاب رساں۔ چنانچہ رنگت سُرخ ہے اور منحوس سمجھا جاتا ہے۔
سُرخ از سُخ عربی بمعنی سُرخ رنگ ستارہ۔ یا اصلاً سُرخیش از ارش ہے مثل مسکین از سکن۔
ش۔ خ متبادل۔ معنی سُرخیش آتش رنگ و تابان سخت
مَارَس یونانی عربی مَارَش از ارش مذکورہ۔ مثل مُنْکَل ہے
یُونوز انگریزی عربی طَیْنُوس از طوس بمعنی ستارہ روشن سُرخ مایل۔ ساخت بوزن فینْعُول۔
بدھ

عربی میں وَضَح ہے۔ معنی ستارہ روشن قدرے مائل بسیاہی۔ اہل جوتش اس کا رنگ نیلا
مانتے ہیں قوم نوح کا بت وَدّ یہی وَضَح ہے ض کی قروت د کے قریب ہے۔
عربی نام عَطَارِ د ہے مگر یہ مرکب ہے اصلاً عَطَارِ د ہے عَوّ از عوی ستارہ طار بمعنی سیارہ
روشن یعنی کوکب سیارہ طار میں معنی سیاہی مایل بھی ہیں۔

مرکری یونانی نام اصلاً شری ہے مگر اس کو یونانی میں لکھیں تو مرکری بھی پڑھا جاسکتا ہے۔
 بمعنی روز چار شنبہ یعنی بدھ شری ستارہ روشن یعنی بدھ کے دن سے منسوب ستارہ۔
 وڈن انگریزی وضحا ہے معنی ستارہ روشن اودن جرمنی اوضحا عربی ہے معنی ستارہ بسیار روشن
 برسپت یا برسپتی

عربی میں برص فتیح ہے براص دُخْشانی و تابانی ستارہ مائل برزدی۔ فتیح از فتح مالک و قابض۔
 اسکو زرد رنگ بتایا جاتا ہے عربی مشتری از شری ستارہ بسیار روشن
 انگریزی تھر جو تھر س ڈے میں آتا ہے عربی طر بمعنی ستارہ روشن بتیزی اُس نشان یا شناخت اضا
 کے لئے آتا ہے۔

شکر

عربی شُقر بوزن سُخر کہ پرندہ ایست بمعنی ستارہ بسیار روشن مثل آتش
 زہرہ عربی بمعنی ستارہ روشن۔

فراے انگریزی عربی فراع ستارہ بلند و گرم و روشن

نیچر یا نیچر

نیچر عربی میں نیچ شری ہے نیچ از سنج بمعنی روشن مائل سیاہی اسی سے ہندی سنج و سانج بمعنی شام بنا
 شری ستارہ روشن مثل شرار آتش و بد نیچ کی ج جی سے اورش ج سے بدل کر سنی پڑ ہو گیا۔
 بعض لوگ جو نیچر بولتے ہیں وہ نیچش شری ہے سنج بمعنی روشنی سیاہی مائل۔ ش برائے اضافت
 ج جی سے ش ج سے بدل کر سن لیش پڑ بن لیتے ہیں بدی کی وجہ سے منحوس سمجھا جاتا ہے شین اضافت
 کا عربی قاعدہ پہلے مضامین میں آچکا ہے۔

کیوان فارسی نام ہے عربی کاوان کا مالہ کیوان مادہ کو۔ سے ہے معنی ستارہ خرد و روشن مثل روز خرد۔
 اس کی رنگت سیاہی مائل مشہور ہے۔ نیچر کو ہندی میں تھاہ بھی کہتے ہیں جس کے سبب سے نیچر والے دن
 کو تھادر یعنی تھاہ دار بولا جاتا ہے دار بمعنی دن جو عربی میں وہر بمعنی روز و روشن ہے۔ تھاہ عربی طاس از طوس
 بمعنی ستارہ روشن سیاہی مائل کا مبدل و مخرب ہے۔

سیٹر انگریزی عربی سَطْعَر از سطح مثل سَعْبَر از سَعْب۔ معنی سعب آب بسیار۔ سَعْبَر پاہ بسیار آب

سطح بمعنی تارٹ بلند و روشن و خرد و تبارکی آمیز

اس کے بعد بروج فلکی کے سنسکرت نام حل کئے گئے جو حسب ذیل ہیں
عربی اور سنسکرت کے بالمقابل و مشابہ ناموں کے معانی میں تھوڑا تھوڑا فرق اس لئے ہوا
کہ ہر عربی لفظ کے اندر جو خواہ ایک ہی چیز کے کئی ناموں میں سے ایک ہو ایک جدا خصوصیت موجود
ہے اور سنسکرت میں خصوصیتوں کی پرواہ نہیں ہے۔ ہر لفظ عام معنی میں بولا جاتا ہے جیسا سب
عجمی زبانوں کا دستور ہے۔

عربی نام	معنی سنسکرت لفظ کے	سنسکرت لفظ	عربی لفظ	معنی عربی لفظ کے
صل	بینڈھا	سیکھ	میش	بُز
ثور	بیل	برکھ	ورک	ش کھ تبادل
جوزا	جوڑا	میٹھن	مِطوہ	ستور سواری
سرطان	کیکڑا	کرک	قرص	مرے کہ دست خود اگر نثار بادشاہ منیش وارڈ
اسد	شیر	سنگھ	صنق	جانور آبی گیرندہ مثل مقراض باد و خارجیدہ
سنبلہ	راکی	کَنیا	کَنیہ	شیر توی و بدلوتی کھ تبادل
میزان	ترازو	تلا	طلّاع	دختر و دشیدہ ستور از مرد
عقرب	پچھو	برچھک	فرّضخ	نبرد ہندو اندازہ و مقدار بوزن غلام
قوس	کمان	دھن	دھنق	کمان نم زہ سنسکرت دھن۔ دھنک کا مخوف ہے

جود تہت سے مشابہ ہے۔

جدی	دول	بکری	دول یا کھڑیا	بکرہ	نکبہ	مغز	قلم	سب سے ڈول کا کام لیا جائے۔	سب سے ڈول کا کام لیا جائے۔
حوت	پھلی	مین	مین	مین	مین	مین	مین	حاور ساکن آب دران نفع بخش	حاور ساکن آب دران نفع بخش

ملہ عربی میں جدی اسمی کا نام ہے جسکو ہندی میں بکرہ کہتے ہیں بکرہ جدی عربی میں بزرگوار کہتے ہیں اور ہندی جلیدیوں میں بکرہ کی تصویر مگر بکھ کے مانند
ہے اس صورت میں عربی بمعنی جانور آبی درندہ مثل شیر و جانورندہ وہی مگر بکھ ہے۔ آسمان کو بارہ حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصہ میں چند تاروں کے
ایک جھرمٹ کو کہ جسکا ہم صورت دوسری جگہ نظر آئے انتخاب کر لیا۔ اور اسی جھرمٹ کے سبب تاروں میں خطوط قائم ہوئے فرض کرنے
سے جس چیز یا جانور کی شکل بنی ہی اس بکرہ کا نام رکھ دیا۔ بکرہ کے معنی حصہ کے ہیں۔ اب جھرمٹ کے تاروں میں سے کچھ چھوڑ دیئے اور جھرمٹ میں
چند متصل تار سے لائن کے بعد تصویر بنائے میں فرق ہو جائیگا اسی وجہ سے عربی بکرہ کی بجائے اور ہندیوں نے مگر بکھ بنا دیا۔
(باقی آئندہ)

فن تنقید

تنقید اس قدر وسیع موضوع ہے کہ اُس پر کافی بحث کرنے کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ افسوس ہے کہ ہماری زبان میں اس وقت تک کوئی ایسی کتاب بھی موجود نہیں جو اس ضروری علمی شعبہ کے مبادیات ہی پر روشنی ڈال سکے۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ شبلی و حالی کے قدموں کی برکت سے اب قدیم تذکرہ نویسی و تقریظ گوئی کے تنگ دائرہ سے باہر نکل کر کچھ لوگوں نے علمی پیرایہ میں اس قسم کے مضامین لکھنے شروع کر دیئے ہیں جن میں کسی شاعر کے کلام یا کسی مصنف کی تحریر کا صحیح موازنہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ورنہ آج سے دس بیس برس پہلے تو علمی محاکمہ کے صرف یہ معنی سمجھے جاتے تھے کہ یا تو سبائبہ امیرِ تعریف کا طومار جمع کر دیا جائے۔ اور یا غلطیوں اور نقایص کا ایک انبار تیار کیا جائے جس کے نیچے کسی صاحبِ کمال کا جوہر اصلی دَب کر خاک میں مل جائے، اس قسم کی تنقید کی اس سے زیادہ کوئی وقعت نہیں کہ وہ نقاد کی ذاتی رائے کا اظہار ہے۔ اور اگر وہ خود اربابِ بصیرت و ذوق میں سے ہے تو بسا اوقات اُس کی رائے دوسروں کی راہنمائی کا باعث ہو سکتی ہے، تاہم چونکہ ذاتی تعصبات سے کوئی خالی نہیں۔ اس لئے تنقید کا یہ اسلوب اکثر حقیقت سے گمراہ کرنے کا بھی ذریعہ بن جاتا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد کے جو احسانات اردو زبان و ادب پر ہیں۔ اُن سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اپنے زندہ جاوید تذکرہٴ آبجیات میں کہیں کہیں ذاتیات کی بناء پر فنِ تنقید کی دیانت کو کافی طور پر ملحوظ نہیں رکھا، علاوہ بریں اگرچہ اُن کے حاد و نگار قلم نے یا درفتگان کو ایک زندہ محفل بنا دیا ہے۔ مگر جہاں تک اردو شاعری کے ارتقاء ذاتی کا سوال ہے۔ اُن کا تذکرہ مثل سابقہ تذکروں کے اُس ارتقاء کے مختلف مدارج کو اُلف اور اُن کو اُلف کے مادی و روحانی اسباب بیان کرنے سے قاصر رہا ہے، شبلی و حالی کی نقادانہ تحریریں اس بارہ میں زیادہ قابلِ قدر ہیں۔ اور جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ ان بزرگوں کو مغربی علوم سے صرف دُور کی آشنائی تھی۔ تو اُن کے موازناتِ علمی کی قدر ہماری نگاہ میں اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے، شعر العجم۔ موازنہ امیس و دبیر۔ حیاتِ سعدی اور دیباچہٴ دیوانِ حالی۔ بلاشبہ

ایسی تصانیف ہیں کہ جن پر کسی زبان کو ناز ہو سکتا ہے۔ اور جو تنقید علمی کے شاندار نمونے تصور کی جاسکتی ہیں۔

اس تہذیب کے بعد میرے مختصر مضمون میں صرف اتنی گنجائش ہے کہ فن تنقید کی ترقی کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کر دیا جائے۔ جس سے ضمناً اُس کے بعض بنیادی اصول بھی معرض بحث میں آجائیں۔

تنقید فطرت انسانی کے اُن اختراعات کو جانچنے کا پیرایہ ہے جو ادب اور فنون لطیفہ کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ چونکہ اس وقت موضوع کو محدود کرنا مقصود ہے۔ اس لئے سطور ذیل میں صرف ادبی یا علمی تنقید کے تذکرہ پر اکتفاء کیا جائے گا۔ فنون لطیفہ کی تنقید بجائے خود ایک مستقل تحریر کی محتاج ہے۔ اور اُس کو موجودہ مضمون میں شامل کرنے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

اس وقت جملہ علوم و فنون جو مغربی دنیا میں رائج ہیں۔ اُن میں سے سب نہیں تو اکثر یونان قدیم کے مہوں منت ہیں۔ فن تنقید کی بنا ڈالنے کا بھی فخر یونانیوں ہی کو حاصل ہے۔ افلاطون کی جامع طبیعت نے اول اس فن کے اصول بیان کرنے کی طرف توجہ کی۔ لیکن افلاطون پر حکیم سقراط کی اخلاقی تعلیم کا رنگ غالب تھا۔ اس لئے اُس نے ادبی خوبصورتی کا معیار حسن معنی کو قرار دیا۔ اور علم ادب کی صورتی خوبوں کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ یہ ظاہر ہے کہ علم ادب کی دو انواع ہیں۔ ایک وہ جو واقعات کے بیان پر اکتفا کرتی ہے اور دوسری وہ جو تخیلات اور تصورات پر منحصر ہے، قسم اول کی تنقید کے لئے ایسے نقاد کی ضرورت ہے کہ جو واقعات پر حاوی ہو۔ لیکن دوسری قسم کو جانچنے کے لئے شاعرانہ تخیل درکار ہے۔

علم ادب کی اس تقسیم سے یہ بھی واضح ہے کہ مختصرات ادبی میں سے ہر ایک کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ نفس مضمون اور اسلوب۔ قسم اول۔ نفس مضمون سے زیادہ علاقہ رکھتی ہے لیکن قسم دوم میں اسلوب اگر نفس مضمون سے زیادہ وقیع نہیں تو اُس کا ہم پلہ ضرور ہوتا ہے۔ ان دونوں کے علاوہ ایک تیسرا پہلو بھی ہے جسے ہم اثر یا جذب کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں یعنی وہ صفت کہ جو محسوسات و تخیل کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے۔ اخلاق کو مذکورہ صورت

سے بحث ہے۔ نہ لطفِ تخیل سے + وہ تو ان صفات کا مجموعہ ہے۔ جو کائنات کے حقائق پر مبنی ہیں۔ اور جن کا مدارِ واقعات پر ہے + اس لئے یہ بات سمجھنی دشوار نہیں کہ حکیم افلاطون علم ادب میں واقفیت اور حقیقت پر کیوں مُصر تھا۔ اور سوز و گداز کی وقعت اُس کی نگاہ میں کس لئے کم تھی + مثال کے طور پر کوئی شعر لے لیجئے۔ نفسِ مضمون کے لحاظ سے وہ خواہ کتنے اعلیٰ پایہ کا کیوں نہ ہو۔ اگر بندش (یعنی اُسلوب) سست ہے۔ تو کمال کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا + اور اگر دونوں باتیں موجود ہیں تو بھی ممکن ہے کہ اثر سے خالی ہو۔ اور حسنِ کلام کے انتہائی مقام کو نہ پہنچ سکے + لیکن افلاطون کے خیال میں اگر اُس کا مضمون حقیقت کے قریب ہے تو وہ اعلیٰ پایہ کا شعر ہے + شاید یہ کنا اُس پر قسمت نہ ہو گا کہ اُس کی رائے کے مطابق پسند نامہ سعدی دیوانِ حافظ سے بہتر ادبی نمونہ ہے + لیکن یہ ایسی رائے ہے کہ جس سے بہت کم لوگوں کو اتفاق ہو گا +

افلاطون کے شاگرد ارسطو نے اپنے استاد کی اس کوتاہی کی تلافی کی کشش کی۔ اور اپنی شہرہ آفاق تصنیف ”پوٹیکس“ میں اُس نے اس بحث پر طبع آزمائی کرتے ہوئے یہ اعتراف کیا۔ کہ علم ادب کے لئے اُسلوب اور نفسِ مضمون دونوں یکساں طور پر لازمی ہیں۔ اور مضمون خواہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو اگر طرزِ بیان دلکش نہیں تو اکتسابِ حسن سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا + علاوہ ازیں ارسطو نے سوز و گداز کو بھی کلام کا جو ہر قرار دیا۔ اور قلبِ انسانی پر جو کیفیت درونِ ناگ مضامین سے طاری ہوتی ہے۔ اُس کے واضح کرنے میں بہت سارے قلم دکھایا + تاہم ارسطو نے بھی ادبیات کے اجزائے متخیلہ کی ترکیب کو کا حقہ نہیں سمجھا اور اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اُس کے زمانہ میں علمِ النفس کا مطالعہ اس قدر صحیح اور وسیع نہ تھا کہ تخیل اور اُس کے کرشموں کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کر سکے +

زمانہ حال میں فنِ تنقید کو جو فوقیت حاصل ہے وہ تمام و کمال علمِ النفس کی تحقیق کا نتیجہ ہے + اس کا منشاء اُس کیفیت کو واضح کرنے ہے جو بصورتِ کلام سے سامع کے دل پر وارد ہوتی ہے اور اُن اسباب کا یقین ہے کہ جو اس کیفیت کو پیدا کرتے ہیں + یا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے۔ کہ عصرِ حاضرہ کی تنقید کو زیادہ تر ادب کے اُس تیسرے پہلو سے تعلق ہے کہ جسے

میں نے سطور بالا میں اثر یا جذب کے نام سے ذکر کیا تھا۔ نقاد کا یہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ وہ کسی شاعر یا مصنف کے کلام کو اس نظر سے دیکھے کہ تخیل کو حرکت میں لانے کی اُس کو کہاں تک قدرت حاصل ہے۔ اور اُس کے تصورات بہائے کون سے جذبات و محسوسات میں متوجہ پیدا کرتے ہیں۔ مضمون بجائے خود بلند ہو یا پست۔ انوکھا یا عامیانا۔ اُسلوب فصیح ہو یا غیر فصیح۔ مشکل ہو یا آسان۔ لیکن اگر کلام میں یہ قوت ہے کہ ہمارے دماغ کو تصورات کا آماجگاہ بنا سکے۔ تودہ قابلِ قدر ہے۔ ورنہ نہیں، یہ تو ضرور ہے کہ کمال تک پہنچنے کے لئے تینوں صفات کا مجموعہ لازمی ہے۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ کوئی تعصیف نفس مضمون اور اُسلوب دونوں کے لحاظ سے پسندیدہ ہو۔ لیکن اگر اُس میں یہ تیسری صفت منقود ہے تو اُس کو اس زمانہ میں وہ شہرت حاصل نہیں ہو سکتی جو خالی اثر یا جذب کی موجودگی سے نصیب ہو سکتی ہے۔ اس وقت بہت سے ایسے مصنف ہیں کہ جن کی شہرت صرف اس وجہ سے ہے کہ اُن کی تحریر پڑھنے والوں کے دل و دماغ پر ایک کیفیت طاری کر سکتی ہے۔ ورنہ اُن کے مضامین اکثر درجہ ثقات سے گرے ہوئے یا پیش پا افتادہ ہوتے ہیں۔ اور اُن کا اُسلوب بھی ان محاسن سے عاری ہوتا ہے۔ جو اکثر زمانوں اور ملکوں میں تحریر کی زینت سمجھے جاتے ہیں، غرضیکہ افلاطون اگر ایک حد کو پہنچا ہوا تھا تو اس زمانہ کے منہ شناس دوسری حد کی انتہا کو پہنچ گئے ہیں۔ وہ علم ادب کی خوبی کو صرف اُن صفات پر محدود کرتا تھا۔ جو کائنات کے حقائق و معارف سے علاقہ رکھتی ہیں۔ اور جو تمام عالم کے انسانوں میں مشترک ہیں۔ خلاف ازیں یہ لوگ اُس خوبی کو اُن صفات پر منحصر رکھتے ہیں۔ کہ جو مختلف آدمیوں پر مختلف کیفیت پیدا کرتی ہیں۔ اور جن کا معیار قائم کرنا بالکل ناممکن ہے۔ اسکا ایک نتیجہ تو یہ ہوا ہے کہ علم ادب میں جدت پسندی اور خیال آفرینی کی طرف میلان زیادہ ہو گیا ہے لیکن دوسرا نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ ہر ایک مصنف خود کو مطلق العنان تصور کرنے لگا ہے۔ اور کسی قاعدہ یا اصول کی پابندی کو خواہ وہ صرفی یا نحوی قاعدہ ہی کیوں نہ ہو اگر باعثِ عار نہیں تو کم از کم ایک قسم کی ناگوار قید ضرور سمجھا جاتا ہے۔ تاہم اس رجحان خیال کا تنقید پر یہ مفید اثر پڑا ہے کہ اب نقاد نکتہ چیں بننا مذموم شعار خیال کرتے ہیں۔ اور ہر ایک ادبی اختراع کو نظر و وقت سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نقاد کا فرض یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ادیب یا شاعر کے مفہوم تک اُس کے نقش قدم پر چل کر رسائی حاصل کرے۔ اگر وہ ادیب یا شاعر کسی غیر ملک یا دوسرے

نبائیوں

۲۰

بابت ماہ مارچ ۱۹۲۲ء

زمانہ کہے۔ تو نقاد کو چاہیے کہ ہر ایک شے کو اُس کے نقطہ نگاہ سے دیکھنا سیکھے۔ اور اُس کے کلام کا اندازہ لگانے سے پیشتر اُن حالات و کوائف سے آگاہ ہونے کی کوشش کرے کہ جو اُس زمانہ و ملک کے ساتھ مختص ہیں، بغرضیکہ اب نقاد کی حیثیت ایک جج یا مجسٹریٹ کی سی نہیں کہ جس کے سامنے بے چارہ مصنف مجرمانہ حیثیت میں اپنی کوتاہیوں کی جواب دہی کے لئے حاضر ہوتا ہے۔ بلکہ ایک طالب یا عقیدت مند کی حیثیت ہے جو مصنف سے فیض و استفادہ کا خواستگار ہوتا ہے۔ اور اُس کے ارشاد و راہنمائی سے اپنا مقصود حاصل کرنا چاہتا ہے۔

محمد سعید

”ز-خ-ش“ = (زادہ خانوار مشرد اللہ)

وہ عندیلب خوش الحان جس کے عرفان پاش تھے اُس کی نفس کی تیلیوں سے کل کل کے ایک عالم کو سحر کر رہے تھے، یکایک خاموش ہو گئی۔ نئے فضا میں تلاطم ہیں، مگر عندیلب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ساکت،

وہ حقیقت طائر شیریں گواز سرآمدہ دولت کے پیچھے سے (جہاں سے بے معنی خندہ اور فضل کلام کے سوا کچھ کم سنائی دیتا ہے) اُسنا ہی تھی کہ صدق و صفا، علم و عرفان، سوز و اتہاب، درد و گداز کیا ہیں۔

اور صدق و صفا، علم و عرفان، درد و گداز سوا گو این کہ انکی مشاغل، نکوداد ویز آریشیں میں اب پیش نہ کر گئی۔

وہ ایک عندیلب تھی جو نفس میں پیدا ہوئی نفس میں جی، اور اُس نے نفس ہی پر تم توڑا۔ اُس چند رنگوں آسمان کے سوا ہوا کے معنی خانہ پر رہا، اُس نے فطرت کی زیبائش، آخریدہ دست انسان کی آرائش نہ دیکھی، آفتاب جو دنیا کو زندہ گی اور حرارت بخشتا ہے، تیلیوں سے پلٹے ہوئے کپڑے سے گزر نہ سکا۔ لیکن خود اُس کے قلب منور نے ایک شمع روشن کی جس نے اُسے باہر کے نور سے بے نیاز کر دیا۔ شمع تخیل!

وہ اپنی مختصر مگر متجلی زندگی میں اپنے تئیں خاک نشیں ز-خ-ش کہا کی آج حقیقتاً وہ خاک نشینی کی آرزو مند اُسودہ خاک ہے۔

”دخوش درخشید گر شعله مستعجل بود“

(یلدرم)

لحم خنزیر

ہندو شاستروں میں بھی جنگلی اور پروردہ سور کے گوشت کے متعلق ذکر ہے۔ عام خیال ہے کہ سور کا گوشت یعنی لحم خنزیر جو یہودیوں اور مسلمانوں میں حرام ہے ہندوؤں کے ہاں جائز ہے۔ اور اسی خیال پر عمل ہے۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ہندوؤں میں استعمال شاید ضد سے یا کسی اور وجہ سے شروع ہو گیا ہو گا ورنہ اگر شاستروں کو دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ ہندو شاستروں کی رو سے یہ گوشت حلال نہ تھا۔ اس کا ذکر ہم آئندہ کریں گے۔

ہم نے دو چار مسلمان بھائیوں سے دریافت کیا کہ اس خاص جانور کے گوشت سے منع کرنا کن وجوہات پر مبنی ہے؟ کسی نے کوئی کسی نے کوئی وجہ بیان کی لیکن ہم قائل نہ ہوئے آخر ایک وجہ ہمارے خیال میں آئی جو ہم یہ ناظرین کرتے ہیں۔

ہندوؤں کے ہاں مجھے کچھ اور درہاوت مار گذرے ہیں یعنی بیان کیا گیا ہے کہ دشنوجی رجو خدا کا نام ہے، ان تینوں شکلوں میں اس کرہ ارض پر نمودار ہوئے ہیں۔ یعنی مچھلی کچھوے اور سور کی شکلوں میں۔ بعض لوگ ان باتوں کو لفظی طور پر صحیح مانتے ہیں بعض اہل علم اس بیان کو استعارہ سمجھتے ہیں یعنی یہ کہ ازمنہ طبقات الارض کے درجے ہیں۔ سور کی پیدائش سے گویا *Samudra Manu* (بچہ دینے والی) مخلوق ظہور میں آئی ہے۔ خیر اس سے تو بحث نہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ سور کا اوتا ہندوؤں میں ہو چکا ہے۔ سور کی شکل کے بت اس وقت جنوبی ہند کے مندروں میں موجود ہیں اور ان کی پرستش ہوتی ہے۔ یہ خیال صحیح سمجھنا چاہیے کہ تجربہ۔ کراہت۔ عظمت یا عزت وغیرہ کے خیالات نے اہل مذہب کو حلال و حرام کے قرار دینے میں ضرور امداد دی ہوگی۔ گائے کا گوشت بوجہ عظمت کے منع ہے۔ بعض جانور مثلاً مردار خور۔ شکار خور اور کراہت کی وجہ سے منع ہوئے ہونگے۔ اور بعض دوسرے مفرصحت ہونے کی وجہ سے منع ہونگے۔ چنانچہ شاستروں میں مچھلی اور کچھوے بھی جائز نہیں لیکن عمل اس امتناعی حکم پر نہیں رہا۔ علیٰ ہذا ہمارا خیال ہے کہ سور کا گوشت بھی اس وجہ سے منع ہو گا کہ اس شکل کو دشنوجی نے اوتا ہونے کے لئے اختیار کیا تھا۔

در نہ ہماری عقل میں ایسا مقوی گوشت حضرت انسان کے دست برد سے کیسے بچ سکتا تھا؟ ایک کتاب موسوم بائبل ان انڈیا میری نظر سے گذری۔ یہ کتاب ایک فرانسیسی لوس جو کولیٹ نے لکھی تھی جو ایک انگریز نے ۱۸۶۹ء میں ترجمہ کی اور طبع ثانی پانی پریس الہ آباد سے ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئی۔ یہ مصنف ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بعض مقامات نہایت کامیابی کے ساتھ ثابت کرتا ہے کہ موسوی قانون ہندو قانون کی نقل ہے۔ ہمیں بعض مقابلہ کے حوالہ جات پڑھ کر تعجب ہوا۔ اور اگر وہ حوالجات صحیح ہیں تو کہیں کہیں تو بالکل نقل معلوم ہوتے ہیں اس مضمون میں اور باتوں کے ذکر کی گنجائش نہیں اتنا لکھنا کافی ہے کہ مصنف نے قوانین موسوی اور ہندو شاستروں کا مقابلہ کیا ہے۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حلال و حرام کے متعلق دونوں قانون ایسے مشابہ ہیں کہ ان میں گویا خاندانی تعلق معلوم ہوتا ہے شتاق تحقیقات اس کتاب کو خود پڑھ سکتا ہے۔ ہم یہاں ذیل کی عبارت نقل کرتے ہیں (صفحہ ۱۵۶) ”منو (Manu) اور دیگر برہمنی کتابوں میں ذکر ہے کہ اعلیٰ ذاتوں کو ان چار پایوں کا گوشت نہ کھانا چاہیے جن کے کھر منقسم نہ ہوں اس حکم کا ایک استثنیٰ سور ہے گو اس کے کھر پٹے ہوئے ہیں یعنی ایک کھر نہیں۔ یہ ممانعت پروردہ سور کے متعلق ہے نہ جنگلی سور کے یعنی سور کا گوشت حرام ہے“

سانکھ سنتھا صفحہ ۶۴۷

ایک سال کی تعزیری پر اس شخص کے لئے ہے جس نے پیاز لسن۔ کھمبہ۔ اونٹ۔ ہاتھی۔ چھپکلی۔ پروردہ سور۔ یا مرغ کا گوشت کھا لیا ہو۔ (نوٹ) اس حکم کی تعمیل کشمیری اور بعض برہمنوں اور دیگر اہل ہندو میں اس وقت تک جاری ہے۔ چنانچہ میری قوم کے لوگ مرغ لسن پیاز سے احتراز کرتے ہیں سور کا گوشت ان کے گھروں میں نہیں پکتا گو اس کو ممنوع تصور نہیں کیا جاتا۔

دششت سنتھا صفحہ ۷۹ میں ذکر ہے کہ پوراؤں میں جنگلی سور کے گوشت کے استعمال کے بارہ میں یعنی حلال یا حرام قرار دینے میں اختلاف رائے ہے :- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پروردہ سور تو مستماً حرام تھا بعض نے جنگلی سور کو بھی حرام قرار دیا

گوتم سنتھما صفحہ ۶۹۸

”گائے بیل اور سور کا گوشت ہرگز نہ کھانا چاہئے“

یہاں پر درودہ اور جنگلی سور کی تمیز نہیں کی گئی۔ تعجب معلوم ہوتا ہے کہ جہاں گائے اور بیل کے گوشت کی ممانعت کی گئی ہے ان کے ساتھ ہی سور کا گوشت بھی منع ہوا ہے۔ گویا امتناعی تاکید ایک ہی درجہ کی ہے۔

کیا یہ ممکن نہیں کہ ہندوؤں کے شارعان نے سور کا گوشت منع کرنے میں کوئی معقول وجہ دیکھی ہو۔ جو اس وقت دریافت نہیں ہو سکتی۔ اور اگر یہ تحقیقات صحیح ہے کہ ہندوستان کی تہذیب مصر اور شام تک پہنچی تھی تو کیا تعجب ہے کہ حضرت موسیٰ نے ایک مذہب قوم کے ممنوعات کو صحیح بنیاد پر مبنی سمجھ کر اُس کے مطابق حکم دیا ہو۔ اگر مختلف ممالک درودہ اور سور کا گوشت منع کرنے والے راقم سطور کا واسطہ اس مضمون سے محض تاریخی تحقیقات تک ہے ورنہ جس شخص نے ہر قسم کا گوشت برسوں سے ترک کر دیا ہو اُس کے لئے ہر قسم کا گوشت حرام ہے۔

میری درخواست ہے کہ ناظرین میں سے کوئی صاحب اس سوال پر اور روشنی ڈالیں میں ہندوؤں کو خطاب کر کے کہتا ہوں کہ اگر وہ سور کا گوشت کھاتے ہیں تو وہ اپنے شاستروں کے مطابق نہیں کرتے اُن کو اختیار ہے۔ درحقیقت اگر ساری دنیا ہر قسم کے گوشت کا استعمال ترک کر دے تو یہ تجربہ کسی نوع سے غیر مفید نہ ہوگا۔ مگر ذائقہ کی عادتیں جلدی نہیں بدلتیں۔

شیم

شکریہ

ہم اپنے صاحبِ موقلم میاں عنایت اللہ صاحب ہیڈ ماسٹر انڈسٹریل اسکول قصور کا دلی شکر یاد کرتے ہیں جنہوں نے خاص ہمایوں کیلئے یہ رنگین تصویر کھینچی ہے۔ امید ہے وہ آئندہ بھی اپنے رشتہ اقلم سے ہمایوں کی زیب و زینت کا سامان فراہم کرتے رہیں گے۔

(ج)

عورت
اور
مختلف مذاہب
گذشتہ سے ہوستہ

اسلام | یہی وہ دنیا کا تہذیب ہے، جس نے سب سے پہلے عورتوں کی حمایت میں آواز بلند کی، اور دُفعتہً ان تمام مظالم کا خاتمہ کر دیا، جو ابتدائے تمدن سے اُن پر ہو رہے تھے، اسلام کی سب سے زیادہ اہم اور شاندار تعلیم مساوات اور آزادی ہے، اسکے نزدیک مرد، عورت، امیر، غریب، جاہل، عالم، سب برابر ہیں، اس بنا پر مرد و عورت کی تفریق کو جو آغاز تمدن سے ہر مذہب میں چلی آتی تھی، اسلام نے بالکل مٹا دیا، اور سب سے پہلے دونوں کے فطری تعلق کا ان الفاظ میں اعلان کیا،

وَخَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا

لَتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلْ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً

تا کہ تم ان کے پاس آرام پاؤ اور تم دونوں میں محبت اور پیاری کیا

اس سے صاف طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام نے عورتوں کی تخلیق کا کیا مقصد قرار دیا،

تم ادھر پر پڑھ آئے ہو، کہ دنیا کے اکثر مذاہب نے عورت کو صرف اسی نگاہ سے دیکھا ہے کہ وہ مرد کی

غلام ہے، اس کو انسانی تہذیب و معاشرت سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے، وہ مردوں کے

احترام و محبت کی بالکل مستحق نہیں ہے، لیکن اسلام کے نزدیک وہ معاشرتِ انسانی کی جزوِ اعظم ہے،

پولوس مقدس کے نزدیک عورت مرد کے لئے پیدا کی گئی ہے، نہ کہ مرد عورت کے لئے، لیکن

اسلام کی لنگاہوں میں دونوں ایک دوسرے کے محتاج الیہ ہیں، دونوں کی حیثیت اور حقوق برابر درجہ

کے ہیں،

هُنَّ لِيَّاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِيَّاسٌ لَهُنَّ

عورتوں پر مردوں کے جو حقوق ہیں، اسی قسم کے حقوق انکے مردوں پر ہیں۔

روزانہ معاشرت میں عورتوں کے ساتھ جس محبت اور یگانگت سے پیش آنا چاہیے، اس کی

تلعین اسلام نے ان مختصر الفاظ میں کی ہے،

وَعَاشِرُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ

اور عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو،

اوپر تم پڑھ آئے ہو، کر عیسائیت اور یہودیت کے نزدیک عورت کی کیا ہستی ہے، اب اس کے

مقابلہ میں قرآن مجید کے ان شاندار الفاظ پر غور کرو،

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي خَلَقَكُمْ

لوگو! اپنے خدا سے ڈرو جس نے تمکو نفسِ احد سے پیدا کیا،

مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا وَذَوْجَهَا

اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا، اور ان سے بہت سے

وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا

مرد اور عورتیں پیدا کیں، اس خدا کی جس کی وجہ سے تم

اللَّهُ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالرَّحْمَٰنَ إِنَّ اللَّهَ

ایک دوسرے سے مطالبہ کرتے ہو، اور جسوں یعنی عورتوں کی

كَانَ عَلَيْكُمْ سِرًّا،

عزت کرو، بے شک خدا تمہارا محافظ ہے،

ان الفاظ سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے، کہ اسلام کے نزدیک مرد اور عورت بالکل برابر ہیں،

اور ایک دوسرے کے احترام و محبت کی مستحق ہیں،

اولاد کشی کی ظالمانہ رسم کو اسلام نے ان الفاظ میں مٹایا،

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ

اور اپنی اولاد کو قتل مت کرو،

عرب میں اسلام سے قبل لڑکیوں کو عموماً زندہ کاڑ دیا کرتے تھے، اس شرناک رسم کو اسلام نے

یہ کہہ کر مٹایا، اور اس طرح مٹایا کہ آج تک پھر کوئی واقعہ نہ ہو سکا،

وَلِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ بِأَيِّ ذَنْبٍ

اور جب زندہ دفن کی ہوئی لڑکی سے قیامت میں ان کا گواہی دے کر پوچھا کہ

قُتِلَتْ

قتل کی گئی تھی،

عرب جاہلیت میں یہ عام دستور تھا، کہ جب کوئی شخص مر جاتا تھا، تو اس کے بھائی زبردستی اسکی

بیوہ سے عقد کر لیتے تھے، یا اس کو نکاح سے باز رکھتے تھے، اور جب اس سے کچھ حاصل کر لیتے تھے، تو

نکاح کی اجازت دیتے تھے، ان رسموں کا اسلام نے دفعۃً خاتمہ کر دیا، چنانچہ قرآن مجید میں ہے،

لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرْفُقُوا النِّسَاءَ كَمَا كُنْتُمْ لَا

تم کو یہ جائز نہیں کہ زبردستی عورتوں کو وراثت میں لے لو، اور

تَعْضُلُوهُنَّ لِيَتَذَكَّرَ مِنْكُمْ بَعْضُ مَا أُنذَرْتُمْ

ذکر نہ کرو کہ ان کو کچھ نہ کرنا کہ ان کو کچھ نہ کرنا کہ اس میں کچھ نہ

مہر عموماً لڑکی کے باپ کو ملتا تھا، جس کے عوض وہ گویا لڑکی کو فروخت کر دیتا تھا، اسلام نے اسکو

قطعاً ممنوع قرار دیا، اور یہ کہا،

وَأَنفُوا النِّسَاءَ مَعَكُمْ فَاتَّبِعْنِ فِئْتَكُمْ

اور دو عورتوں کو ان کے منہ خوشی سے،

رومن لاکے نزدیک عورتوں کو جاؤ مدد میں کوئی ذاتی حق حاصل نہیں تھا، بلکہ وہ جو کچھ پیدا

کرتی تھی شوہر کی ملکیت ہوتی تھی، اسلام نے اس جاہلانہ قانون کا ان الفاظ میں خاتمہ کر دیا،

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ

مرد جو کمائیں وہ ان کا ہے اور عورتیں جو کمائیں وہ

ان کا ہے،

مِمَّا كَسَبْنَ،

دیگر ممالک کی طرح عرب جاہلیت میں بھی عورت میراث سے محروم رہتی تھی، اسلام نے اس کے

مقابلہ میں یہ کہا،

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ

والدین اور اغرہ کی وراثت میں مردوں کا حصہ ہے، اور

وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ

اسی طرح والدین اور اغرہ کی وراثت میں عورتوں کا حصہ ہے،

اسلام کے نزدیک ہر شخص خواہ وہ مرد ہو یا عورت، صرف عمل صالح کی بنا پر نجات حاصل کر سکتا ہے،

چنانچہ قرآن مجید میں ہے،

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ

جو شخص خواہ وہ مرد ہو یا عورت عمل صالح کرتا ہے، اور

فَلْيُمْلَأْ كِفْلَهُ مِنْ حَبِيبَةٍ طَيِّبَةٍ وَكَيْفَرَ يَتِمُّمْ أَجْرَهُمْ

ایمان لاتا ہے، بے شبہ ہم اسکی زندگی کو خوشگوار بنائیں گے،

يَا حَسَنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ،

اور جو عمل صالح کیا ہے، اس کا اجر ہم بے شبہ دینگے،

دنیا میں کوئی مذہب قیامت تک اسلام کے اس فخر کا حریف نہیں ہو سکتا، کہ اس نے آقا اور

غلام کو ایک سطح پر لا کر کھڑا کر دیا، اور غلاموں کو تمدنی حیثیت سے وہی حقوق عطا کئے، جو اور لوگوں کو حاصل

تھے، چنانچہ قرآن مجید میں غلاموں کی شادی کے متعلق بالمتصریح احکام موجود ہیں،

وَأَمَّا مِنْكُمْ عَلَى الْبَنَاتِ الْمُصَلِّينَ مِنْ بَنَاتِكُمْ

اور شادی کرو ان لوگوں سے جو تمہاری اور ان مرد اور عورت

وَأَمَّا مِنْكُمْ أَنْ يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ

غلاموں سے جو تیک ہوں، اگر وہ غریب ہیں تو خدا اپنے فضل

وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ

سے انکو غنی کر دیگا، خدا بہت بڑا فیاض اور جاننے والا ہے،

بجلاف عیسائیت وغیرہ کے اسلام رہبانیت کا شدید ترین دشمن تھا، چنانچہ قرآن مجید

میں ہے،

وَمِنْهَا يَتِيَّةٌ ابْتَدَأَ عَوَهَا مَّا لَكُنَّهَا عَلَيْهِمُ الرِّقَابُ
 ابْنَعَاءُ بِرَ مَوَانِ اللّٰهُ فَمَا سَرَعُوْهُ هَاقُوْ
 دَعَائِيَّهَا

رہبانیت کو عیسائیوں نے خود ایجاد کر لیا ہے، ہم نے
 بجز رضانے الہی کی جستجو کے اور کسی چیز کا انکے لئے حکم نہیں
 دیا تھا، اور جیسا چاہیے تھا اس پر انہوں نے کھانا نہیں کیا
 غرض ان تمام آیات سے یہ صاف طور پر ثابت ہے، کہ اسلام نے ہر حیثیت سے مرد اور عورت
 کو یکساں حقوق عطا کئے،

وراثت، مہر وغیرہ کے متعلق جو تفصیلی احکام قرآن مجید میں موجود ہیں، ان سے عام طور پر
 لوگ واقف ہیں، اس لئے طوالت کے خوف سے ہم انکو قلم انداز کرتے ہیں،
 طلاق اتعلقات زن و شوہر کا ایک بڑا نازک مسئلہ طلاق ہے، جس کے متعلق دنیا کے اکثر مذاہب
 نے سکوت اختیار کیا ہے لیکن اسلام سب سے پہلا مذہب ہے، جس نے افراط و تفریط دونوں سے
 الگ ہو کر فطرت انسانی کے مطابق اصول و آئین مرتب کئے، جن کی صحت کو یورپ بھی روز
 بروز تسلیم کرتا جاتا ہے،

یہودیوں کے یہاں طلاق بات بات پر دمی جاسکتی ہے، عیسائیت اس کو صرف خاص
 حالت میں ممکن قرار دیتی ہے، ہندو اس سے بالکل نا آشنا ہیں، اسلام بھی طلاق کو پسندیدہ نگاہوں
 سے نہیں دیکھتا، چنانچہ حضور سرور کائنات کا ارشاد ہے، کہ جائز چیزوں میں خدا کی نگاہ میں سب
 سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے، لیکن چونکہ اسلام فطری مذہب ہے، اس لئے اس نے طلاق
 کو جائز قرار دیا ہے، کیونکہ یہ بہت ممکن ہے، کہ کسی وجہ سے زن و شوہر کے تعلقات خراب ہو جائیں، اور
 آپس میں تنگنص اور کدورت پیدا ہو جائے، اس لئے ایسی حالت میں علیحدگی ناگزیر ہو جاتی ہے،
 یہ علیحدگی چونکہ اسلام کو ناگوار ہے، اس لئے اس نے اس کے لئے چند شرطیں ضروری قرار
 دی ہیں، جن سے کافی طور پر اندازہ ہوتا ہے، کہ اسلام نے طلاق کو اسی حالت میں جائز رکھا ہے،
 جب کسی طرح شوہر اور بیوی میں اتفاق پیدا نہ ہو سکے،

ایسی حالت میں سب سے پہلے اسلام نے مرد اور عورت دونوں کو صبر و تحمل کی تلقین کی
 ہے، چنانچہ قرآن مجید میں ہے،

فَإِنْ كَرِهَهُمَا فَمَعْلٰی اَنْ تَكُوْنُوْا شِیْءًا وَاحِدًا
 تو اگر تم کو نا پسند کر د، تو یہ ہو سکتا ہے، کہ تم کو ایک چیز نا پسند ہو

اللَّهُ فِيمَا خِفَا كَثِيرًا

وَمَا أَمْرًا خَافَتْ مِنْ بَيْلِهَا شَوْزَةً أَوْ
إِعْمَارًا فَلَا جُنَاسَ عَلَيْهِمَا أَنْ يُصْلِحَ بَيْنَهُمَا
صُلْحًا وَاللَّهُ مُخَوِّدٌ

اور خدا اس میں ہمت کچھ بھلائی پیدا کر دے،

اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے ناراضی یا پریشانی کا ڈر ہو، تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں کہ دونوں صلح کر لیں اور صلح اچھی چیز ہے،

اس کے بعد عورت کی تند مزاجی کی اصلاح کے لئے مختلف تدبیریں بتائی ہیں،

اور جن عورتوں کی نارمانی کا ٹکھو خوف ہو، تو انکو نصیحت کرو، اور انکو چھوڑ دو انکی خواہگاہ میں اور انکو مارو و خفیف طور پر پھر اگر وہ کما مان لیں تو انکے خلاف جیلے ڈھونڈو،

وَالَّتِي تُخَافُونَ شَوْزَنَهُنَّ فَعِصْوَهُنَّ وَاجْعَلُوا
فِي الْمَفَاجِعِ وَاهِرًا بُوَهُنَّ فَإِنَّ أَطْعَمَكُمْ فَلَا
تَنْجُو عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا

اس پر بھی اگر صلح و آشتی کی امید نہ ہو، تو قوم کے سامنے اس مسئلہ کو پیش کرنا چاہیئے، چنانچہ

قرآن مجید میں ہے،

اور اگر ٹکھو خوف ہو، کہ آپس میں ناراضگی ہو جائیگی تو ایک بیچ مرد کے گھرانے سے اور ایک عورت کے گھرانے سے مقرر کرو

وَأِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَأَبْعَثُوا لَكُمْ مِّنْ
أَهْلِهِ وَحُكَّامًا مِنْ أَهْلِهِمَا

اگر یہ کوشش بھی بیکار ثابت ہوئی اور مرد نے طلاق کا قطعی ارادہ کر لیا، تو اس مجبوری کی حالت میں اسلام نے طلاق کی اجازت دی ہے، لیکن اس پر بھی طلاق کا یہ طریقہ بتایا ہے، کہ تین مہینے میں بتدریج طلاق دی جائے، یعنی ہر مہینہ میں ایک طلاق، اس مدت کا اصلی مقصد یہ ہے، کہ ممکن

ہے، کہ مرد اپنا ارادہ بدل دے،

لیکن ان تمام باتوں کے ساتھ مرد نے اگر طلاق دیدی، تو مرد کو عورت کے ساتھ جو بڑاؤ

کرنا چاہیئے، اس کے متعلق قرآن مجید نے حسب ذیل حکم دیا ہے،

عدت کے زمانہ میں عورتوں کو انکے گھروں سے نہ نکالو، انکو اپنے

لَا تَخْرُجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ

کا مکان دو جہاں تم خود رہتے ہو اپنی مقدور کمزوری، اور کو نقصان نہ پہنچاؤ دو کہ نیکو، اور اگر وہ حاملہ ہوں تو بچہ جننے تک انکو ان نفقہ دو، اور اگر وہ دودھ پلائیں تمہاری خاطر تو ان کو اجرت

أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وَجْهِكُمْ وَلَا
تَضَارُوهُنَّ لِفَيْقُو عَلَيْهِنَّ وَإِنْ كُنَّ أُولَاتٍ حَمْلٍ
فَالْيَقِظُوا لَهُنَّ حَتَّى يُفَضَّنَ لَهِنَّ فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ
فَأُولَئِكَ مِنْ أَجْرِكُمْ وَانْصَرِفْنَ

دو اور آپس میں نیکی کے ساتھ معاملہ کرو،

وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا لَمْ تَرَوْا

وَلَوْ حَضَرْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا عَلَى الْمَيْمَنِ فَتَذَرُوهَا
كَالْمُطَفَّةِ
کودہ مت دو، تاکہ ایک کو بائیں متعلق چھوڑ دو،

ان آیات قرآنی سے یہ صاف طور پر ثابت ہوتا ہے، کہ اسلام نے تعدد ازدواج کو ضروری قرار نہیں دیا ہے، جیسا کہ اکثر مخالفین یورپ نے ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، بلکہ ایک مخصوص شرط کے ساتھ اس کی اجازت دی ہے، یعنی صرف اسی حالت میں انسان ایک سے زائد نکاح کر سکتا ہے جب وہ اپنی تمام بیویوں کے ساتھ مساویانہ حسن اخلاق سے پیش آ سکے، ورنہ وہ اسلام کے نزدیک مجرم قرار پائے گا، آیت ثانی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے، کہ اسلام تعدد ازدواج کو اپنی کوئی مخصوص تعلیم قرار نہیں دیتا، کیونکہ تمام بیویوں سے مساویانہ برتاؤ عملاً مشکل معلوم ہوتا ہے، اس لئے جہاں تک ممکن ہو، انسان کو ایک ہی بیوی پر تناعت کرنی چاہیئے، غرض ان دونوں آیتوں سے یہ امر متحقق ہو جاتا ہے کہ اسلام کا حقیقی منشاء وحدت ازدواج ہے،

لیکن چونکہ اسلام فطری مذہب ہے، اس لئے اس نے فطرت انسانی کی ہر حالت کا لحاظ رکھا ہے، اکثر ایسا ہوتا ہے، کہ خاص مواقع پر متعدد وجوہ مثلاً جنگ وغیرہ سے مردوں کی تعداد بہت زیادہ گھٹ جاتی ہے، اس لئے ایسی صورت میں تعدد ازدواج کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، اسلام نے اسی حالت کے لئے تعدد ازدواج کا اصول قائم کیا ہے، چنانچہ خود وہ آیت جو تعدد ازدواج کے متعلق ہے، جنگِ احد کے بعد نازل ہوئی ہے، جنگِ احد میں بہت زیادہ مرد قتل ہو گئے تھے، اس لئے عورتوں کی تعداد زیادہ تھی، اس بنا پر اسلام نے تعدد ازدواج کی اجازت دی،

اسی کے ساتھ قیدیں بھی لگادیں، تاکہ کوئی ناجائز فائدہ اٹھایا نہ جاسکے، ہر حال اسلام نے جنس لطیف کے حقوق کی جس حد تک نگہداشت کی، اور اس کو جس محبت و احترام کی نگاہ سے دیکھا، اس کی مثال دنیا کا کوئی مذہب پیش نہیں کر سکتا،

مرزا احسان احمدی۔ لے،

آرزو

انسان خلاصہ کائنات ہے۔ وسعتِ عالم کی تمام نیرنگیاں اس کے انوارِ سینہ کا عکس ہیں۔ یہ اجمال ہے۔ دنیا۔ مافیہا و لورایا اس کی تفصیل ہے۔ جو لوگ اس راز کے سمجھنے سے قاصر ہیں وہ مناظرِ موجودات پر ایک لمحہ کے لئے نظر دوڑائیں۔ پھر چشمِ بصیرت اپنے اندر واکریں اور دیکھیں کہ قدرت کی ہر ہیرہ دنی نیرنگی کے بالمقابل اُن کے اندرونِ سینہ کوئی نہ کوئی لطیف جذبہ یا احساس ہے جس کی کیفیتِ مضطرب اُس نیرنگی سے علی الدوام وابستگی پر مجبور ہے۔ اسی مجبور جذبہ کا نام آرزو ہے۔ اگر ہمارا علم اپنی تمام غائمتوں کو پاسکتا اور پھر اس علم کے ساتھ ہمیں قدرت ہوتی کہ عالم کی نازک سے نازک اور لطیف سے لطیف بو قلمونیوں کو گن سکیں۔ ساتھ ہی اپنے جذبات کی گونا گونی کا بھی اندازہ کر سکیں تو یقیناً ہم اس نتیجہ پر پہنچتے کہ جس قدر قدرت میں نیرنگیاں ہیں اسی قدر ہمارے دل کے اندر آرزوئیں اور جستیں ہیں۔

صانعِ مہربان نے اپنی محبوب ترین مخلوق کے سینہ میں جہاں آرزو جیسا درخشندہ جوہر پیدا کیا۔ وہاں اس جوہر کی ضوِ افگنی کے لئے وہ وسعتیں اور فضاؤں تیار کیں کہ اگر وہ ابد تک چمکتا دمکتا رہے تو بھی ان فضاؤں کی حدوں کو نہ پاسکے۔ صورت ہے تو ایک سے ایک بڑھ کر۔ رنگ ہے۔ تو ایک سے ایک اٹوٹھا۔ بو ہے تو ایک سے ایک بھینی۔ غرض کیا کیا ہے اور کس کم و کیف میں نہ ہم شمار کر سکتے ہیں نہ یہ شمار کے احاطہ میں ہے۔ اگر مناظرِ ہستی شمار میں آسکتے تو پھر ہستی مدتوں اس سے پہلے فنا ہو چکی ہوتی کیونکہ انسانی آرزوئیں مدت کی محدود و محدود ہو چکی ہوتیں۔

جو چیز دنیا میں نیا منظر پیدا کرتی ہے یا ایک پنہاں منظر کو آشکارا کرتی ہے۔ وہ پہلوئے انسان کی نئی آرزو یا نئی آشکارا ہونے والی آرزو ہے۔ اگر نئی آرزوئیں نہ اٹھیں تو نئے مناظر بھی پیدا نہ ہوں (یاد رہے کہ لفظ مناظر اپنے وسیع ترین معنوں میں یہاں استعمال ہوا ہے۔ ناظرین کی نظر محض قدرتی مناظر تک نہ رہے۔ تمام مادی۔ عقلی۔ روحانی مقاصد لفظِ منظر کی تعریف میں شامل ہیں) منظور آرزوئے منظر میں صرف حواسِ خمسہ ظاہری ہی کار شتہ نہیں۔ نہ حواسِ ظاہری کے اطمینان سے آرزو کا اطمینان مراد ہو سکتا ہے لگاہِ خود سے دیکھو تو آرزو کا مقصد حصولِ منظر اور آرزو کی تکمیل تعریفِ منظر ہے۔ یہ بالکل

ممکن ہے کہ بعض مناظر کی دید یا شنید ہی آرزو کا مقصد ہو اور اُس کی تکمیل بھی۔ مگر یہ صرف مناظر کی بعض اقسام ہیں نہ سب۔

یہ تو قلب انسان کا قصہ ہے اور اہل نوح۔ حقیقت آشنا نظریں اور پتے دیتی ہیں۔ نہ صرف انسانی دل و دماغ ہی سے خواہشات و مقاصد مستلزم ہیں۔ بلکہ ہر جاندار دے جان میں جو قوت عمل یا اُس کی ہیئت کدائی نظر آتی ہے۔ اہل بینش کی نگاہ نکتہ آگاہ میں سب جوہر آرزو کا کرشمہ ہے اور اُس کی مادی نمود۔ علامہ اقبال جنہوں نے ہم پریشان خاطر دوس کو سر آرزو سے از سر نو روشناس کیا ہے۔ آرزو کے اس اعجاز کو اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں یوں بیان فرماتے ہیں :-

چہت اصل دیدہ بیدار ما بست صورت لذت دیدار ما
لبک پا از شوخی رفت ریافت بلب از سعی تو انتقار ریافت
نے بروں از نیستاں آباد شد نغمہ از زندان او آزاد شد

ہر چیز کی ہیئت کدائی اس کی باطنی آرزو کا نتیجہ ہے۔ یہی باطنی آرزو اصل زندگی ہے۔ زندگی جب مادہ کے لباس میں جلوہ گر ہوتی ہے تو اپنی بقا و حفاظت کے لئے طے طرح کے اسباب و آلات وضع کرتی ہے۔ مذہب کی زبان میں یوں کہینگے۔ کہ وہ احسن التامین جب جوہر حیات کو مادہ میں دیت رکھتا ہے۔ تو اس جوہر میں وہ زور تابانی مخفی رکھ دیتا ہے جو اپنی خود نمائی میں اپنے لباس یعنی مادہ کو جس نشوونما ہیئت و صورت میں چاہے بتدریج بدل دے۔ زندگی نے جس قوت و انداز سے مادہ کو احسن التعمیم میں بدلا ہے۔ اور پھر آج تک اس انتہائی واعظ پیکر سے بڑھ کر کسی اور احسن تر لباس میں جلوہ پیرا ہونے کی جستجو نہیں کی۔ اُسے اقبال کی کفایت نگاری نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔

بینی و دست و دماغ و چشم و گوش فکر و تخیل و شعور و یاد و ہوش
زندگی مرکب چو در جنگاہ باخت ہر حفظ خویش ایں آلات ساخت

عقل و جذبات جو بشر کے مائے امتیاز ہیں۔ سب کے سب زندگی یعنی حقیقت آرزو ہی کی ندرت آفرینیوں کے مظاہر ہیں یہ ندرت آفرینیاں جو علوم و فنون۔ قوانین و مقاصد اختراع و ایجاد کرتی ہیں انہیں کی تنظیم و منسق سے عالم موجودات خاص قیام و نظام میں صورت گیر ہوتا ہے۔ زندگی کی یہ غیر مادی مخلوق اس کی تمام مادی مخلوق کی محافظ و مصلح ہے۔ مگر جب تک عقل و جذبات اپنی جدت

میں روز افزوں نہ ہوں۔ حفاظت و اصلاح مادہ میں تبدیل و تقلیب سے کام نہ لیں۔ نئے مقاصد و مناصد منقسمہ شہود پر نہ لائیں۔ اُن کی ہستی معرضِ خطر میں پڑ جاتی ہے۔ نہ صرف ان کی ہستی بلکہ وہ زندگی پر مودہ ہو کر مر جاتی ہے جس زندگی کا وہ حاصل ارتقا تھے۔ مگر عقل و جذبات کی تمام جدت طرازیوں خود آرزو کی ندرت کو شیعوں پر مبنی و موقوف ہیں۔ اگر آرزو میں نیرنگی ہے تو عقل و جذبات بھی نیرنگی دکھانے پر مائل ہیں۔ اگر آرزو خوابیدہ ہو گئی ہے۔ تو عقل و جذبات کو پہلے مردہ شمار کرو۔ عقل یا جذبہ کی ایک پرواز اگر تمہارے مقاصد کو عرش کی بلندی تک اٹھا سکتی ہے تو ترک آرزو کی ایک جھٹک تمہارے عرش تک پہنچے ہوئے مقاصد کو یکدم نعر زمین پر گرا سکتی ہے۔ بقول اقبال

نا امید از آرزوئے پیہم است نا امید ی زندگی را رسم است
نا امید ی بچو گور افشار دت گرچہ الوندی ز پا افشار دت

آدم کا خلد سے نکلن ایک قصہ ہے جو لوگوں کی زبان پر ہے۔ مگر ایک حقیقت ہے جس سے لوگ نا آشنا ہیں۔ ایک آرزو کے پتے کو جنت سی ازلی۔ ابدی۔ غیر منقلب و غیر متبدل جلوہ گاہ میں پیدا کرنا اور پھر وہاں آباد ہونے کا حکم دینا محض ایک بہانہ تھا اور ایک حکمت۔ خدا جانتا تھا کہ آدم کی آنکھ کھلتے ہی اس کا جی ان مناظر پر لپٹا بیگا۔ یہ جو کچھ دیکھ گیا اس کے حصول کا خواہشمند ہوگا۔ جسے حاصل کر لیا گا اُس پر تصرف کی سعی کریگا۔ مگر بغیر آدم کو جنت میں پیدا کرنے اور پھر اسے وہاں سے نیکال کر زمین پر پھینکنے کے خود اس ہستی کو پیدا کرنے اور اُسے نامور کرنے کا کوئی بہتر ذریعہ مصلحت میں نہ تھا۔ پیدا تو آدم کو دُنیا میں کرتے۔ مگر دُنیا کے مناظر جنت کے مناظر کے کب ہم پلہ ہو سکتے تھے؟ مقصود یہ تھا کہ آدم کے سینے میں آرزوئیں تو مناظر جنت کی بھری جائیں۔ اور پھر دُنیا میں اتارا جائے۔ تاکہ قیامت تک اگر مناظر ہستی ختم بھی ہو جائیں تو اس کی آرزوئیں ختم نہ ہوں ان میں جو تصرف کی حسرت ہے وہ نکل جائے تو پھر جب آدم ایک طوفان آرزو بن چکا آرزوئیں اپنی خامی سے پختگی تک پہنچ چکیں۔ حتیٰ کہ ایک خاص و دلکش منظر کے تصرف پر مائل ہوا بلکہ تصرف کر ہی چکا تو حکم دیا گیا کہ بس یہ مناظر تصرف کے لئے نہیں تصرف کی خواہش کو پیدا کرنے کے لئے تھے تیرے تصرفات کے لئے تیرے لئے اور جنت (ادنے جنت یعنی دنیا) تیار ہے۔ جاؤ۔ اس میں اپنی آرزوؤں کی طاقت کو آزمائو۔ ان کو جو لائیاں دے لو۔ تصرفات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھو۔ ہماری شانِ خالقیت مقتضی تھی ایک کرشمہ جو کرشمہ پرور طلسم پیدا کیا جائے۔

جس سے ہماری ذات بے نیاز دستخنی ہے۔ اسے تمہارے دل کے اندر رکھ کر اس کی نیرنگیوں کو آشکار کریں۔ اب تم اسے دل میں رکھو۔ دنیا کی جنت میں اس کے کرشمے دیکھو اور دکھاؤ۔ اعتدال میں رہو گے۔ ”خَلُّوا لِلّٰہِ لَعَلَّہُ یَرْحَمَکُمْ“ پر کاربند رہو گے تو یہ دنیا تمہارے ہی لئے ہے اور تمہاری ہے۔ اسکی نعمتوں کو ہماری دی ہوئی نعمتیں سمجھتے رہو گے تو یہ نعمتیں جتنی چاہو گے جتنی تلاش کرو گے اتنی بڑھتی جائیں گی۔ اور جب بالآخر تمام پانچو گے۔ اور جب ہماری مشیت ہوگی کہ یہ ختم کر دی جائے۔ اور دیکھ لینے کہ تمہاری تصرف کی حسرتیں نکل چکی ہیں۔ تو پھر تم اسی گھر میں جس سے نکالے جا رہے ہو آباد کر دیئے جاؤ گے۔ پھر کبھی ابد تک نہ یہاں سے نکلو گے اور نہ یہاں واپس آؤ گے *

معلوم ہوا یہ دنیا اسی غرض کے لئے پیدا کی گئی ہے کہ اس میں انسانی آرزوئیں اپنی نشوونما پائیں مناظر اپنے جلوے دکھائیں۔ ہر نئے دن نئی آرزوئیں مقصد سے ہم آغوش ہو۔ ہر سہ ماہیہ جو ہم سے معمور ہو۔ دنیا کا کوئی جلوہ۔ کوئی کرشمہ۔ کوئی مقصد۔ کوئی منظر ایسا نہ ہو جس کا کوئی چاہنے والا نہ ہو۔ غرض ہر انسان پابند آرزو ہو۔

کوئے عشق است ہمدانہ و دام است اینجا جلوہ مردم آزاد حرام است اینجا
آرزوئیں اسی وقت تک زندہ رہ سکتی ہیں جب تک وہ نئے مقاصد پر مائل ہوتی رہیں۔ خود نئے مقاصد پیدا کرتی رہیں۔ ایک مقصد کے حصول کے بعد آرزو کو نیا مقصد پیدا کرنا چاہیئے۔ نئی امید کی آگ انسانی دل کے اندر لگانا چاہیئے۔ نئے مدعاؤں کے مناظر اس کی آنکھ کے سامنے لانا چاہئیں۔ جب یہ ہوگا تو خواص ظاہری از خود آمادہ کار ہوں گے۔ زندگی ایک مسلسل جستجو بن جائیگی۔ مقاصد کے رستہ کی تمام رکاوٹیں بے آسانی مغلوب ہو کر رکاوٹیں نہ رہیں گی۔ بلکہ رستہ کے طے کرنے میں مدد و معاون ہوں گی مقاصد کے حصول کے ساتھ ساتھ انسان کو اپنی قوت و طاقت کا احساس ہوتا جائیگا۔ حتیٰ کہ اس کی اُن مقامات پر رسائی ہوگی جن کا پہلے اُس کے وہم میں آنا ناممکن تھا۔

آرزو بُری بھی ہو سکتی ہے۔ مگر بُری آرزو کا پیدا ہونا نفس کی کمزوری اور عقل کی خامی سے ہے ایسی آرزو کو آرزو نہیں کہیں گے۔ وہ حقیقت میں ترک آرزو ہے۔ کیونکہ صحیح و پاک آرزو سے بعید ہے۔ اتنی توضیحات کے بعد اب ہمیں یہ دکھانا ہوگا۔ کہ قوت آرزو نے دنیا میں کیا کیا انقلاب پیدا کئے ہیں؟ انسان کی کن عالی مقاصد تک راہنمائی کی ہے۔ اور ضعف آرزو یا ترک آرزو نے کتنے

افراد کو زندہ درگور کیا ہے۔ کیسی درخشندہ ہستیوں کو تعز ظلمت میں پنہاں کر دیا ہے۔ کتنی اقوام اس کے ہاتھوں اپنے عروج سے گر کر ہمیشہ کے لئے سطح عالم سے ردپوش ہو گئی ہیں۔ مسئلہ تنوع البقا یا حقیقتاً خودی اب ایک عام مسئلہ ہے وہ تصوف یا فلسفہ جو نفی وجود کے سبق دیتا تھا۔ ماسوا کے مقابلہ سے قاصر۔ جستجو تصرف کے کرشموں سے نا آشنا۔ علیحدگی و پستی کے گردھوں میں سکون و راحت کی منزل کا پتہ دیتا تھا۔ اب عقلمند و بالغ نظر افراد اقوام کی نگاہ میں مکروہ و باطل ہو رہا ہے۔

علامہ اقبال کی حقیقت شناسی و شعلہ نوائی نے ہمارے نوجوانوں کی آنکھیں کھول دی ہیں اگرچہ ان کی ذہنی ترقی ابھی تک اس منزل تک نہیں پہنچی کہ کما حقہ اقبال کے اُسرار و رموز کو سمجھ سکیں۔ تاہم انہیں یہ پتہ لگ گیا ہے کہ ہم وہ نہیں جو ہمیں ہونا چاہیے تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ ایک چنگاری اُن سینوں میں بھڑک اُٹھی ہے۔ کہ ہم وہ کب ہو گئے؟ جو ہم تھے اور آج ہم کیوں وہ نہیں جو کل تھے؟ مضمون ایک دوسرے مستقل بحث کی صورت اختیار کرنا چاہتا ہے اور مجھے ڈر ہے کہ پرچم اتنی گنجائش نہیں۔ اس لئے بالفعل اسے یہیں ختم کرتا ہوں۔ اور پھر انشاء اللہ کسی دوسرے وقت اس کے باقی ماندہ اور اہم ترین حصہ پر بحث کرونگا۔

ذوالفقار علی خاں

نامیدی روح کے لئے موت ہے۔
رنزہ حص کو خاک گور ہی بند کر سکتی ہے۔

باطل کی حکومت چند لمحے قائم رہتی ہے اور
خدا سے ڈرو پھر تم کو کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں
سچائی کی قیامت تک۔

وانا دشمن نادان دوست سے بہتر ہے۔

اچھا ہنشیں ایک نعمت ہے۔

غیر مستحق کو فائدہ پہنچانا ظلم ہے۔

باجنس کی صحبت سے موت بہتر ہے۔

افسانہائے عشق

چاند نے کہا کہ :-

جُون کے ہمینہ میں جبکہ ریگستان آتش و حیات سے متحرک ہوتا ہے، میں ایک رات اُس سنہرے ریت کے سمندر پر جس میں ابرام خوابیدہ ہیں، اُن ہلکے بادلوں میں جو نیلگوں آسمان پر چھائے ہوئے ہوتے ہیں، مصرِ علیا سے مصرِ سفلی کی طرف پیرتا ہوا جاتا ہوں۔ دریائے نیل کے سبزی مائل سُست خرام پانی کی سطح منور پر، میرا چہرہ کنارے کی نمدار شادا ہیوں میں سے چھن چھن کر پھسلتا ہوا نظر آتا ہے، اور میں خود اُس کی سیر کرتا ہوں۔

بہر سال، مقررہ رات کو تینوں اسی جگہ سے نکلتی ہیں جو غرما کے درختوں کی شاخوں سے ڈھکی اور چھپی ہوئی نیل کی ایک مخمریت ہے اور جہاں وہ بہر سال غوطہ کھا کے غائب ہو جاتی ہیں۔ بہر سال اُسی رات کو اُسی مقام سے نکل کر تینوں اپنے افسانہائے عشق بیان کرتی ہیں۔ اس کے بعد، تینوں میری آخری شعاع کے ساتھ، سبزی مائل نیل میں ڈوب جاتی ہیں، اُو اپنے مستثنیٰ جسموں کو دریا کے نیم گرم پانی کی آغوش میں ڈال کر، اپنے متفکر چہروں کو، اور اپنی مغموم اور مکدر آنکھوں کو جو اُن کے اضطراب آمیز عشقوں کا آئینہ ہوتی ہیں آسمان کی طرف متوجہ کئے ہوئے، ماضی کی طرف جہاں سے آتی ہیں لوٹ جاتی ہیں۔

(۱)

سب سے اول زلیخا نکلتی ہے اس کے سیاہ بال نہایت شاندار طریقہ سے گندھے ہوتے ہیں، جن پر ایک سفید سادہ اور ڈھنی پڑی ہوتی ہے، آنکھیں بڑی اور سیاہ ہیں جو اس طرح چمک رہی ہیں جیسے دو سیال آفتاب اُس کی تمام حرکات ایک عینیق اور معنی دار مقدس سمجھن کی طرح پُر آہنگ، متوازی اور سنجیدہ ہیں۔ وہ مصر کی سب سے پُرانی عاشقہ اور تمام عالم ماضی کی سب سے زیادہ حسین عورت ہے۔ اُس میں ایک ایسی پُر عظمت اداسی ہے جو صرف اُن عورتوں میں پائی

جاتی ہے جن کا قلب سوائے ایک منتخب آتش کے شعلہ کے، ہر چیز کے لئے بند ہو چکا ہے جو ایک یگانہ اور برگزیدہ عشق کی محشر زائیموں میں اپنی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ وہ سال میں ایک مرتبہ اس برکت دار اور حاصل خیز زمین پر جو اُس کی صحنہ عشق و حیات رہ چکی ہے آتی ہے، اور اُس کے بازو، اور شانے سادہ مگر پُر ارماں حرکتِ حیات سے متحرک معلوم ہوتے ہیں، بولتے وقت، خورنے کے درختوں کی شاخوں کے نیچے، ہوا میں اوپر تلے آتی جاتی ہے۔ اور اُس کی عظمتِ رفتار سے ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ وہ زمین سے کسی زیادہ بڑے سیارہ کی ملکہ ہے، اُس کی آوازیں گہرے، صمبھی اور درد انگیز نغمے بھرے ہوتے ہیں، وہ کہتی ہے +

”اے ارض مقدس! جس نے میری روح کو آتش و حرارت میں مبتلا پیدا کیا ہے۔ لے تیرے پُر فیض، حیات و فراوانی بخش سینہ پر تیری حقیقی بیٹی پھر آئی۔ جس طرح تو اپنے سینے، اور اپنے دل کی گہرائیوں میں سے آخری قطرہ محبت و فیض کسی کو دینے سے دریغ نہیں کرتی، لیکن خاموش رہتی ہے، میں بھی اپنے عشق کے درد و سوز کے بیان کرنے اور اس تصویریں رنگ بھرنے سے احتراز کروں گی، مگر کیا یہ بھی نہ کہوں کہ تیری حقیقی اولاد یوسف نے ہی، میری اس عصمت و وقار کے باوجود، میری روح میں یہ آگ بھڑکائی تھی۔ وہ جب اس دنیا میں تھا، اس وقت جس طرح میرا دل اپنی منفرد اور پوری قابلیتِ جوش کے ساتھ، اُس پیارے چہرے کے لئے تڑپتا تھا، اب بھی اسی طرح تڑپتا ہے +

تو اپنے فیض کو، اپنی ٹھنڈی اور بیجان برکت کو آخری دم تک اپنی اولاد کو بخشے گی، میں، تیری سچی بیٹی زینبا بھی ابد تک اپنی روح کے آخری شعلے، آخری حرارت کو اُسی کے لئے محفوظ رکھوں گی“

اپنے ایمان عشق کی اس طرح صمیمیتِ روح سے تکرار کر کے وہ اپنے لمبے اور شاندار بازوؤں کو اس ننھاگ و پُر فیض زمیں کی طرف اس طرح بڑھاتی ہے گویا اُس سے لپٹنا چاہتی ہے اس کی تقدیس کرتی ہے اور آخر کار اُن سبز ہلکی موجوں میں جو اُسے اپنی شیریں آغوشِ شرف میں لینا چاہتی ہیں ڈوب کر چلی جاتی ہے +

(۲)

اس کے بعد، کلیو پیڑ اپنے تمام طنطنہ، احتشام، اپنی تمام شان و شوکت کے ساتھ نکلے گی ہے وہ اُس سچ و سچ سے آتی ہے جو اُس نے اپنے آخری سپاہی عاشق کو دکھائی تھی، اُس عاشق کو جس نے اُس کے متلون اور ہرجائی دل کو موہ لیا تھا،

سواری کا بھرہ سونے کا ہے، چتر چاندی کے ہیں، باد ہاں ریشم کے، جن میں سے وہ معطر خوشبو میں نکل رہی ہیں جو لذیذ آرزوں سے سہو کو بھی مست کر رہی ہیں۔ خود زرتار تکیوں سے مکر لگائے اپنی حسرت اور امانوں کو لئے دعوت کار، طلبگار لیٹی ہے۔ اُس کے نازک نرم جسم کی ادنیٰ حرکت میں لطیف اشارات احتراس پیدا ہوتے ہیں جنہیں بلینج موسیقی سمجھانے کی کوشش کر رہی ہے اور نہیں سمجھا سکتی۔ اُس کے ساؤنڈ نازک چہرے کے گرد، اُس کے چمکیلے اور نرم بال، اک ادا اے تسلیت سے اپنی پوری رونق کے ساتھ پڑے ہوئے، ایک دل آویز تصویر کا چوکھٹا بنے ہوئے ہیں اس کی دلکش پیشانی میں، اس کی خنور آنکھوں میں، اُن ہونٹوں میں جس کی ہرجنبش میں اک داستانِ عشق پنہاں ہے، اُس کے حسین جسم کے ہر عضو میں، غم الفت۔ دیوانگی محبت۔ ابتلا و مظفریت، جلوے دکھاتی ہیں۔ اس عورت کا سیما، اس عورت کی روح نامتنا ہی ہے۔ اس کی زندگی ایک مدید لمحہ عرصہ رہی ہے۔ جس میں وہ ہر آن ایک نئے جلوے اک نئی روح سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس وقت کہ اُس کا بھرہ نیل پر تیرتا ہوا جارہا ہے، اُس کے چہرے کے گرد، ہزار ہا ردصیں جنہوں نے اس کے عشق کے عذاب اٹھائے ہیں، اب بھی اُن عذابوں سے آتش زیر پا، مگر پروانہ وار چکر لگا رہی ہیں۔ ان پروانوں میں کون کون ہے؟ بڑے سنجیدہ داغ والے، عقلمند لوگ ہیں جو اُس کی متلون مزاجی، کبھی متواضع، کبھی مغرور اداؤں کے شکار ہو چکے ہیں بڑے بڑے باختیار، معتمد شاہنشاہ ہیں۔ یہ اُس حُسن کی کشش میں کھینچے چلے آئے ہیں جہاں وہ زہرہ سے مانگ کر لائی ہے، یہ بچارے سب کے سب وہ اسیر ہیں جنہوں نے تھوڑی دیر کے بعد اور وجد کے بدلے میں اُس کے بیدرد ہاتھوں سے زہرہ کے پیالے پئے اور نیل میں ڈبوئے نا چاہیے کہ اس تماشا گاہِ عالم میں وہ ایک بڑی ایکٹرس تھی، جو عشق کا کھیل کھیلے، بلکہ عشق کی زندگی بسر کرنے ہی کو آئی تھی،

مگر آج کی رات، جبکہ جون کی گرمی میں ریگستان آتشِ حیات سے متحرک ہے، اور وہ زمین پر اپنا پُرانا فسانہ عشق بیان کرنے آئی ہے، اُس کا ایک بھید ہے جسے میں ہی سمجھتا ہوں اور دنیا میں کوئی نہیں سمجھتا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ بظاہر ظالم عورت، ایک کمزور عورت ہے جو تمام عمر عشق کے ہاتھوں ستائی گئی، وہ ایک بلکہ ہے جس کی تپاؤں کا اتنا خون ہوا، کہ وہ ایک سانپے موت کی بھکاری ہوئی، وہ بہت کم باتیں کرتی ہے، مگر اس کے اوضاع، اس کی حرکات سے کیا کیا نہیں ٹپکتا۔ مثلاً جس وقت وہ اپنے آخری عذاب الیم کو دوبارہ اس زمین پر بیان کرنا چاہتی ہے تو وہ صرف اپنے ہاتھ کو نیل کی کیچڑ میں ڈالتی ہے، وہاں اُسے ایک چھوٹا سا سانپ ملتا ہے جسے وہ باہر نکال لاتی ہے، اور اُسے اپنے سینے پر رکھتی ہے۔ پھر اپنے عبا کو اپنے اوپر ڈال لیتی ہے، اور اُس جسم کو جو موت میں بھی ایک طرف قیصر و کسرے کی شان یاد دلاتا تھا، اور ایک طرف ایک پھول ایک ستارہ، یعنی ایک عورت کا جسم تھا اُس شاہانہ لباس سے ڈھک لیتی ہے اور نیل کے سبزی مائل پانی میں جو اپنے شیریں آغوش میں اُسے لینے کے لئے منتظر ہے، اپنے تئیں ڈال کے غائب ہو جاتی ہے۔

(۳)

سب سے آخر میں، ہر پاشا سبز موجوں کے پردے کو ہٹا کر یکا یک نیل کے کنارے نکلتی ہے کہنیاں گھٹنوں پر رکھے، ہر ہاتھوں میں لئے ستارے کی طرح روشن۔ آنکھوں کی نمدار نظریں نیل کی طرف کئے ہوئے وہ بڑی دیر تک نیل سے رازِ دل کہتی ہے۔ میں اس حسین و متفکر چہرے کو بہت پیار کرتا ہوں، ایک زمانہ تھا کہ اسکندریہ، مرمر کی سفید عمارتوں، کتب خانوں، عجائب خانوں اور باغوں سے اک شہرِ خلیل جیسا دلربا شہر بنا ہوا تھا۔ اور وہ کا ندھوں پر نرم ریشمی عبا ڈالے، پاؤں میں خوبصورت چمپلیاں پہنے اس شہر میں مصروفِ خرام تھی، دماغ میں نفیس افکار، عالی فلسفے بھرے ہوتے تھے۔ اس کی روح کی طرح اس کا جسم بھی باکرو عصمت ماب تھا، اور اس عصمت کے خفا تکبر سے متکبر رہتا تھا۔ اس ملک میں جس نے اپنے سنگِ مرمر کے سوا، ہر چیز کو سیلا اور مکہ دار کر دیا تھا، صرف ہر پاشا کی روح پاک و صاف تھی، اُس کے افکار، اُس کے خیالات، اس کی نظریں اس قدر زمین سے علیحدہ، اس قدر گرد و دلِ بیا تھیں، کہ میں اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ وہ کوئی سراپا فلکی ہے۔ میری اور

اُس کی شناسائی اسی زمانے سے ہے جس وقت اسکندریہ کے ادھر سے گذرا کرتا تھا، وہ اپنی پاک اور خوبصورت آنکھوں پر دُور میں لگا کر مجھے گھنٹوں دیکھا کرتی تھی۔ اور پھر پاپیرس کاغذ پر عجیب خطوں سے کچھ لکھا کرتی تھی۔ حسب معمول میں ایک رات، اسکندریہ سے گذر رہا تھا، اور حسب معمول میں نے اس کی کھڑکی میں سے جھانکا۔ میں نے اُس کا گھر خالی پایا۔ آج زلیخا وکیو پیٹر کے بعد جو وہ نکلی تو میں نے اُس سے پوچھا کہ کدہ خاک سے وہ کیوں روپوش ہو گئی؟ اس نے اپنے پیارے سر کو جو یونان کی عقل و حکمت کی دیوی اتینا کا تجلی گاہ بنا ہوا تھا میری طرف اٹھایا اور اُس یاس سے جو تمام علما و مکلائے دہر کو دنیا سے رہی ہے، اُس نے مجھ سے کہا:-

”میں نے انسانوں کو تعبد و ذلت میں سے نکالنے اور ابھارنے کی کیا کیا جدوجہد کی۔ اے پیارے چاند! تو اس کا شاہد ہے۔ انسان، جس وحشت و بہیمیت میں مبتلا ہے۔ وہ نظارہ اپنی دل خوں کن تخلیوں میں میری آنکھوں کے سامنے تھا، مگر میں اُس وقت اُس پاک و علوی خواب کو دوبارہ دیکھ رہی تھی جو افلاطون کی بزرگ روح نے انسانوں کے لئے دیکھا تھا، میں چاہتی تھی کہ سب انسان، آنکھ، روح اور فکر کے ذریعہ، پروردہ حُسن و خوبی ہوں۔ نیچر کی خوبصورتی، صنعت کی خوبصورتی، اُن کے چاروں طرف تبسم ریز ہو، اور اُن کے دماغ حُسن سماوی کی طرف بالا پرواز ہوں۔ میں چاہتی تھی کہ انسان کے قوائے ذہنیہ عظیم کے زیور سے آراستہ ہو کر رک تو اسے ذہنیہ ہی انسان کی بلند ترین تجلی ہیں، مادہ اور جسم کی سفلیت و تاریکی پر غالب ہوں آہ! اس کے لئے میں نے کیسی کیسی کوششیں کیں، مگر ہوا کیا؟ ادھر اُس مونس و روحانی مسیحا کی امت جو انسان کو بچانے کے لئے آیا تھا، انسانوں کو عذاب و شکنجہ میں کھینچ کھینچ کر، فکر اور دماغ کو تعصب و جہالت سے بھر بھر کے تاریک کر رہی تھی، اور ظلم و خونخوار بن۔ کہ میرے پاک خواب کو برباد، اور میرے تمام مجاہدے کے مقابل میں دیوارِ آہن استادہ کر رہی تھی ادھر، روماکے بیمار و کثیف بچے، اور پھر مال کے وحشی میرے رویائے علمی، میرے خواب ارتقاء و منجابت انسان کو، اپنے دنی اور ذلیل حرکات سے پر آگندہ و پریشاں کر رہے تھے۔ آخر ایک دن آیا کہ ان ہزاروں جنس والے، ہزاروں مذہب والے انسانوں کے اجموعہ میں پیروان عیسے بھی ظاہر ہوئے؟ ان حضرات کے تشریف لانے کے نتیجے سے، پیارے چاند! تم نیچر نہیں ہو؟

یہ کہتے وقت اپنے حسیں جسم کی پوری قابلیت عظمت کے ساتھ کھڑی ہوتی ہے، اور اپنے کندھوں کو اونچا کرتی ہے، اور ایک لطیف وقار کے ساتھ جو اولمپا کے حسین اور بلند مرتبہ دیوتاؤں سے حال کیا گیا معلوم ہوتا تھا، اپنے سر کو آسمان کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

یہ بیروان عیسیٰ آئے اور اُس خوشخوار درندوں کے غول کی طرح جو خون پینے کے لئے کسی کے پیچھے جھپٹ رہا ہو، مجھے اپنے کلیسا تک گھسیٹ لے گئے۔ اور اپنے بے گناہ عیسے کی تصویر کے نیچے جو منغم مگر روحانی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی، مجھے ذبح کیا اور میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ مجھے تو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، مگر میرے دماغ کے تخیلات کے تسارے اب بھی مرتفع، اب بھی ضیا بار، اب بھی آسمان ابدیت میں دشنہ رہیں اور رہیں گے۔

اُس نے جب یہ دلدوز تقریر ختم کی، تو اُس سوز و گداز کے ساتھ، جو رینیا اور کلیو پیٹر کے ماجرائے عشق نے مجھ میں پیدا کر دیا تھا، میں نے اُس سے پوچھا:-

”پیاری لڑکی! یہ تو بتا کہ تیرے روحانی اور بے داغ جسم کو کبھی بشری خطاؤں کا دھندہ تو نہیں لگا؟“

اُس نے اپنی نورشال مگر خیال پرست نظروں سے میرے دل کی گہرائیوں تک کو چھید ڈالا، جس نے مجھے بتایا کہ جس طرح اُس کی روح، فضا نے لاہوتی میں اپنے سفید پروں سے پران ہے، اسی طرح بشری کمزوریوں کے بھنور، خطاؤں کی گہرائیوں میں بھی پھڑپھڑا چکی ہے۔ مگر میں ان رازوں کو جن سے دنیا بے خبر رہی ہے کبھی زبان پر نہیں لاسکتا کیا اُس نے بھی، ہر انسان کی طرح محبت کے عذاب، پھیلے، تاریکیوں میں ٹھوکر کھائی شعلوں میں گری یا نہیں گری؟ اسے صرف ہیمپشائر کی روح جانتی ہے یا میں۔

وہ جب ہر سال اپنا قصہ اپنی آنکھوں سے مجھے سناتی ہے، میں سفید اور سنہرے بادلوں میں سے نکل کر، اور اپنی زرد اور ٹھنڈی شعا میں اُس کے محبوب چہرے اور اُس کے باکر جسم پر ڈال کر، شفقت و نوازش سے اُس کے بو سے لیتا ہوں، اُس کی تقدیس کرتا ہوں، آخر کار وہ بھی، اُن دونوں کی طرح، سبز پانی کی شیریں اور منتظر آغوش میں اپنے تئیں ڈال دیتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔

سید سجاد حیدر

(خالہ خاتم ادیب)

خیالات

جس نے عسرت کا منہ نہ دیکھا۔ وہ زندگی کی حقیقت سے نا آشنا رہا! جس کی آنکھیں غم کے آنسوؤں سے لبریز نہ ہوئیں اُس نے دریائے دل میں پانی کے ندو جزر کا نظارہ نہ کیا! خوشیاں اے ہمدرد دکش و دلفریب ہیں اور غم جا نگداز، لیکن وہ سراب آفریں ہوتی ہیں اور یہ عکس ریز! اُن سے راہ چلنے والے رستہ بھول جاتے ہیں اور یہ بُرے وقت میں بھی بھولے ہوؤں کی رہنمائی کرتا ہے!

بچہ و افکار اضطراب انگیز ہوتے ہیں اور عشرت ساکن، لیکن جو ہڑ میں پانی کثیف ہوتا ہے اور بیتی ہوئی ندی میں لطیف و پاکیزہ!

سمندر میں طوفان اٹھتا ہے تو خوابیدہ پانیوں میں شدت کی بے قراری پیدا ہو جاتی ہے لیکن بحرِ ناپیدا کنار کی عصمت و عفت فقط اسی بے کلی پر موقوف ہے!

بادل گرج کر جسم میں سنسنی پیدا کر دیتا ہے اور بجلی چمکتی ہے تو آنکھوں کو چند صیادتی ہے لیکن تیرہ و تار جنگل میں تنہا مسافر کا رستہ اُسی سے مُتور ہے!

دُنیا میں کوئی وجود نہیں جس کے نفس میں گاہے گاہے بے چینی پیدا نہ ہو اور کامل سکون تو زندگی کے لئے عین موت ہے؟

اے تُو جو سرِ بفلک محلوں میں مُتکِن ہو کر اپنے نادار بھائیوں پر غلط اندازِ نظریں ڈالتا ہے نہیں سمجھتا کہ خس و خاشاک کے جھو پڑے میں رہنے والا مزدور اپنے خدا کے زیادہ قریب ہے اُس نے تنگی کے سینکڑوں دن کاٹے ہیں اور اپنے بال بچوں کی فکر میں اُس کی اکثر اتیں بیداری میں گزری ہیں!

وہ جس کی وزنی جیب میں سونے چاندی کے سسے جھنکار پیدا کر رہے ہیں کیونکر جان سکتا ہے کہ شوکھی روٹی اور ٹھنڈے پانی کے گھونٹ میں کس نعمتِ خداوندی کی شیریں بنیاں چھپی ہیں اُسے کیا معلوم کہ ننھے بچے کی مطمئن سُکراہٹ میں کسی ضیاء نورانی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں!

اے بد بخت جس کی قسمت میں دُنیا بھر کی راحتیں لکھی ہیں اور کاوش کچھ نہیں اگر چاہتا ہے کہ جہانی آسائش کو اطمینانِ قلبی کے بدلے کھودے اور جیتے جی موت کی خوشیاں حاصل کرے تو اپنے لاکھ کے گھر کو خاک میں ملا دے اور قدرت کی بے نیازی سے اپنی فطرت کو مالا مال ہوجانے دے؟ وہ کم مایہ جس کو تو نے ابھی حقارت کی نظر سے دیکھا ہے جب کڑی دھوپ میں تپتی ہوئی ریت پر اُس کے دو آنسو ٹپکتے ہیں تو اس آزاد روشی پر فرشتوں کا دل پسینا ہے؟ تو دُنیا سے کوچ کرے گا تو ساز و سامان کے ساتھ دفن ہوگا اور چند ساعتیں اخباری یا کاروباری دُنیا میں تیرے اٹھ جانے کا خشک تذکرہ ہوگا لیکن وہ جان دیگا تو شانِ کریمی ٹھنڈی ہواؤں کے ساتھ اُس کے استقبال کو ایسی گدگد پھولوں کے اک مطہر کنج باغ میں اُس کا مسکن ہوگا اور یہ اس لئے کہ تو عمر بھر آدمیوں سے منہ پھیر کر فقط اپنے نفس کی پرورش میں منہمک رہا لیکن اُس کی جان نے زندگی کے سارے دکھ خود سہے اور کسی دل کو ایذا نہ دی!!

ہمارے خزان ہو جاتی ہے۔ دن ڈھل جاتا ہے، شام چھا جاتی ہے! اور

بقاصرِ خدا کی ذات کو ہے!!

پرندے چمکتے ہیں اور خاموش ہو جاتے ہیں، پھول کھلتے ہیں اور مڑ جھکا جاتے ہیں، لہریں سمندر میں اٹھتی ہیں پھر بہ جاتی ہیں، سورج نور کے تڑکے رونا ہوتا ہے پھر شام ہوتے افق میں چھپ جاتا ہے اور بقاصرِ خدا ہی کی ذات کو ہے!!

ہم پیدا ہوتے ہیں، ہمارا بچپن کھیل کود میں گذرتا ہے اور ہماری جوانی عیش و عشرت میں صرف ہو جاتی ہے۔ ہم مالِ دولت کے جھگڑوں میں غرق ہو جاتے ہیں اور بال بچوں کے بکھیرے میں پڑ کر سمجھتے ہیں کہ اب تو ہماری زندگی آدمیوں کے لئے بھی لا بُدی ہے لیکن بڑھاپا آتا ہے تو روح خود بخود موت کے آگے سرنگوں ہو جاتی ہے کیونکہ وہ جان لیتی ہے کہ

بشیر احمد

بقاصرِ خدا ہی کی ذات کو حاصل ہے!!

محفل ادب

ابونصر فارابی معلم ثانی۔ اگرچہ ابونصر سے پہلے مسلمانوں کو یونانی فلسفہ سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ مگر ارسطو کی نکتہ آفرینیوں اور دقیقہ سنجیوں کو ایک دوسری زبان درکار تھی۔ قدرت کے اسرار ایک ترجمان کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ اُس وقت یونانی فلسفہ عربی میں نہایت بحدے اور ناموزوں ترجموں کے لباس میں تھا۔ بے جان الفاظ کے پیکروں میں روح معانی کے جلوے تصور کو بھی نظر نہ آتے تھے کہ یہ نامور وجود خاک پاک پارس سے اُٹھا۔ اور حقائق اشیاء کے اظہار کا چمکتا ہوا آفتاب تمام عالم افکار میں روشن کر دیا۔ جس کی کرنیں عرب و عجم بلکہ یورپ و امریکہ کے فلاسفروں کے خلوت کدہ شغیل میں پہنچ گئیں۔ ارسطو نے گوا فلاطون کی طرح تعلیم فلسفہ کے لئے اپنی ہیکل کے دروازہ پر یہ نہیں لکھ دیا تھا کہ جو علم ہندسہ نہ جانتا ہو ہمارے پاس نہ آئے، لیکن اُس کا تسلسل خیالات اور مقدمات تہید یہ کا سلسلہ بھی فہم و خرد میں ابھی نہ آنے پاتا تھا کہ مخاطب کثرت غور و خوض سے مجبور ہو جاتا تھا۔ ابونصر نے ارسطو کی کتابوں پر کثرت سے تعلیقات لکھے، اُس کے مجمل بیانیوں کی تشریح اور مترجمین کے اغلاط کی تصحیح کر دی۔ جس سے عربی خزائن افکار میں یونانی جواہر کی قدر و قیمت بڑھ گئی۔ یونانی فلسفہ عام ہو گیا۔ اور عام و خاص اُس سے مستفید ہونے لگے۔ (عبرت)

”انسان کی طبیعت کا خاصہ ہے کہ دوسروں کے حالات معلوم کرنے میں بڑی دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔ جگ بیتی کی شننے میں اُسے بڑا لطف آتا ہے۔ حالانکہ اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ہلکی اپنی زندگی ہی کیا کم ہے؟ اپنی ہی معاشرت اور میل ملاپ کے روزانہ مشاہدے اُس کے لئے کافی ہو سکتے ہیں۔ لیکن شاید اس کے مزاج میں ایک عجب عیاری اور شوق جستجو ہے۔ وہ اپنے تجربوں کو نہایت سستے دامنوں میں لینا چاہتا ہے۔ دوسروں کی تقلید کی خواہش ہمیشہ دامنگیر رہتی ہے۔ اور اُن کی زندگی ایسی پر اسرار و عجیب معلوم ہوتی ہے کہ اپنے مشاہدات خواہ کتنے ہی

دکھیں پ و نتیجہ نیز ہوں مگر مقابلتا کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ قصوں اور کہانیوں کے پڑھنے یا سننے میں اسے ایک خاص قسم کا ذوق و شوق ہوتا ہے۔ وہ اس مقصد کو پورا کرتے ہیں اور ان کی تعلیم و تلقین خواہ کتنی ہی مصنوعی و مبالغہ آمیز کیوں نہ ہو مگر اُس کے وہم و تخیل کی تسکین کے لئے کافی ہے اور اُس کی سمجھ کے موافق اُس کے علم میں بھی اضافہ کرتی ہے اور وابستگی کا باعث بھی ہوتی ہے۔“

(اردو)

ہمارا راجہ اشوک۔ اشوک گو بدھ مذہب کا پکا معتقد تھا۔ لیکن دوسرے مذاہب کے معتقدوں کو بالکل ایذا نہیں دیتا تھا۔ اُس کے بعض احکام سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ برہمنوں جینیوں۔ اور سادھوؤں کی بہت عزت کرتا تھا۔ ایک فرمان میں صاف طور پر لکھا ہے کہ راجہ تمام مذاہب کے لوگوں کو عزت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور اُن کو انعام و اکرام دینا پسند کرتا ہے۔ اسی فرمان میں یہ بھی ذکر ہے۔ کہ راجہ مذہبی تعصب کو مہرگز پسند نہیں کرتا، اور اس کو ایک آنکھ نہیں بھاتا کہ کوئی شخص کسی دوسرے مذہب کے معتقدوں کے ساتھ درشتی یا سختی سے پیش آئے۔

(شباب اردو)

نیویارک (امریکہ) کا ایک تاجر کتب حال ہی میں تمام یورپ کی سیاحت کے بعد لندن پہنچا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ امریکہ میں اب تک جو کتب نہایت سرعت اور عمدگی سے فروخت ہوئی ہے وہ مین سٹریٹ تھی جس کے دو لاکھ نسخے بہت جلد فروخت ہو گئے۔ مگر تاجر موصوف بیان کرتا ہے کہ جب وہ برلن میں تھا تو ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی کتب کے شائع کنندگان نے ڈاکٹر موصوف کی تصانیف کو شائع کرنے کے لئے بیس لاکھ پونڈ سے زیادہ کا غذا بجا آرڈر دیا کہ کتب شائع کی جائیں سناڑہ کیا گیا ہے کہ بیس لاکھ پونڈ سے تیس لاکھ کتب شائع ہو سکیں گی۔“ (زمانہ)

تنقید ہو یا تنقیض۔ خود اپنی ہی حقیقت ادراک اور ذوق طبیعت کا انکشاف ہے انگلستان کا مشہور فلاسفر رو کے اب سے ساٹھ سال پہلے کہہ گیا ہے۔

بعض اوقات کسی نقاد کی خامہ فرسائی مبحث پر اتنی روشنی نہیں ڈالتی جس قدر خود اپنے دل و دماغ کی کارگزاری پر۔ ایسی حالت میں موضوع بحث محض ایک آئینہ ہوتا ہے۔ اور بحث نقاد کی فوات کا عکس۔“

”تنقید۔ خواہ وہ کسی ادیب کے متعلق ہو۔ سب سے پہلے نقاد پر ایک تنقید ہوتی ہے۔ نقاد جس طرح دوسروں کی حقیقت کا مفسر ہے۔ اسی طرح خود اپنے جوہر قابلیت کا آئینہ دار ہے۔“
(مخزن)

ڈاکٹر فرینک کرین۔ کانفرنس برائے متحدہ اسلحہ کو مشورہ دیتے ہیں کہ جب تک انسانی نفس۔ یا ذہن غیر مسلح نہ ہوگا جسم کو غیر مسلح کرنا بیکار ثابت ہوگا۔
”اگر تو میں بحری و برمی طاقتوں کو غیر مسلح کر دیں گی تو اس سے کیا حاصل ہوگا اگر ہماری رُوحیں بارود سے بھری رہیں اور ہمارے خیالات توپوں کی چمک سے روشن ہوں +
تمام مادی اشیاء روحانی کیفیات کی منظر ہیں۔ اور مشکل یہ ہے کہ ہم ایک ایسے دل کے ساتھ دنیا میں زندگی گزارتے ہیں جس کے خیالات گویا تیر و تفنگ اور چاقو اور بندوق کی تیزی تندی سے ہم آغوش رہتے ہیں + اگر ہم صلح اور خوشحالی چاہتے ہیں۔ اگر ہم دنیا کے گلی کوچوں میں امن و سکون دیکھنے کے خواہاں ہیں تو ہمیں ذہنی طور پر اپنے آپ کو غیر مسلح کرنا پڑیگا +
وہ ذہنی اسلحہ کیا ہیں منافرت، خود پسندی، انتقام، بے اعتمادی۔ یہ باتیں خواہ کسی قوم میں ہوں یا کسی فرد میں دائمی صلح کے لئے ان کا ترک کرنا لازم ہے!
(ماڈرن ریویو)

منظلیہ حکومت کی بنیاد زور و زبردستی پر نہ تھی۔ یہ بات قطعی ناممکن تھی کہ اتنے بڑے براعظم میں جہاں لاکھوں قبضے اور دیہات دور دور تک پھیلے پڑے تھے زور و زبردستی سے حکومت کی جاتی + علاوہ بریں قرون وسطیٰ میں حکومت کی قواعد و ان فوج اور لوگوں کے اک جم غفیر میں اتنا فرق نہ تھا جتنا آج کل نظر آتا ہے۔ ان مادی زبردستی کا نتیجہ زبردستی ہوتا تھا اور زبردستی کی حکومت بہت

نہ چل سکتی تھی۔ مغلوں کا ڈیڑھ سو برس تک اپنی سلطنت قائم رکھنا زورِ شمشیر کی وجہ سے نہ تھا۔ اُس کی بنیاد مذہب یا زورِ قوت یا کسی مخصوص جماعت کی امداد پر نہ تھی۔ پندرہویں صدی کی مغلیہ حکومت عوام الناس کی حقیقی رضامندی سے نشوونما پاتی تھی + مذہبی آزادی اس تسلیم و رضا کی پہلی شرط تھی + دوسری وجہ معاشرتی زندگی کی مکمل آزادی تھی اور تیسری وجہ یہ تھی کہ ہر گاؤں کی حکومت اپنے قدیم دستور کے مطابق گاؤں والوں کی مرضی پر چھوڑ دی گئی تھی +

(ماڈرن ریویو)

عراق اور علم و ادب - معاصر العراق، بغداد عراق عرب میں دورِ جدید کی برکات کی فہرست بیان کرتا ہوا سطور ذیل میں اہل علم و ادب کی مساعی کا ذکر کرتا ہے:-

”ادابائے عصر نے جب دیکھا کہ عربی ادب انحطاط پذیر حالت میں ہے، عراق عرب کے تاریخی وقار کو دیکھتے ہوئے یہ ادبی انحطاط افسوسناک ہے۔ اسی کے ساتھ انہوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ عراق میں ایسے گرانقدر ادیبوں اور عالیمہ سحر ازلوں کی کمی نہیں ہے جو اپنی ذرا سی توجہ سے ادب عربی کو زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا سکتے ہیں، جو ادبیات کو عصرِ حاضر کے مناسب جدید سانچے میں ڈھال کر جدت و اختراع کی رنگینیوں سے روح فرود بنا سکتے ہیں صرف اس بات کی کمی ہے کہ اہل ادب ”اشتراکِ عمل“ کے اصول پر کاربند ہو کر مل کر کام کرنے کے خوگر ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے چند اصول عمل بنا کر اپنی ادبی کوششیں شروع کر دی ہیں۔

اسی طرح علمائے کرام نے تعلیم کے فقدان اور اُس کے خطرناک نتائج۔ جہالت کے عموم اور اس کے مہیب انجام کو دیکھا۔ اور سمجھ لیا کہ اہل وطن کا نعمتِ علم سے دیر تک محروم رہنا تباہی کا موجب ہوگا اس تکلیف دہ احساس سے متاثر ہو کر انہوں نے اہل علم کی ایک جمعیت کے انعقاد کو ناگزیر تصور کرتے ہوئے ”المعهد العلمی“ کا افتتاح کر کے اطراف و جوانب میں اس کے انعقاد کا اعلان کر دیا تاکہ اہل وطن اس میں داخل ہو کر بہرہ اندوز ہوں۔

العراق (بغداد)

قدرتی شاعر وہ ہے۔ جو روزمرہ کی باتوں کو نہایت دلکش الفاظ میں لوگوں کے سامنے ایسی صحت و صفائی کے ساتھ پیش کرے۔ کہ وہ انہیں فوراً سمجھ سکیں۔ وہ شیریں لیکن حقیقی امور کا ایک ایسا چشمہ ہائے جس کے کنارے آکر حساس لوگ عاشقی مزاج شیا مآ کے زمرے میں حسین پھولوں کی خوشبو سونگھیں۔ معصوم تیتریوں کا رقص دیکھیں۔ اور دو چار گھنٹے کی تفریح کے بعد رخصت ہو جائیں۔ جسے سمجھنے کے لئے گھنٹوں پریشاں ہونا پڑے اور لغات کی ورق گردانی کرنے کی ضرورت محسوس ہو۔ وہ شاعری نہیں ہے۔ شاعر محمولی الفاظ لے کر اُن سے اک حسین دنیا تعمیر کر دیتا ہے۔ وہ الفاظ کے ساتھ کھیلتا ہے شاعری وہ ہے جسے سُن کر آدمی بے اختیار کہہ اُٹھے۔ ایسا تو میں بھی کہہ سکتا تھا۔ لیکن جب کہنے لگے تو دماغ پریشان ہو جائے۔

پر بھا (ہندی)

آرٹ کا مخزن قدرت کی لامحدود خوبصورتی ہے۔ لیکن آرٹ قدرت کا ممکن نہیں بلکہ انسانی دل کی اندرونی خوبصورتی کا بیرونی اظہار ہے۔ والٹ وٹھمین نے اپنی ایک کتاب کے پہلے صفحہ پر لکھا ہے۔

Comerads, this is no book who touches this touches a man

یعنی اے دوست! یہ کتاب نہیں۔ جو اُسے چھو تا ہے وہ گویا اس کے مصنف کو چھو تا ہے۔ آرٹ کے دیگر شعبوں کے متعلق بھی یہی کہا جاسکتا ہے۔ جس طرح شاعر اپنے اشعار میں اپنی روح بھر دیتا ہے۔ اُسی طرح مصور اپنی تصاویر میں اپنی روح نکال کر رکھ دیتا ہے۔ ہر ایک آرٹسٹ کے دل میں قدرت کی خوبصورتی کی جو دل آویز تصویر منقش ہے۔ اُسی کو وہ اپنے اظہار کمال کے موقع پر دنیاوی لگا ہوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ شاعری اُسی کی زبان ہے، موسیقی اُسی کی تان ہے۔ مصوری اُسی کا عکس ہے۔ جسے اپنے دل کی گہرائیوں میں اس خوبصورتی کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ اپنے فن لطیفہ میں ناکام رہتا ہے۔ وہ ڈھانچہ کھڑا کر سکتا ہے۔ کہ یہ کوشش کا نتیجہ ہے۔ لیکن اُس میں موزونیت اور شعریت پیدا نہیں کر سکتا جو اُس ڈھانچے کی جان ہے۔ اور یہ اُس وقت تک نہیں ہو سکتا۔ جب تک اُس کے دل

میں خوبصورتی کا ظہور نہ ہو۔ جس کا دل حُسن کی تجلیوں سے محروم ہے۔ اُس کا اظہار کمال ہمیشہ ناکمل رہتا ہے۔ اور دُنیا ئے صیغہ فنون میں یہی سب سے بڑا نقص ہے۔ سرسوتی (ہندی)

دین و دُنیا۔ دُنیا دین کی آزمائش کرتی ہے۔ دین۔ دنیا میں انسان کو ترقی دیتا ہے بعض اصحاب ایسے ہیں جو دین کماتے ہیں۔ بعض دنیا میں محو ہو جاتے ہیں۔ مبارک وہ ہیں جو دونوں کو انکی مناسب جگہ دیتے ہیں۔ اور دین و دنیا دونوں میں ممتاز درجہ حاصل کرتے ہیں۔ دین و دنیا دونوں دو علیحدہ چیزیں ہیں لیکن ایک دوسرے کے مخالف نہیں۔ ان کا اتحاد انسانی تہذیب کا منتہائے مقصود ہے۔

رسالہ گجراتی پونا (گجراتی)

محبت۔ ایسے آدمیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو دیانت داری سے جانتے۔ مانتے۔ اور محسوس کرتے ہیں۔ کہ عورت اور مرد میں محبت نہیں ہو سکتی تا وقتیکہ وہ خاوند بیوی نہ ہوں۔ یا بد چلن یا قریبی رشتہ دار نہ ہوں۔ یہ خیال تہذیب اور سوسائٹی دونوں کی بدترین توہین ہے۔ دُنیا میں سب سے پاکیزہ اور بلند ترین محبت وہ ہے۔ جو خون شریک رشتے، خاوند بیوی کے تعلق، اور ناپاک جذبات سے قطعی بے نیاز ہو۔ —————

مہذب ممالک اس پر فخر و ناز کرتے ہیں۔

بھارتی (بنگالی)

تاجور

اسے یہ گجراتی زبان کا بلند پایہ رسالہ پونا سے ماہوار شائع ہوتا ہے

اسے بنگالی زبان کا یہ منتخب ماہوار ادبی رسالہ ڈاکٹر راہندر ناتھ ٹیگور کی ہمیشہ سورن کمادی دیوی کی ایڈیٹر ہیں شائع ہوتا ہے۔

لغات الجاہلین (والعائین)

انسان۔ ایک پتہ جو زندگی کی شاخ میں گلتا ہے۔ اس پتے سے ایک کلی بھڑکتی ہے (بچپن)۔
 کلی بھول بن جاتی ہے (شاب) بھول جھڑک پھل لاتا ہے (پیری) پھر یہ پھل پختہ ہو کر ٹوٹے موت
 میں گر پڑتا ہے جو اسے ہمیشگی کے سمندر میں لے جاتی ہے +
 ڈب
 اک بزرگ جو ارتقائی پھلانگیں لگاتے لگاتے اپنا قومی نشان (دم) کھو بیٹھے۔ (تاجور)
 بستر۔ وہ سرائے جہاں ہر شخص رات کے وقت آکر ٹھہرتا ہے +
 ڈب
 تعلیم۔ عقل مارنے کا ذریعہ جس سے ڈینگ مارنا سیکھا جاتا ہے۔ دستخط کر سکنے کا فن +
 ڈب
 تعلیم۔ موجودہ ہندوستان میں ایک عجوبہ زامشغل۔ جواب سے دو سال پیشتر ہر ہندوستانی کے
 لئے "دین ایمان" سے زیادہ ضروری تھا۔ لیکن اب نوجوانوں کے لئے زہر قاتل۔ روح سوز غلام سا
 یہ اور وہ اور خدا جانے کیا کیا! اس پر طرہ یہ کہ صنف نازکتر (اسکول کے بچوں) کو جب تک وہ
 اسکول میں ہوں یہ زہر قاتل ضرر رساں نہیں۔ (تاجور)
 تذبذب۔ انسان کی گستاخی خدا کے آگے۔ ہاتھ پاؤں مارنا۔ عقل کو زنگ لگنے سے بچالینا۔
 تقدیر کے بیڑے سے اپنا بیڑا ادینا۔ خدا کی دی ہوئی طاقت کا استعمال +
 ڈب
 تقدیر کی بیوی۔ (تاجور)
 ٹائی۔ ایک مروڑا ہوا کپڑا جو اشارہ کرتا ہے کہ پنپنے والا پھانسی دئے جانے کے قابل ہے
 چاند۔ تاروں کا دلبر۔ چاندی کی ایک طشتری جس میں رات سورج کی کرنیں رکھ کر زمین کے
 آگے پیش کرتی ہے +
 ڈب
 چاندنی۔ چاند کی محبت بھری نگاہیں۔ محبت کی بولی۔ ایک سوئی ہوئی حسینہ جس کے
 چہرے کی جھلک تاریکی کو اپنی ہلکی ہلکی کرنوں سے منور کر دیتی ہے
 حجام۔ جس کی مدد سے افریقہ کا حبشی یورپ کا جٹلمین بن سکتا ہے +
 ڈب
 سر تراش (تاجور)

خدا۔ وہ ترازو جس میں کائنات کی قوتیں تلتی رہتی ہیں + ایک آن دکھی ہستی جو کائنات میں قدرت کے ساتھ آنکھ چھولی کھیل رہی ہے + جس نے لاکھوں کروڑوں ہستیوں کے جوڑے جوڑے بنادیئے اور پھر خود اکیلا رہ گیا + جس کی عظمت اسی میں ہے کہ وہ پوشیدہ ہے +

وہ سب سے زیادہ شریکی ہستی جس نے کائنات کا پردہ اپنے چہرے پر ڈال لیا ہے ڈ ۱۹۔ انسانوں کے ایک فرقے کی ایجاد جس کی گذران ایسی پر ہے۔ دوا کھانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ کوئی شخص کسی مرض میں مبتلا ہو بلکہ صرف یہ کہ اُس کا کسی ڈاکٹر سے تعلق پیدا ہو جائے ڈ ۲۰۔ اگر اشتہاری ہوتو، ہمالیہ کی سب سے بلند چوٹی کی گیمیاں رہنے والے ایک خدا رسیدہ سنیا سی کی عطا کردہ "جیون بوٹی" ایک ایسے شخص کو جو پریس ایکٹ کی زد میں آنے والے امراض سے تنگ آکر خود کشی پر آمادہ تھا۔ لیکن اس "جیون بوٹی" کی ایک ہی خوراک سے ایسا بھوت سر پر سوار ہوا کہ کابھی ہاؤس میں بند کرنے کے قابل ہو گیا۔ "تاہور

(ڈاکٹر می ہوتو) گوئین اور دودھ چاول جو تین سو تینٹا ٹھ مرضوں کے لئے مفید ہے۔

(یونانی ہوتو) گل بنفشہ گاؤ زبان عناب مویز منقی کاسنی بیج کاسنی ہمارا

۶ ماہ ۵ عدد ۲ دانہ ۶ ماہ ۶ ماہ

کوفتہ بیختہ جو شدادہ خیسانہ ساختہ ہمراہ عرق بادیان بخورند

دنیا کی خطرناک طور پر بڑھتی ہوئی مردم شماری کی روک تھام کے لئے یہ مرکب دوا بہت

(تاہور)

مفید ثابت ہوئی ہے۔

س سائنس۔ نجات پانے کی نئی مشین جو چلانے والے کو پیس ڈالتی ہے + وہ علم جس سے خدا کی قدرت ثابت ہوتی ہے لیکن جو اپنے جاننے والے کو خدا سے منحرف کر دیتی ہے + ڈ

شاعر۔ تمام سادہ چیزوں میں رنگ بھرنے والا جس کا دل غم و انبساط کی انتہائی کیفیتوں سے لبریز رہتا ہے۔ قافیہ کی بیڑیوں میں جکڑا ہوا شخص۔ ایک دہمی آدمی جو کام کی بات کہتا ہے کہ تا نہیں + ڈ

الادوم = معمول = شیطان۔ الکسعر = مکار الملک (مکار بہ معنی بھڑپیا) جنٹلین = نواب ملک اڈیٹر = شاکی نامہ نگار۔ تقدیر = عذر کا نل الوجودی۔ لیڈر = ابن الوقت۔

محمد عثمان خاں۔ ایل۔ ایم۔ ایس۔

یادِ ایام

پیغمبر اسلام علیہ السلام کے مبارک عہد میں ایک معزز قبیلہ کی کسی عورت نے چوری کی اور وہ چوری معتبر شہادت نے ثابت بھی ہو گئی پیغمبر اسلام نے حسب قانونِ شرع اسکا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ چونکہ یہ عورت اک بڑے قبیلہ سے تھی اس بنا پر بڑے بڑے لوگ اس کے سفارشیں ہوئے۔ پیغمبر اسلام کو اس پر بہت طیش آیا۔ اور آپ نے ان سفارشوں کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ قانونِ خداوندی میں امیر و غریب کا کوئی امتیاز نہیں۔ خدا کے حدود سب کے ساتھ مساوی ہیں۔ پہلی متیں اسی لئے برباد ہو گئیں کہ لوگوں نے غریبوں ہی کے لئے تمام قانون نافذ کئے اور امرا کا گروہ ان قوانین کی زد سے بچا یا جاتا رہا۔ قسم ہے اس خدا کے برتر کی جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے تو اس جرم میں اس کا ہاتھ بھی اسی طرح کاٹا جائیگا۔“

(تاریخ الاسلام)

خلفائے اسلام رعایا کے معمولی افراد کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ عام لوگوں کی طرح بازاروں میں خرید و فروخت کے لئے جاتے اور سب کے ساتھ مسجدوں میں جا کر نماز پڑھتے تھے۔ بیت المال کی خود اپنے مال سے زیادہ حفاظت کرتے تھے اور اس پر بھی کہتے تھے کہ

”قیامت کے دن خلافت کی ذمہ داریوں سے ہم اگر بلا عذاب اور بلا ثواب نکل گئے تو بہت بڑی کامیابی ہے۔“

(عہد نبی امیہ میں مدینہ اسلام)

امیر المؤمنین عثمان بن عفیف العزیز کے عہد انارت میں تنول کی اس قدر کثرت تھی کہ لوگ اشرفیوں کی تھیلیاں لے کر تلاش میں نکلتے تھے اور کوئی صدقہ لینے والا فقیر دستیاب نہ ہوتا تھا۔

عہد اسلام میں والی کو ذلے اعلان کر دیا تھا کہ جس قدر مال چوری جائے وہ مجھ سے آکر وصول کر لے اس عہد میں خود کو ذلے میں (جو اس وقت شورشوں کا مرکز تھا) کوئی شخص رات کو بھی اپنے مکان یا دکان کا دروازہ بند نہیں کرتا تھا

تاجور (۲)

بزم تحقیق

ہر زبان کی شاعری میں شاعر کا ایک مخاطب ہوتا ہے جس کی خیالی صورت پیش نظر رکھ کر شاعر جذبات اُڑائی کی مشق کیا کرتا ہے۔ ہندی زبان کی شاعری میں شاعر عورت ہو یا مرد اپنے آپ کو عورت فرض کر کے اپنے محبوب مخاطب کو مرد تصور کرتا ہے۔

عربی میں شاعر مرد ہو تو عورت کو مخاطب بناتا ہے اور عورت ہو تو مرد کو فارسی کے صیغوں میں تذکرہ و تائید کا چونکا کوئی امتیاز نہیں اس لئے شاعر کا مخاطب مرد ہو یا عورت صیغہ ایک ہی استعمال ہوگا۔ اردو کے صیغے فارسی کی طرح تذکرہ و تائید سے سکت نہیں ہیں اس لئے اردو شاعری پر یہ اعتراض ہمیشہ ہوتا رہا کہ اس کے مخاطب (شاعر) اور مخاطب دونوں مرد ہوتے ہیں۔ فارسی کی خوش قسمتی دیکھئے کہ مجالس العشاق کی ناطق شہادت اور اس قسم کے جذبات

”لشکر برفت و آں بہت لشکر شکن برفت ہرگز مباد کس کردہ دل بہ شکر“

کی موجودگی میں بھی فارسی شاعری محض اپنے صیغوں کی پردہ داری کے سبب چشم نہائی سے محروم ہے۔ لیکن اردو کے پاس یہ سہارا بھی تھا اس لئے یہ ہدف ملامت بنگلی۔ اہل لکھنؤ نے چوٹی اور مانگ کے مضامین نظم کر کے فطرت نگاری کی بنیاد رکھنی چاہی تھی مگر وہ اس جرم میں اردو دنیا کے آج تک مستحب ہیں۔ میری رائے ناقص میں ضرورت ہے کہ اردو شاعری کا طریقہ خطاب عربی کے مطابق بنا کر اردو شاعری کو اس ناقابل رشک حالت سے نکالا جائے تصور اسے ایثار کی ضرورت ہے مستند سخن طراز پہل کریں تو کچھ دنوں کے بعد باقی شعرا کے نقش قدم پر چلنے لگیں گے۔

۲

اردو شاعری کے رواج سے پہلے ملک میں بھاشا کے دوہرے۔ چوبو لے وغیرہ رائج تھے۔ دلی دکنی نے جہاں بھاشا میں فارسی تراکیب، استعاسے، اور فارسی مضامین داخل کر کے اسے اردو بنایا وہاں اُس نے بلا ضرورت اردو نظم کے لئے فارسی اوزان و بحر بھی اختیار کر لئے۔ فارسی اوزان و بحر ایران کی شاعری کے لئے مناسب ہو سکتے ہیں۔ اردو شاعری تو انکی وجہ سے گرانبار پابندیوں میں دب گئی۔ فطری سادگی جو کسی زبان میں ہو سکتی ہے اُس سے اردو محروم ہے۔ تیر تقی مرحوم نے اپنی غزلیات میں جہاں بھاشا کے اوزان میں سخن سرائی کی کہ ہے فطری جذبات کی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔ سخن طراز حضرات جانتے ہیں کہ بعض وقت اردو نظم کی غیر فطری پابندیوں کی وجہ سے بہتر سے بہتر شعر کاٹ دینا پڑتا ہے۔ اگر یہ غیر ملکی پابندیاں حامل نہ ہوتیں تو آج اردو نظم میں ہر قسم کے مضامین کا بیکراں ذخیرہ موجود ہوتا۔ تو کیا اساتذہ فن اس سوال پر اپنی توجہ مبذول فرمائیں گے؟ اردو شاعری اگر بھاشا کے فطری اوزان میں ڈھلنے لگی تو اسکی ترقی کے راستے سے رکاوٹوں کا ایک ہمالیہ ہٹ جائیگا۔ اس میں تو ایثار کی بھی ضرورت نہیں صرف رہنمائی کی ضرورت ہے۔

تاجور

حصہ نظم خاموشی

ذیل کے گرائیڈ یہ اشعار ترجمان حقیقت علامہ ڈاکٹر اقبال کے خاموشیوں پر چکاں کی تراش ہیں۔ یہ اشعار علامہ موصوف نے چاندنی رات میں دریائے ٹیکرہ ہاؤس لیبرگ جرنی کے کنارے موزوں فرمائے تھے۔

خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا
”ناہور“

فطرت ہے مراقبے میں گویا

وادی کے صدا فروش خاموش

کھسار کے سبز پوش خاموش

خاموش ہے چاندنی قسم کی

شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی

تاروں کا خموش کاروان ہے

یہ قافلہ بے درا رواں ہے

کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے

ٹیکرہ کا خرام بھی سکوں ہے

اے دل خاموش تو بھی ہو جا

آغوش میں غم کو لے کے سو جا

کلام اکبر

خلقت کی مصلحت سے بہم کچھ یہ پیلا ہے در نہ ہر ایک اپنی طرف بے قرار ہے
جو ذرہ ہے یہاں اُسے اک انتشا ہے مرجع تمام خلق کا پروردگار ہے
ہر آن میں ہے شان خدائے قدیر کی ہر سمت اک صدا ہے الیک المصیر کی

رباعیات گرامی

مانگمتِ دوست از چمن مے جوئم ما بُوئے گل از دار و رسن مے جوئم
صوفی خود را بختِ جویش گم کرد ما گم شدہ را بختِ جویش مے جوئم

از غصہ بخود پیچ دوری اینست حسرت مفروش نا صبری اینست
با خود در بخود ر سیردن سہل ست بخود در خود رسی حضوری اینست

ہر سوختہ بسینہ در دے دارد دست آویزے زرنگ ز جے دارد
گر عین نمادست اثر بیماند دنبالہ ہر قافلہ گردے دارد

پھول

”پھول“ کے عنوان سے جو چند سطوروں کا (بشیر احمد عظیم صاحب کا) مضمون ہے بڑے نازک اور دل آویز خیالات کا متح ہے میں نے اس شکر کے مضمون کو نظم کا جامہ پہنا دیا ہے۔ یعنی پہلے نادر خیالات کے یہ آبدار موتی بکھرے ہوئے تھے۔ اب سلکِ نظم میں پرودے لگے ہیں۔
برقِ دہلی

پھول کیا ہیں؟ دلِ مایوس کی اُمیدیں ہیں یہ وہ الفاظ ہیں بچے ہیں شناسا جن کے

سب سے پیاری ہے یہ مخلوق، مگر ربِّ قدیر
پھونکنی بھول گیا رُوح بدن میں ان کے

ہم سے تو کرتے ہیں یہ پھول اُشائے ہی فقط
ہو کے آوارہ دامنِ فضا نگہستِ گل
آسمان اور خدائے ہیں یہ محوِ تقریر
اپنی شیرینی کی کرتی ہے دوبا لاتا شیر
مست دیتا ہے ہا کرتی ہے یوں موجِ شمیم
جس طرح ساز کے نغموں کی صدائے دلگیر

چرخِ پرتاروں میں۔ بالائے زمیں پھولوں میں
پھول ہیں مادرِ قدرت کی زبانیں گویا
نام لکھتا ہے قلمکارِ حقیقی اپنا
جن سے کرتی ہے وہ اسرارِ محبتِ نشا

پھول کیا ہیں؟ یہ ہیں دامنِ زمیں کے تارے
کیسے دلکش ہیں سنہری ہیں یہ پیارے پیارے

اس لئے کھلتے ہیں کچھ پھول کہ خنداں ہو کر
گل وہ خوشیاں ہیں جہاں کی دہ گہرائے بہد
بوئے شیریں سے معطر کریں بادِ صحرَا
جو یہ کہتے ہیں ”ہمیں بھول نہ جانا اصلا“

پھول دیتے ہیں ہمیں عیش و مسرت کا پیام
جلوہ حسن کا۔ موسیقی و نگہت کا پیام

(خیاالاتِ ماخوذ)

برقِ دہلوی۔ بی۔ اے۔ منشی فاضل

برقِ دہلوی

”حسنِ فردا“

اے جمالِ حسنِ فردا تو کہاں متور ہے؟
آشکارا تجھے سے شانِ جلوہ زارِ زندگی
تیرے جلووں میں پریشاں مایہِ صد طور ہے
گرمی ہنگامہ تیری کیسے تپش اندوز ہے!
تیرے دم سے رونقِ حسنِ بہارِ زندگی

تیری رنگینی پہ ہے قسربان ہر اندازِ گل
آہ بسکیلائے حسنِ افروز کا محفل ہے تو؟
پتہ پتہ تیرے گلشن کا نوا اندازِ قلم
خوابش اقدام تجھ بن کا دیش بے سود ہے
آشکارا جلوہ پاشی سے تری شانِ ازل
تیری صہبائے اباغِ زندگی بسر ہے
حسن بھی جس کی بلائیں لے وہ رعنائی تری
یعنی عالمِ روشناسِ زندگی تجھ سے ہوا
عشقِ حسنِ افروز مجبورِ تنہا تجھ سے ہے

تیری آمد۔ آمدِ جوشِ بہارِ نازِ گل
شامِ غربت میں چسراغِ جاوہِ منزل ہے تو
ہر گلی تیری ہم آغوشِ سرورِ رازِ قلم
تو دلِ حسرتِ فشاں کا کعبہ مقصود ہے
تیرے پہلو میں نماں ہے حسنِ پنهانِ ازل
تیری آمد۔ تو سن اسید کو ہمیز ہے
بزمِ دلِ زیرِ وزرِ برگِ دے وہ زیبائی تری
جلوہِ نور۔ منہجِ تابندگی تجھ سے ہوا
خوگرِ بیداد۔ سحرِ تنہا تجھ سے ہے

چشمِ مشتاقِ اہل کو کس قدر پیارا ہے تو!
شعبہ ہے۔ یا طلسمِ دلنشین ہے۔ کیا ہے تو؟

تو نہ ہو گراے لگاؤ آرزو! کچھ بھی نہ ہو۔
یا اترنے کو ہو سب کیفِ خمارِ زندگی
یا سپردِ کادشِ محرومیِ جاوید ہو
انبساطِ افروزِ عشرتِ کامرانی کے مزے
بازوں میں ضعف سے کچھ بھی توانائی نہ ہو
تیرے لطفِ بندہ پر در کا جہاں چرچا نہیں
اے ضیائے آفتابِ جلوہ ریزِ آرزو
اے کہ تیری شمعِ نورِ محفلِ منتاب ہے

شوقِ دل۔ حسنِ اہل۔ جوشِ نمود۔ کچھ بھی نہ ہو
عبدِ طفلی ہو کہ مہنگامِ بہارِ زندگی
دلِ گذر گاہِ سرورِ بادِ امید ہو
یا نصیبِ آرزو۔ عہدِ جوانی کے مزے
یا ہجومِ یاس سے دل میں شکیبائی نہ ہو
کوئی منظرِ اپنی ہستی کا غرض ایسا نہیں
اے نسیمِ گلستانِ اے مشکِ بیزِ آرزو
اے کہ تیری دیدِ تسکینِ دلِ بیتاب ہے

اے کہ می آری پیامِ انبساطِ اندوز را
در تو بینم دولتِ گم گشتہِ امروز را

جذباتِ عالیہ

حسرتِ موہانی

رنگ تیری شفقِ جمالی کا
لا اُبالِ مزاج یا ر کو غم
بزمِ ساقی میں دیدنی ہے سماں
آئینہ ہے تبسمِ لبِ دوست
بگڑوں میں بھی - جو ہو سحاطِ انہیں
اُس جفا کا رتم کہیں پھنچا
اک نمونہ ہے بے مثالی کا
کیوں ہو میری شکستہ حالی کا
خیمِ لبریز و جامِ خالی کا
حسنِ خواباں کی بے لالی کا
کچھ بھی اس خطرہِ خیالی کا
ذکرِ میری خراب حالی کا

کچھ تو کر پاس اے وفادارِ دشمن!
لبِ حسرت کی بے سوا لی کا



ابرِ قدوائی

وفا پروردگانِ عشق میں ذوقِ فنا پایا
نہ بھولے سے غمِ جاں کا کہ کو لبِ آشنا پایا
نہ پوچھ لے ہنشیں مجھ سے کہ دلِ یاتو کیا پایا؟
بڑھادی اور رونقِ داستانِ غم کی اشکوں نے
خدا جانے تپِ غم سے دلِ بیکس پہ کیا گذری؟
دمِ آغزِ زباں تھی بندِ چشمِ منتظرِ وا تھی
دمِ عرضِ تمنا اُس کے اندازِ تبسم سے
ترے دم سے بتِ سفاک کو تو بل گئی فرصت
تماشا گاہِ حسنِ و عشق کی اندر سے وسعت!!

جسے پایا اُسے ہم نے پرستارِ قضا پایا
دلِ غمِ دوست کو پا بندِ آئینِ وفا پایا
بتِ نا آشنا پایا دلِ غمِ آشنا پایا
کسی کو گردِ غمِ دوست کا دردِ آشنا پایا
کہ جو اشک آنکھ سے ٹپکا اُسے حسرتِ نما پایا
وہ آئے دیکھنے کو تو درِ حسرتِ کھلا پایا
کھلا اتنا کہ دل نے کچھ سراغِ مدعا پایا
ارے او مرنے والے! جانِ دیکھ تو نے کیا پایا؟
ہر اک گوشہ کو دل کے عالمِ حیرتِ فزا پایا

نہ پوچھو واقعاتِ زندگی اُس مرنے والے کے
ازل ہی سے مری تقدیر میں یہ گریہ غم ہے
کہ جس بکیں نے خاکِ گور کو راحتِ خزا پایا
محبت میں نہ میں نے ابر کچھ اسکے سوا پایا

شرف

عشق کو رو رو کے پایا بے تنہا کر لیا
تنبیخِ قاتل سے پست کر کھینچ گئی جانِ حزیں
جلوہِ جاناں بہت کھیلے میرے دل کے ساتھ
مردہ اے بلیل کہ پھولوں کی ہنسی میں راز ہے
صبح تک آنسو بہائے انتظارِ یار میں
بیخودی! میں اُس تغافلِ کیش کو کیا دوں جواب؟
کہہ گئے پردائے جل کر شمع تو ہنستی ہے کیا
اُن کے آگے اشک بھر لائے آنکھوں میں شرف!
آپ چپ کے چپ رہے۔ شکوہ کا شکوہ کر لیا

یاس

بیٹھا ہوں پاؤں توڑ کے تدبیر دیکھتا
آواز سے مجھ پر کتے ہیں پھر بند گانِ عشق
پسند آیا ہے طوقِ غلامی تو ایک دن
مجھ ناتواں کا صبر تو کیا آزمائو گے
ہوش اڑ نہ جائیں صنعتِ بہزاد دیکھ کر
پردائے کر چکے تھے سرِ انجام خود کشی
مردوں سے شرطِ باندھ کے سوئی ہے اپنی موت
شاید خدا نخواستہ آنکھیں دغا کریں
منزلِ قدم سے لپٹی ہے تقدیر دیکھنا
پڑ جائے پھرنے پاؤں میں زنجیر دیکھنا
میری طرف بھی مالکِ تقدیر دیکھنا
راس آئے تلو جو ہر شمشیر دیکھنا
آئینہ رکھ کے سامنے تصویر دیکھنا
فانوس آڑے آگیا تقدیر دیکھنا
ہاں دیکھنا ذرا فلکِ پیر دیکھنا
اچھا نہیں نوشتہ تقدیر دیکھنا

چونکے تو چشم شوق میں عالم سیاہ تھا خوابِ نظر فریب کی تعبیر دیکھنا
اصلاح کی مجال نہیں ہے تو کیا ضرور بے ربطی نوشتہٴ تقدیر دیکھنا
سرخوب و زشت آپ ہی اپنی مثال ہے حدِ کمال کا تب تقدیر دیکھنا
بادِ مراد چل چکی لنگر اٹھاؤ یا اس
پھر آگے بڑھ کے خوبی تقدیر دیکھنا

ندرت

پنی کر کسی کی بزم میں بیہوش ہو گئے آنسو ہی ہمو بادہٴ سر جوش ہو گئے
کیا دل کی سرگزشت میں لذتِ دہی کوئی افسانہٴ سن کے آپ تو خاموش ہو گئے
آخر کو بات بڑھ گئی اے اضطرابِ دل آمادہٴ فحاش لب خاموش ہو گئے
پہلے تو میرا حال سنا اہلِ حشر نے پھر اُن کی شکل دیکھ کے خاموش ہو گئے
ہم نے جہاں میں آتے ہی پی لی شرابِ غم گویا کہ آنکھ کھلتے ہی بیہوش ہو گئے
پہلے تو خوب کی دلِ گم گشت کی تلاش پھر صبر آگیا ہمیں خاموش ہو گئے
اب جوشِ آرزو دلِ مایوس میں کہاں وہ خوابِ وہ خیالِ فراموش ہو گئے
فریاد اپنی کوئی جہاں میں نہ سن سکا پکھتا کے اب ہم آپ ہی خاموش ہو گئے
پہلو تم کے سوچتے رہتے ہیں رات دن اللہ کس قدر وہ جفا کو شس ہو گئے!!
ندرت ہمارا آتی ہے بے خوف پیچھے رحمت کے بادل اب تو خطا پوش ہو گئے

غریب

موسمِ گل ہے چمن ہے آ رہی ہے بوئے دوست ہیں قفس میں لبلیس بیتاب۔ بہرِ دئے دوست
کھینچتی ہے عندلیبوں کو گلستاں کی طرف پتے پتے میں گلوں کے بس گئی ہے بوئے دوست
ذرہٴ ذرہ سے ہزاروں حشر ہوتے ہیں بسپا آسمانِ فتنہ ہے شاید زمین کوئے دوست
اے دلِ صد چاک تیری قدر اتنی بھی نہیں دستِ شانہ کھولتا ہے عقدہ ہائے موئے دوست

عرشِ اعلیٰ سے بھی اونچے ہیں کہیں اُن کے دماغ خاک میں جوں گئے افتادگانِ کوئے دوست
 بند کر آنکھوں کو دیدِ غیر سے پہلے غریب !
 جب نظر آئے گا تجھ کو چہرہ نکوئے دوست

تاجور

زبانِ حال سے کہتی ہے باغ میں شبنم
 مٹا نہ مجھ کو۔ محبت کی خود فراموشی
 ہوں ننگِ زیست کہ جاں کر سکا نہ اُپر نہ
 ہے میری سادگی عشقِ رحم کے قابل
 ہوں مثلِ سبزہ خوابیدہ وقفِ پامالی
 فریبِ وعدہ صبر آزا۔ خدا کی پناہ !!
 مالِ غنچہ خنداں پہ اشکبار ہوں میں
 کہ اپنے بھولنے والے کی۔ یادگار ہوں میں !
 کسی کے دردِ محبت سے شرمسار ہوں میں
 کہ ہوفا سے وفا کا امیدوار ہوں میں
 چمن میں رہ کے بھی بیگانہ بہار ہوں میں
 کہ ایک عمر سے پامال انتظار ہوں میں

معذرت

ہمایوں کے کسی گذشتہ نمبر میں ایک مضمون نگار کے قلم سے دو فقرے نادانستہ طور پر ایسے نکل گئے جنہیں مذہبی حلقے کے تحت میں داخل کیا جاسکتا ہے۔ بد قسمتی سے اس مضمون پر صرف بحیثیتِ صحتِ زبان ہم نے نظر ڈالی تھی۔ رسالہ شائع ہونے کے بعد ہمیں اس کا احساس ہوا کہ اس مضمون میں دو ناگفتنی فقرے بھی شائع ہو گئے۔ مذہبی چھیڑ چھاڑ کو ہم قطعی غیر منصفیہ تصور کرتے ہیں۔ آئندہ انشاء اللہ تعالیٰ کسی قسم کے دل آزار مضامین ہرگز درج نہ ہونگے۔ ہم اپنے سب مہندوستانی بھائیوں کے مذہبی جذبات کا احترام کرتے ہیں اور ہمیشہ کریں گے۔ گذشتہ فرد گداشت پر نادام ہیں اور طالبِ عفو۔

ہمایوں کے متعلق مشاہیر اہل قلم کی رائیں

جناب مولانا گرامی شاعر خاص حضور نظام۔

خدمت عالی میاں بشیر احمد صاحب بیرسٹریٹ لاؤ تسلیم۔ یکتا ہمایوں کا دوسرا نمبر مجھے مل گیا
’مکتب نمبر دو مگر بندش‘ یعنی رجسٹری شدہ۔ کیا گرامی حضرت بشیر کے ارادہ مستقیم اور طبع حلیم کی نسبت
کچھ لکھے یا حضرت تاجور فاضل دیوبندی کی عقل سلیم سے زبان قلم کو کوثر ریز کر کے
بسان تاجور در نکتہ سنجان ارجند آمد
تعالیٰ اللہ ہمایوں دیوگیر و دیوبند آمد

تہی مایگان باطل پرست کو ہمایوں نے سرنگوں کر دیا۔ ادبی اور اخلاقی رسالے میری نظر
سے بہت گزرے بجائے خود بہت اچھے ہیں انصاف یہ ہے کہ اس مجلس میں ہمایوں کے سوا
کوئی دوسرا میر مجلس ہو نہیں سکتا ہے ہر یکے را در خور آں دادہ اند
بادہ رامستی و گردش جام را
و اسلام گرامی

جناب نواب ذوالقدر جنگ بہادر ایم لے بیرسٹریٹ لاؤ ہم بیکری حضور نظام
مکرمی۔ ہمایوں کا کیا کتنا۔ آب و تاب میں مضامین کی بندی اور پاکیزگی میں اپنی آپ نظیر
ہے۔ اگر رسالہ کا انتظام آپ ہی کے سپرد ہا اور اہل قلم ماضین اور مضامین کے انتخاب میں ہی
احتیاط مد نظر ہی تو یہی ایک رسالہ ہو گا جو انگلستان کے مشہور رسالوں کا ہمسر ثابت ہو گا۔
خاکسار۔ ذوالقدر جنگ

شیخ فیروز الدین صاحب مراد ایم۔ ایس۔ سی۔ پرنسپل طبیعات علیگڑھ کالج۔
ہمایوں پہنچا۔ خدا سے دیر تک زندہ رکھے اور کامیاب ہو۔ مجھے اردو کے رسالوں پر کچھ اعتبار

نہیں رہا۔ وہ بے معنی کارہ باری معاملے ہوتے ہیں جن میں فقط تخیل کی زیاں کاریاں نظر آتی ہیں اکثر رسائل پر ان اعتراضات کا اطلاق ہوتا ہے لیکن ہر تکلیف مستثنیات رکھتا ہے۔ میں نے اب ہمایوں دیکھا ہے اور میں خوش ہوں کہ ہمایوں کے ایڈیٹر اردو ایڈیٹروں کی اس جماعت اکثرین میں سے نہیں ہیں جو کام کم کرتے ہیں اور باتیں زیادہ بناتے ہیں۔ توسیع اردو اور ترویج سائنس یہ ہے میرا منہائے کمال۔ اپنے مشاغل سے فارغ ہو کر ان کی توجہ مبذول کرنا میرے لئے باعث مسرت ہے۔ دو ماہ کے بعد میں انشائرسٹرٹ پر طبع ہمایوں کی قلمی کے لئے تیار ہوں گا۔

فیروز الدین

جناب مرزا اعجاز حسین صاحب اعجاز دہلوی۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی
ہمایوں کا پہلا نمبر مجھے مل گیا اناشاء اللہ بڑی آب و تاب سے نکلا ہے میں آپ کو اور لائق مدیر کو اس پرچہ کی خوبی ظاہر و باطن پر تہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔ میں بھی انشائرسٹرٹ ہمایوں کی خدمت میں کوئی نظم یا شریٹش کر دوں گا۔

خاکسار اعجاز حسین

جناب پنڈت میلاد رام صاحب دفاتر و فیسیں شریٹش نیشنل کالج و سابق ایڈیٹر منڈے ماترم۔
عنایت فرمائے دفاتر اخبار میاں صاحب تسلیم

رسالہ ہمایوں پہنچ رہا ہے اس عنایت کا تہ دل سے ممنون ہوں ارادہ ہوا تھا کہ پہلے نمبر پر اپنی ناچیز رائے کا اظہار کروں لیکن اس کے ظاہر و باطنی محاسن کو دیکھ کر جن کی نظیر سے پیشتر میں میری آنکھیں نا آشنا تھیں یہ خیال آیا ایسا نہ ہو رسالہ کے اگلے نمبر میری رائے کی تردید کر دیں ماب چونکہ دوسرا نمبر دیکھا ہے تو خود میرے اس خیال کی تردید ہو گئی ہے۔ دوسرا نمبر پہلے سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ایسا رسالہ اردو زبان میں آج تک جاری نہیں ہوا آپ کو جو مضمون نگار ملے ہیں ان کی وجہ سے اگر تمام اردو رسائل ہمایوں کو رشک کی نگاہوں سے دیکھیں تو مقام تعجب نہیں اگر ان اصحاب کے مضامین دلپذیر سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو خود ایڈیٹریل حصہ بھی اس امر کی ناقابل تردید شہادت پیش کر رہا ہے کہ ہمایوں واقعی آپ جیسے حطر طراز ادیب اور بلیغ الملک علامہ تاجور جیسے فاضل جادو نگار کے زیرِ ادارت ہے، حضرت

بلغ الملک نے اردو زبان کی جو خدمات خصوصاً پنجاب میں سرانجام دی ہیں وہ اہل مذاق کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ رسالہ مخزن کو دوبارہ آنریبل خان بہادر شیخ عبدالقادر کے زمانہ کی سطح پر لانا انہی کا کام تھا۔ رسالہ ہمایوں میں علامہ کا شریک ادارت ہونا واقعی اس کی بلند آخری کی روشنی میں ہے۔ کلام ہمایوں پر علامہ نے جو دو تنقیدیں دی ہیں وہ اس فن میں ایک نیش قیمت اور مستقل اضافہ ہے۔ بہر حال اس میں کچھ شبہ نہیں کہ دنیا کے اردو کا ماضی و حال ہمایوں کی نظیر پیش کرنے میں یقیناً عاجز ہے۔

نیاز کش میلارام وفا

جناب سید سجاد حیدر صاحب یلدرم بی۔ اسے رجسٹر اسلام یونیورسٹی۔

ہمایوں مجھے اس قدر پسند آیا ہے کہ میں نے اس کا باقاعدہ فال رکھنے کا ارادہ کر لیا ہے۔

خاکسار سجاد حیدر

جناب آنریبل ڈاکٹر تیج بہادر سرہو ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ ڈی وزیر قانون حکومت ہند ابھی مجھے ہمایوں کا دو سرائز نہیں ملا پہلا نمبر میں نے نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔ اور میں اس کے اجراء پر دوبارہ مبارکباد دیتا ہوں۔

آنریبل مشرطیفی آئی سی۔ ایس سکریٹری محکمہ تعلیم صوبہ پنجاب

ہمایوں کے مطالعہ سے میں نے بہت لطف اٹھایا اور میں آپ کو اس کی ظاہری و باطنی خوبیوں پر مبارکباد دیتا ہوں مجھے یقین ہے کہ لوگ اس کے مطالعہ سے بہت فائدہ حاصل کریں گے ڈاکٹر ڈی۔ بی سپونریل ایل ڈی (محکمہ عمارات قدیم حکومت ہند) جنہوں نے بہت سی اردو و غول کا انگریزی نظم میں ترجمہ کیا ہے اپنے خط میں فرماتے ہیں۔

ہمایوں پہنچا۔ مجھے بے انتہا پسند آیا۔ وہ ہر حیثیت سے قابل تفریق ہے، اور مجھے آپ سے ایسی ہی امید تھی۔ میں بہت خوش ہوں کہ آخر آپ نے میدان صحافت میں قدم رکھنے کا ارادہ کیا ہے جہاں ایک نہایت مفید خدمت سرانجام ہو سکتی ہے، میں امید کرتا ہوں کہ ہمایوں کو وہ کامیابی نصیب ہوگی جس کا وہ مستحق ہے۔ جب ہمایوں پہنچا تو میں عربی لفظ بشیر پڑھ رہا تھا اس نیک فال سے میرے دل کو یقین ہو گیا کہ ہمایوں ضرور کامیاب ہوگا۔

جناب لاکھنؤ رسین صاحب بیرسٹر ایٹ لاچفمن جج جموں۔

میں بہت ممنون ہوں کہ آپ نے رسالہ ہمایوں کا پہلا نمبر مجھے بھیجا۔ میں نے رسالہ پڑھا اور اسے

فہرست مضامین بابت ماہ اپریل ۱۹۲۲ء

جلد ۱	حصہ نثر	حصہ نظم	نمبر
مضمون	صاحب مضمون	مضمون	صاحب مضمون
۱	انعامی مضمون	۵۷	کلام اکبر
۲	ایڈیٹر	۵۷	بسان العزم مولانا اکبر رحیم
۳	"	۵۷	رباعیات گرامی
۴	"	۵۷	حضرت گرامی اُستاد حضور نظام
۵	"	۵۷	آصف الدولہ کا مقبرہ
۶	"	۵۷	جناب پنڈت برج نرائن صاحب کی
۷	"	۵۷	ایڈیٹر صبیح امید
۸	"	۵۷	قطعہ
۹	"	۵۷	مولانا احمد علی صاحب شوق قدوائی لکھنؤ
۱۰	نشاط باغ	۵۷	سفر عدم کی اطلاع
۱۱	بشیر احمد	۵۷	جناب زرخ - ش - صاحب رحوم
۱۲	نشاط باغ	۵۷	جذبات عالیہ
۱۳	سائنس اور جنگ	۵۷	جناب پنڈت مظلوم الدین صاحب ایم - ایس سی
۱۴	تحقیق الاسندہ	۵۷	مولانا قیصری
۱۵	ہندوستان کی تعلیم	۵۷	راجہ مہر نرائن صاحب رئیس تادلی
۱۶	تحریر خیر	۵۷	منشی پریم چند
۱۷	بے صبروں کا دوزخ	۵۷	"زندہ دوزخ"
۱۸	ٹیلیفون اور ہمزاد	۵۷	مصور فطرت خواجہ حسن فاضل آبادی
۱۹	متوالے	۵۷	میل عبدالعزیز صاحب ایم اے قسطنطنیہ
۲۰	نغات الحجابین	۵۷	یاران بزم
۲۱	مختل ادب	۵۷	ایڈیٹر
۲۲	۱	۵۷	حضرت گرامی اُستاد حضور نظام
۲۳	۲	۵۷	ڈاکٹر مرزا محمد ہادی صاحب پی ایچ ڈی
۲۴	۳	۵۷	جناب عبدالحی صدیقی (علیگ)
۲۵	۴	۵۷	خان بہادر چودھری نوشی محمد صاحب ناظر گورکھپور
۲۶	۵	۵۷	جناب سید وحید الدین صاحب بنو دہلوی
۲۷	۶	۵۷	تاجور
۲۸	۷	۵۷	تقریقات
۲۹	۸	۵۷	ایڈیٹر
۳۰	۹	۵۷	رایٹس

ہمایوں کی جانب سے ستورپے

کا

انعامی مضمون

اُردو رسالوں میں غالباً ہمایوں سب سے پہلا رسالہ ہے جسے حالات کی مساعدا نے یہ موقعہ دیا ہے کہ وہ اہل قلم کو بیگاری کے درجہ سے بالاتر سمجھے۔ اسی لئے اسکے پہلے نمبر میں یہ عام اعلان کر دیا گیا کہ جو پرمغز و پرمعلومات اچھوتے مضامین محنت و کاوش سے لکھے جائینگے۔ صاحب مضمون کے ایسا پرائز کا معقول معاوضہ پیش کیا جائیگا۔ اسی سلسلہ میں اب یہ تجویز کیا گیا ہے کہ ذیل کے اہم عنوان پر انعامی مضامین لکھوائے جائیں۔

اُردو ہندوستان کی ملکی زبان کیونکر بن سکتی ہے؟

(۱)۔ سب سے بہتر مضمون پر جو منصفوں کی رائے میں ولایت کے معیار پر پورا اترے ہمایوں کے سرمایہ سے ساٹھ روپے اور اسی حیثیت میں دوم نمبر کے مضمون پر چالیس روپے بطور انعام پیش کئے جائینگے۔

(۲)۔ اور اگر مضامین میں سے مقرر کردہ معیار پر کوئی بھی پورا نہ اترے مگر ان میں بعض مضامین مفید اور جاوید توجہ ثابت ہوئے تو اول دوم پر انعام کی مقدار منصفوں کی رائے پر مقرر کی جائے گی۔

(۳)۔ تمام مضامین ایک کمیٹی میں پیش ہونگے۔ جسکے ایک رکن آرنیبل خان بہادر شیخ عبدالقادر زلی۔ اے۔ باریٹ لانج ہائیکورٹ پنجاب ہونگے باقی دو ہمایوں کے دونوں اڈیٹر۔

(۴)۔ مارچ کا ہمایوں چھپنے کے بعد سے تین ماہ تک مضامین کا انتظار کیا جائیگا۔ یہ سہ ماہی مدت اس لئے تجویز کی گئی ہے تاکہ زیادہ غور و مطالعہ کے بعد مضامین پرمغز و پرمعلومات اور مدلل پیرایہ میں لکھے جائیں۔

(۵)۔ مضامین فلسفیک سائنس کے زیادہ سے زیادہ تیس درجہ سے کم درجہ صفحات پر ہونے چاہئیں۔ (تاجور)

ضروری اطلاع:۔ جنوری کے پرچے کے لئے اتنی فراہمیں بھی ہیں کہ پرچہ غریب دوبارہ چھپانا پڑیگا۔ جن اصحاب کو ضرورت ہو جلد اطلاع دیں سالانہ خریداروں کے علاوہ دوسروں کے لئے اس پرچے کی قیمت ۱۸ روپے ہوگی۔
میں بھر
ناظرین! سرورق کی مشکوٰۃ مزاجی ریوے ستر ایک کی وجہ سے ہے! میں بھر

بزمِ ہمایوں

بعض باندق حضرات لکھتے ہیں کہ ہمایوں میں لکھنے کو جی تو چاہتا ہے مگر مضمون کی تلاش میں دماغ پریشان ہے! عنوان نہیں سوچتا، طبع زامضامین لکھنے والوں کے لئے تو اس تلاش کی جستجویں آوارہ پھرنا بے معنی ہے۔ جس وقت طبیعت حاضر ہو اپنے دل کی حالت کو بیان کر دینا کافی ہوتا ہے۔ دنیا کے کسی کام یا انسان کے کسی شغل کے متعلق بلا کم و کاست اپنے حقیقی خیالات کو سیدھی سادھی زبان میں بے تکلف طور پر ادا کر دینا معراج انشا ہے البتہ یہ دولت کم لوگوں کو نصیب ہے؟

لیکن علم و تاریخ یا زبان و ادب کے متعلق اپنی یا دوسری مایہ دار زبانوں کے چمن سے گلچینی کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اس میں عنوان نہ سوچنے کی دشواری جاتی رہتی ہے +

اگر آپ علوم جدیدہ کے مطالعہ سے حظ اٹھاتے ہیں تو ان علوم کے ایسے شعبوں کی طرف توجہ کیجئے جو زیادہ دلچسپ و سبق آموز ہوں، ہر ایسے موضوع پر جسے آپ انتخاب کریں اک چھوٹا مقدمہ لکھیے جو غیر ماہر لوگوں کو اس علم کے بہت سے مبادیات سے آگاہ کرنے پھر انہیں زیادہ ادق مطالب کی طرف متوجہ کیجئے لیکن اس طرح کہ تحریر کی دلکشی و وقت مضمون کو چھپائے رکھے اور پڑھنے والا اسی دھوکے میں رہے کہ یہ ادبی مضمون ہے! مستقل تصنیف کے لئے اتنی ادبیت کی ضرورت نہیں +

تاریخ کے ضمن میں ہجائے اس کے کہ واقعات اور تاریخوں کا انبار جمع کر دیا جائے یہ ضروری ہے کہ پڑھنے والے کو اس خاص وقت کے ماحول میں لے جایا جائے اور وہ محسوس کرنے لگے کہ میں کسی دور دراز ملک میں حقیقت کی نگاہوں سے سیر کر رہا ہوں، کسی ملک کی مختصر تاریخ بیان کیجئے تو اس طرح کہ سننے والا اپنے سینے ایک ہوائی جہاز میں بیٹھا ہوا ستور کر رہے جہاں نگاہ جلد ایک وسیع خطہ زمین کو عبور کرتی چلی جاتی ہے، اردو میں یہ یکی شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے کہ دنیا کی مشہور تحریکات ہر ایک نظر غائر ڈالی جائے اور تاریخ انسانی پر اس کے اہم نتائج کا اندازہ کیا جائے لیکن اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھنے والا تاریخی مضمون کسی پر عظمت شخص کی سیرت کا صحیح صحیح خاکہ کھینچنا ہے۔ اس فن سے بہت کم لوگ آگاہ ہیں بلکہ اس کی سود مندی کا احساس بھی شاذ و نادر پایا جاتا ہے +

جہاں نما

چین کا مستقبل چینی سفیر (لندن) چاؤرسن پو جنوری کے ایشیاٹک ریویو میں لکھتے ہیں ”وہ شے جسکی آج چین کو اشد ضرورت ہے انصاف ہے۔ انصاف ہی سے وہ تمام گورکھ دھندے دور ہو سکتے ہیں۔ جنہیں ”حقوق خاص“ اور ”حلقہ اثر“ کہا جاتا ہے۔ بلاشبہ چین کے ساتھ انصاف برتنے سے نہ صرف مشرق اقصیٰ کا امن قائم رہیگا بلکہ ساری دنیا چین سے زندگی بسر کریگی۔ مختصر یہ کہ چین میں امن ہونے اور چین کے ساتھ انصاف کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا بھر کو تجارت کا یکساں موقع ملے گا اور مشرق بعید میں ڈائی سکون نظر آئیگا۔ چین کے مالی حالات بحیثیت مجموعی درست اور تسلی بخش ہیں۔ چین کا اندرونی و بیرونی قرضہ ایک بلین ڈالر ہے۔ چالیس کروڑ نفوس پر پھیلانے سے اس کی اوسط ۲۱/۲ ڈالر (یا تقریباً ۲ روپے) فی کس بڑھتی ہے۔ ٹیکس چین سے کم مشکل ہی کسی اور ملک میں ہوگا یعنی فی کس ۱۱/۲ ڈالر۔ انگلستان میں ٹیکس کی اوسط تیس پونڈ فی کس ہے +

دور آمد محصولات کے معاملے میں چین کو مطلق آزادی نہیں۔ اس کے ہاتھ ان معاہدوں کی زنجیروں سے جکڑے ہوئے ہیں جو دولِ عظمیٰ نے اُس کے ساتھ کئے ہیں اور جن کی رو سے یہ محصول غیر ممالک کے مال پر فیصدی سے زائد نہیں بڑھایا جاسکتا۔ اس سے بڑھ کر بے انصافی کیا ہوگی کہ چین کو اس معاملے میں آزادی نہ دی جائے اور یہی وجہ ہے کہ گورنمنٹ کے بحث میں ہر سال اتنا گھانا نظر آتا ہے چین حق بجانب ہے اگر اپنی مالی حالت کو بہتر کرنے کی غرض سے وہ دولِ عظمیٰ سے ان محصولات میں اضافہ کرنے کی اجازت چاہے۔ واشنگٹن کانفرنس میں چین کے نمائندوں نے کہا کہ چین کو کم از کم ساڑھے بارہ فیصدی تک محصول لگانے کا حق عطا کیا جائے +

مسٹر پو چین کی مالی قوت کا اندازہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ چین کا شرح مبادلہ زمانہ قبل جنگ سے بہتر ہے اور اُس کا شمار ان چند در چند ممالک میں ہے جہاں کاروبار میں دھات کے سکے چلتے ہیں اور کاغذ کے پرزے مطلق نظر نہیں آتے +

(ج)

علمی شعاعیں

حبشی سیاہ کیوں ہیں؟ اس لئے کہ قدرت رنگ کے ذریعے سے جلد کی حفاظت کرتی ہے۔ روشنی کی شہ بنفشی کرنیں جو نظر نہیں آتیں سرسام لگروں اور امراض جلد کا باعث ہوتی ہیں۔ زرد یا سیاہ رنگ کا پردہ انہیں اپنا عمل کرنے سے روک دیتا ہے۔ انسانی جسم میں جلد کے نیچے ایک مادہ ہوتا ہے جسے کریموگن کہتے ہیں۔ جب شہ بنفشی کرنیں اس پر پڑتی ہیں تو وہ رنگ بن جاتا ہے۔ اس رنگ کے چار درجے ہیں۔ زرد (سفید تو میں) گہرا زرد (چینی اور جاپانی) سرخ زامرک کے اصلی باشندے اور بادامی دھند ستانی اور حبشی) ہمارا رنگ بھی اک معنی رکھتا ہے۔

بال اور سیرت۔ یہ بات طبعی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ ہر شخص کے بال اس کی اصل ونسل اور اس کی سیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ جس صورت میں اس کے بال اگتے ہیں اور جس طرف کو بڑھتے ہیں اس سے اس کے اعمال کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شخص آج کل کیا کر رہا ہے۔ اس کی عادات اور اکثر اس کے خیالات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ غلین طبع لوگوں کے بال عموماً سیدھے اور باریک ہوتے ہیں۔

ماہانہ مدت۔ انگریزی مہینوں میں دنوں کی تعداد شروع میں اس قدر حافظہ پر بار ڈالنے والی تھی جیسی کہ اب ہے جو لٹس سیزر کے حکم سے جفت مہینوں (جنوری۔ مارچ۔ مئی۔ جولائی۔ ستمبر اور نومبر) کے اکتیس دن قرار پائے اور باقی ماندہ کے تیس۔ سو اٹھ فروری کے جس کے عام سالوں میں اکتیس دن ہوتے تھے اور ہر چوتھے سال تیس۔ جب آگسٹس سیزر روما کا شاہنشاہ ہوا تو اس کی خود پسندی سے یہ نہ دیکھا گیا کہ جولائی مہینے جو لٹس سیزر کے نام پر ہے اکتیس دن ہوں اور اگست جو شاہنشاہ کی یادگار ہے صرف تیس دن کا ہو + بیچاری فروری سے ایک اور دن چھین کر اگست کو دیا گیا اور ستمبر اور نومبر کی بجائے اکتوبر اور دسمبر کو اکتیس دن دیئے گئے تاکہ اکتیس دن کے تین مہینے یکساں نہ ہونے پائیں۔

امریکہ اور کولمبس۔ امریکہ کو کولمبس نے دریافت کیا۔ پھر اُس کا نام بجائے امریکہ کے کولمبیا کیوں نہ رکھا گیا؟ میجر جو نقشہ کشی کا ایک ماہر فن ہے اس علمی ستم روائی کی کمافی یوں بیان کرتا ہے: سنی ۱۵۷۷ء میں کولمبس کی وفات کے عین ایک سال بعد ایک ڈچ مارٹن والد سی مرن نامی نے ایک کتاب لکھی جس میں ضمیمہ کے طور پر امریکس و سپوچی کے چار امریکی سفروں کا ذکر کیا گیا۔ اس کتاب میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ نئی دنیا کا نام امریکہ رکھا جائے کیونکہ مُصنّف کے نزدیک و سپوچی ہی نے پہلے پہل امریکہ دریافت کیا۔ ۱۵۷۷ء میں ایک گنم تصنیف ”کرہ ارض“ میں یہ نام اس طرح لکھا گیا کہ یا علمی حلقوں میں مشہور ہو چکا ہے + لینار دود و دسنی ایک اطالوی نقاش نے ۱۵۷۷ء میں جو نقشہ دنیا شائع کیا اُس میں امریکہ کا نام شمالی و جنوبی براعظم دونوں پر لکھ دیا + نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ڈچ مُصنّف اور ایک اطالوی نقاش کی خیالی قلم کاریوں نے کولمبس کو اپنی علمی کوششوں اور دقتوں کا ثمرہ نہ ملنے دیا +

ستارے کیوں ٹٹماتے ہیں؟ کسی رات کو جب مطلع صاف ہو ہم دیکھتے ہیں کہ بعض تارے چمکتے ہوئے ٹٹماتے ہیں لیکن بعض فقط چمکتے ہیں اور اُن کی روشنی ذرا جنبش نہیں کرتی + چمکنے والے تارے سیارے ہیں جو ہماری زمین کی طرح گردش کرتے ہیں۔ اور ٹٹمانے والے تارے اصلی تارے ہیں جو سورج کی طرح ساکن ہیں اور اُن میں بہت سے ہمارے نیزِ اعظم سے بھی زیادہ بڑے ہیں + سیارے صرف چمکتے ہیں لیکن ٹوا بت ٹٹماتے بھی ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا سبب ہماری فضا کی نمی ہے۔ یہ غلط ہے کیونکہ اگر ایسا ہو تو سیارے بھی کیوں ٹٹماتے نظر نہ آئیں؟ ٹٹما ہٹ کے دو اسباب ہیں بڑی وجہ یہ ہے کہ ٹٹمانے والے تارے سیاروں کی نسبت بہت زیادہ بعید فاصلے پر واقع ہیں۔ فضا میں لاتعداد ایسے چھوٹے بڑے اجسام ہیں جو ادھر ادھر گھومتے رہتے ہیں۔ ان تاروں کی روشنی ان رکادوں سے ہو کر گذرتی ہے تو زمین تک پہنچ کر ٹٹماتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سیارے صرف سورج کی روشنی کا عکس دلاتے ہیں لیکن ٹوا بت اپنی ہی روشنی کے ساتھ شعلہ بریزتے ہوتے ہیں جو کبھی زیادہ ہوتی ہے اور کبھی کچھ کم +

جیب کتروں کی روزی بند۔ ایک موجد نے جیب کتروں سے بچنے کے لئے ایک جیبی ایلام

بنایا ہے۔ بجلی کی تارکپڑوں میں سی دئے جاتے ہیں۔ جونہی کوئی جیب کترا کچھ چرانے کے لئے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالتا ہے چارنھی تھمیں شعاع ریز ہوتی ہیں اور یہ روشن ہو جاتا ہے کہ جیب میں کوئی اجنبی ہاتھ اپنا کام کر رہا ہے +

نظری توانائی۔ کوئی شخص ٹکلی لگا کر ہماری طرف دیکھے تو ایک ناقابل برداشت احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے کو دیکھنے والوں میں ایک شخص جلد اپنی نگاہ ہٹالیا کرتا ہے + ڈاکٹر چارلز روس ایک مشہور ماہر علم الجبرائیم نے ایک آلہ ایجاد کیا ہے جس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ انسانی آنکھ میں ایک غیر مرئی توانائی ہے جس کی طاقت ساکن اشیاء میں حرکت پیدا کر سکتی ہے + اس کا خیال ہے کہ غالباً روشنی میں کوئی ایسی شعاع ہے جس کا انعطاف یا اجتماع قوت پذیر ثابت ہوتا ہے +

وہ اور ہم۔ انگلستان کی (۱۹۱۱ء کی) ۳۱ کروڑ آبادی میں تعلیم پر ۱۶ کروڑ پونڈ سے زائد خرچ ہوتا ہے۔ ہندوستان میں صرف ۵۶ لاکھ پونڈ (آٹھ کروڑ سے زائد روپیہ) دوسرے لفظوں میں یوں کیئے ہندوستان کی آبادی تقریباً انگلستان سے آٹھ گنا ہے لیکن انگلستان میں تعلیم کا خرچ ہندوستان سے بارہ گنا سے بھی زائد ہے +

شکسپیئر یا ہندوستان؟ لندن میں ایک شکسپیئر لیگ قائم ہوئی ہے جس کا مقصد شکسپیئر کی تصنیفات میں غلطیوں کی اصلاح کرنا اور اس کے ڈراموں کے شاندار اڈیشن چھپوانا ہے۔ اس تحریک میں صرف علما ہی شامل نہیں بلکہ اکثر عام لوگوں کو بھی اس سے گہری دلچسپی ہے + کارلائل کا تو یہاں تک خیال تھا کہ اگر اہل انگلستان سے پوچھا جائے کہ تم ہندوستان کا چھن جانا گوارا کرتے ہو یا شکسپیئر کا تو وہ بلا تامل جواب دیں گے کہ ہندوستان کا اس کی وجہ یہ ہے کہ شکسپیئر قدرت کا عطیہ ہے انگلستان کو اور ہندوستان کا حصول فطرت کی کارگذاریوں کا نتیجہ ہے +

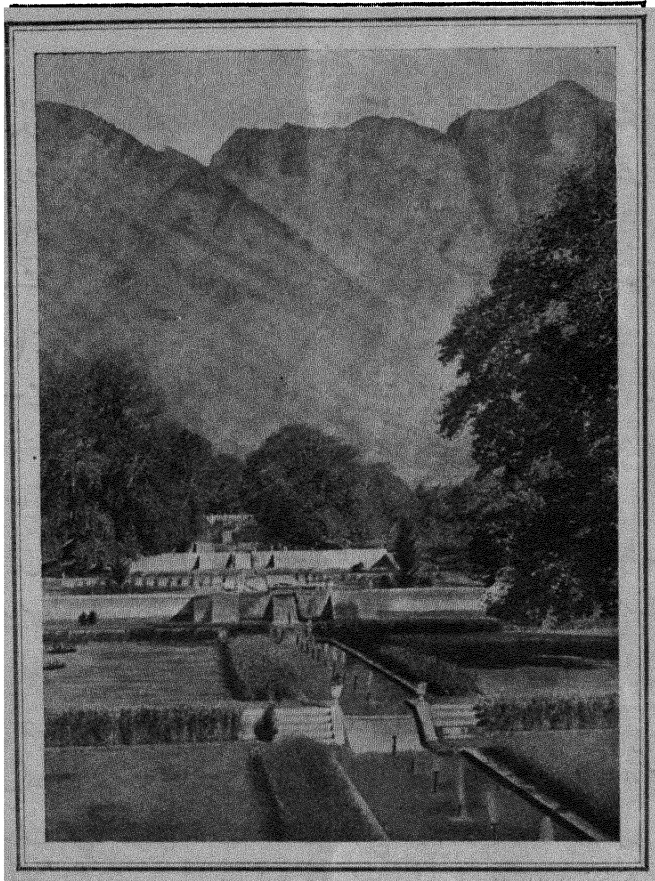
نسوانی دنیا

حکومتِ روس نے مردوں عورتوں کی برتری و کمتری کا سوال حل کر دیا ہے، ”جیسا کام دیسے دام“ کا اصول دونوں پر عائد ہوتا ہے۔ حکومت کے تمام درجے عورتوں مردوں کے لئے یکساں طور پر کھول دئے گئے ہیں، عورتوں کو خانگی امور کے بارگراں سے رہائی دینے کے لئے حکومت نے ”نادریت“ کو ایک معاشرتی کام تسلیم کیا ہے اور حاملہ عورت کی نگہداشت کو اپنے ذمے لے لیا ہے۔ ننھے بچے کی تعلیم و تربیت کا انتظام بھی کیا جاتا ہے، بچے کی پیدائش سے آٹھ ہفتے پہلے اور آٹھ ہفتے بعد میں عورت کے لئے کام کرنا ضروری نہیں اور اُسے سرکاری طور پر پوری تنخواہ اور ۲۵ فیصدی زائد رقم دی جاتی ہے، ایامِ حمل میں عورت کو زیادہ مقررہ خوراک لینے کا حق ہے۔ اور زچگی کے سب اخراجات کی ذمہ دار بھی حکومت ہوتی ہے، اس کے علاوہ بہت سی پردرش گاہیں ہیں جہاں ایک ماں بغیر فکر و تردد کے اپنا بچہ چھوڑ کر روزی کمانے کے لئے جاسکتی ہے، عورتوں سے جنگی کام نہیں لیا جاتا۔

ناروے میں عورتوں کا ایک اخبار لوزر کوئڈر ہے جس کی مالک و مدیرہ ایک عورت ہے اور اُس کے اغراض و مقاصد نسوانی ترقی پر مشتمل ہیں، اُس کی اشاعت بارہ ہزار ہے اور وہ ہفتہ میں دو بار چھپتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ ناروے کی آبادی صرف ۲۶ لاکھ ہے۔ ہندوستان میں پندرہ بیس کروڑ شخص اردو بولتے یا سمجھتے ہیں۔ کیا سب نسوانی پرچوں کی اشاعت مل ملا کر اس سے نصف بھی ہوتی ہے؟ ہندوستان کی دوسری زبانیں بھی اس مقابلے میں خاموش نظر آئیں گی۔

انگلستان میں قیدی عورتوں کی تعداد میں بہت کمی واقع ہوئی ہے۔ چند سال ہوئے عورتوں کے لئے ایک تنہا قید خانے تھے آج کل صرف پچیس ہیں۔

(ب)



نشاط باغ (کشمیر)

نشاطِ باغ

(کشمیر)

مغلوں کی عمارتیں اُن کے تمدن کی متانت ہیں اور اُن کے باغ اُن کی شان و شوکت کا تبسم! وہ محبوب بادشاہت جس کی سطوت کا چارواگ عالم میں ڈنکا بجاتا تھا لیکن جس کی عظمت کا نشان اب خاک پر سرنگوں ہے کیا تھی؟ ہند والوں کے دل میں اُس کی محبت کا سکہ کیونکر بیٹھا؟ اُس کی فلاح و شہادت کے کیا اسباب تھے؟ اس کا اندازہ کسی ہندوستانی کے اُداس چہرے سے کیجئے جب وہ اک پرانی مغلیہ عمارت یا باغ کی سیر کر رہا ہو!

عمارت میں داخل ہوتا ہے تو ملک و قوم کی مُردہ عظمت اُس کے دل پر اک کا لی گھٹا کی طرح چھا جاتی ہے اور اُس کے مُنہ سے بے اختیار آہ نکلتی ہے کہ یہ ہیں اُن لوگوں کے کارنامے جو کبھی ہمارے درمیانِ خلوص و شفقت کے ساتھ حکومت کرتے تھے!

باغ میں جا نکلتا ہے تو اُس شائستگی کی یاد اک لہر بن کر جی میں اٹھتی ہے جو فطرتِ انسانی کو قدرت کے حُسنِ معصوم کے ساتھ وابستہ دیکھنا چاہتی تھی اور جس کے عیش و عشرت کا کمال ہمیشہ مناظرِ کوہ و دشت کو اپنے شامل حال رکھتا تھا۔

کس قدر بلند ہمت تھے وہ لوگ اور کتنی صاف و پاکیزہ تھیں اُن کی نیتیں! کہاں کہاں جا بیٹے اور کس کس محل کو دیکھئے؟ کون کون سے باغ کی سیر کیجئے اور کس کس آبشار کے پاس بیٹھ کر رو بیٹے؟ اُن کی نُسرت کے سامان ہر طرح سے ہمارے لئے غم افزا ہیں! البتہ مغلیہ یادگاروں میں نشاطِ باغ ضرور اک ایسی یادگار ہے جو حقیقت میں نشاطِ انگیز ہے!

یہ باغ کشمیر کے دارالسلطنت سری نگر کے قریب مشہور ڈُل جھیل کے مشرقی کنارے پر ساحلی پہاڑوں کے دامن میں واقع ہے۔ وہ سڑک جو جھیل اور باغ کے بیچ میں حائل ہے مغلوں کے وقت میں موجود نہ تھی اور باغ کا باب داخلہ ٹھیک جھیل کے کنارے پر تھا۔

زمین کے کاریگروں نے اس رشکِ جنت گلشن کو آسمان کے بارہ برجوں کی رعایت سے بارہ تختوں میں تقسیم کیا ہے۔ جمیل میں اپنی کشتی کو کھیتے ہوئے باغ کے قریب آئے تو بارہ درے کے آگے ایک تختہ دوسرے تختہ سے زیادہ بلند ہوتا ہوا پہاڑ کی طرف چلا گیا ہے۔ باغ کا احاطہ ۵۹۵ گز لمبا اور ۳۳ گز چوڑا ہے اور اس کے بارہ تختے ہیں۔ نیچے کے گیارہ تختے ایک دوسرے سے تھوڑی بلندی پر واقع ہیں لیکن بالائی تختہ جو صرف بیگمات کے لئے مخصوص ہوتا تھا۔ نیچے کے تختے سے اٹھارہ فٹ اونچا ہے۔

باغ کی سیرابی کے لئے پچھلے پہاڑوں سے ایک نہر آتی ہے جو بالائیں حصے میں داخل ہو کر ایک تختے سے دوسرے تختے میں دلکش آبشاروں کی صورت میں گرتی اور تالابوں کو لبریز کرتی ہوئی باغ کے عین بچوں بیچ بہتی ہے۔ منگولوں نے جہاں کہیں اپنی عشرت گاہیں بنائیں قدرت کے حسنِ زواں کو ضرور شادابی و شادمانی کا سرمایہ دار بنالیا۔ ان کی منظر آرائی ہمیشہ پانی کی پیاسی رستی تھی۔ سب سے اوپر کے حصے سے ایک آبشار سانپ کی سی لہرائی لکیروں میں سے ہوتا ہوا ہلکی آواز کے ساتھ نیچے کے تالاب میں جا گرتا ہے جس کے متموج کناروں پر بیٹھ کر جمیل کا نظارہ کرنا حقیقت میں فردوسِ نگاہ ہے۔ ہر آبشار کے سر پر سنگِ مرمر کی ایک تختِ نمائشست گاہ ہے جہاں دیکھنے والے کی نگاہیں گرتے ہوئے پانی کی آوازیں غرقِ نظارہ ہو جاتی ہیں! پرانے زمانے میں نہر کے دونوں طرف سردکی تھانیں تھیں اور ان کے عقب میں میوہ دار درخت۔ دیواروں پر گلآب کی پیچ در پیچ بیلین بوستانی زیبِ زینت تھیں اور گلزاروں میں زگس دیاسمن اور سرسبز نسترن کی بو قلمونیاں جلوہ آرا!

نشاطِ باغ شاہی باغ نہ تھا۔ اس کا مالک شاہجہان کا نضر آصف خاں تھا جو بادشاہ کا وزیرِ اعظم بھی تھا۔ بیان کرتے ہیں کہ ۱۶۳۳ء میں جب شاہجہان کشمیر میں موسمِ گرما بسر کرنے کو آیا تو اس نے اس باغ کی سیر کی۔ اس کے مرتفع تختے اور جمیل اور پہاڑوں کے نظارے اس قدر دلربا تھے کہ شاہجہان نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ یہ باغ رعایا میں سے کسی ایک شخص کی ملکیت نہ رہنا چاہیئے، اس نے آصف خاں کے سامنے تین مختلف موقعوں پر نشاطِ باغ کی تعریف کی یہ توقع کرتے ہوئے کہ آصف خاں بلا تامل ”بلغ سبز است تختہ آصف“ کہہ کر اپنا گلشنِ بادشاہ کی نذر کر دے گا۔ لیکن اگر بادشاہ کو جانفزا نظارہ کی حرص تھی تو وزیر بھی نشاط کو اپنی مسرت کی تنہا بساط سمجھے ہوئے تھا۔ ہر دفعہ بادشاہ کی بات سنتا لیکن مطلب سمجھ کر خاموش ہو رہتا، اس زمانے میں بھی شاہی باغ شالامار اور نشاطِ باغ کی سیرابی کے لئے

ایک ہی مشترک نہر تھی۔ بادشاہ نے حکم دے دیا کہ نہر میں ایک بند لگا دیا جائے تاکہ نشاط باغ کی طرف پانی کی ایک بوند نہ آنے پائے +

شاہجہان کے انتقام نے باغ کو ماتم کدہ آرزو بنادیا + نہر کے بند ہونے کے ساتھ تالاب منکھ گئے۔ آبشاروں کی آب و تاب نام کو بھی باقی نہ رہی۔ دورویہ گلزاروں میں پھول پڑمردہ ہو کر ٹٹی میں مل گئے + نہر کے سنگیں کنارے بادشاہ وقت کی سنگیں مزاحی کے شاکی تھے اور بے زبان فوارے زبان حال سے حکومت پر زبان بندی کا الزام دھرتے تھے + آصف خاں اپنے محل میں بیٹھا اپنے محبوب ترین باغ کو اُجڑتے ہوئے نظر حسرت سے دیکھتا تھا لیکن زبان کو گفتگو کا یا ر نہ تھا کہ لب شکایت وا کرتا۔ صرف دوست عزیز ہی دل کا حال جانتے تھے کہ اُس پر کیا گزر رہی ہے !

ایک دن اپنے خیالوں میں کھویا ہوا وہ خشک نہر کے کنارے ایک سایہ دار درخت کے نیچے سو گیا + تھوڑی دیر کے بعد کچھ شور مچا اور وہ چونک پڑا۔ آنکھیں کھول کر کیا دیکھتا ہے کہ نہر پھر لبالب بھری ہوئی ہے فوارے اُسی طرح جوش و خروش سے چل رہے ہیں اور آبشار اُسی پچھن کے انداز سے ایک تختے سے دوسرے میں چھلانگیں مار رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پھول از سر نو شگفتہ ہو جائیں گے اور باغ پھر اُسی طرح سرسبز و شاداب ! آصف خاں حیران تھا کہ جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ اک دم ہے یا خواب یا کیا بات صرف یہ تھی کہ ایک باوفا خادم نے جو اپنے عزیز آقا کو مخموم دیکھ کر جی ہی جی میں بہت دنوں کوہ ہتار ہا اپنی جان پر کھیل کر بادشاہ کے حکم سے سرتابی کی اور جا کر نہر کا بند توڑ دیا + آصف خاں نے لمبے بلا کر سخت سسٹ کہا اور بند کو دوبارہ لگوا دیا + لیکن اتنے میں بادشاہ کو خبر ہو چکی تھی۔ حکم دیا کہ گستاخ لوگو کو فوراً حاضر کیا جائے۔ لوگو کا نپتا ہوا آیا اور آداب بجا لاکر فرمان موت کا انتظار کرنے لگا + خواہن و امرا اور باقی اہل دربار حیران رہ گئے جب بادشاہ نے بجائے سزائے موت کے اُسے غلوت فاخرہ عطا کرنے کا حکم دیا اور اُس کے ایثار و خدمت کی داد دیتے ہوئے اُس کے آقا کو ایک پنشنی جس کی رو سے اُسے ہمیشہ کے لئے شالامار کی نہر سے نشاط باغ کو سیراب کرنے کا حق حاصل ہو گیا +

بشیر احمد

سائنس اور جنگ

ایک زمانہ تھا جبکہ نقطہ شجاعت، مردانگی اور قوت بازو پر جنگ کا انحصار تھا۔ یہی صفات حریف سپاہیوں اور محارب قوموں کی جنگی قابلیتوں کا معیار سمجھے جاتے تھے۔ اس وقت انسان کی جنگ ایسی ہی بیدھی سادھی تھی جیسا کہ اُس کا تمدن۔ لیکن جوں جوں رفتار زمانہ کے ساتھ انسانی دماغ ارتقاء کے زینے طے کرتا گیا اور دست معلومات کی وجہ سے مادی دنیا کی مخفی طاقتوں پر اس کا تصرف و اقتدار بڑھتا گیا۔ زمانہ امن کی ضروریات اور میدان جنگ کے لوازمات دونوں پہلو بہ پہلو ترقی کرتے گئے، گزشتہ سو ڈیڑھ سو سال سے علوم مادیہ کی حیرت انگیز رفتار ترقی نے بنی نوع انسان کی زندگی کے ہر ایک شعبہ میں ایک عجیب انقلاب کی سی صورت پیدا کر دی ہے۔ انسانی دماغ نے مادیات کے میدان میں جو عظیم الشان فتوحات حاصل کی ہیں ان کے ذریعہ سے انسان نے ایک مزید طاقت حاصل کی ہے۔ جس کے مقابلہ میں اُس کی ذاتی اور جسمانی طاقت کچھ حقیقت نہیں رکھتی، سائنس کا ہر نیا ایجاد و اختراع اُس کی قوت میں ایک نئے اضافہ کا حکم رکھتا ہے، ان اکتسابی طاقتوں کے استعمال پر اب اُس کے امن اور جنگ دونوں کا دار و مدار ہے +

تمدن دماغی ترقی کے قدم بہ قدم ترقی کرتا چلا آیا ہے، جنگ چونکہ تمدن کی تصویر کا ایک مُخ ہے اس لئے اس کی حالت اور رفتار بھی دماغی ترقی اور بالخصوص علوم مادیہ کی توسیع کے زیر اثر ہے اس کے ارتقاء کے قوانین بھی وہی ہیں جو تمدن کی تصویر کے دوسرے مُخ یعنی امن کے ہیں۔ انسان کا دماغ مادہ کے خلاف مصروف پیکار رہتا ہے۔ اس کی زندگی کا راز تلاش و جستجو میں مضمر ہے۔ یہی جستجو کی آرزو اس کے تمام افعال و محرکات کی محرک ہوتی ہے۔ بنا بریں وہ مادہ کی انجمنوں میں پُرکار قدرت کے سر بہتہ رازوں کو معلوم کرنے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے اور بتدریج اپنے تصرف کا احاطہ وسیع کرتا رہتا ہے۔ یہ انسانی دماغ کی اصلی جنگ گاہ ہے جہاں علوم نشو و نما پاتے ہیں۔ پھر ان علوم سے انسان اپنی زندگی کی حفاظت و استحکام کے سامان جتیا کرتا ہے کبھی امن کی چار دیواری میں آرام و آسائش سے بسر کرتا ہے اور کبھی میدان جنگ میں اپنی قوت کے جوہر دکھاتا ہے +

کبھی تعمیر میں دل لگاتا ہے۔ اور کبھی تخریب سے جی بہلاتا ہے، جس قصداً اس کو برسوں کی محنت و جانکاہی کے بعد تعمیر کرتا ہے اُسی کو منہدم کرنے کے لئے سر توڑ کوششیں بھی کرتا ہے، اس کی تعمیر میں تخریب پنہاں ہے اور تخریب میں تعمیر کا راز مضمر ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ جن سامانوں سے تعمیر میں مدد لی جاتی ہے وہی سامان تخریب کے بھی کام آتے ہیں۔ اس معجزہ حیات انسانی پر غالب مرحوم کا یہ شعر کس قدر صادق آتا ہے۔

مری تعمیر میں مضمر ہے ایک صورتِ غرابی کی

ہیولے برقی خرمن کا ہے خونِ گرم دھقال کا

یہ ”اجتماعِ ضدین“ فلسفہ حیات کا ایک نہایت ہی باریک مسئلہ ہے جس پر مزید بحث کی اس مختصر سے مضمون میں گنجائش نہیں۔ گو اس کے کڑے پن کو ہر ایک شنفنس محسوس کرتا ہے۔ لیکن اس سے گریز بھی نہیں۔

گر شربت و گرزہ، بلب چوں رسدایں جام

باید ہمہ نوشند چشیدانِ گلزارند

ہاں۔ اگر انسان کی روحانی و اخلاقی قوت بالکل مُردہ نہ ہو گئی ہو۔ تو وہ ہمیشہ تعمیر کو تخریب پر ترجیح دے گا اور امور تخریب کو ایک ”اخلاقی جرم“ تصور کرتے ہوئے حتی المقدور اُس کے حلقہ اثر کو کم کرنے کی سعی کرے گا۔ سائنس کی وسعت سے جو طاقت انسان کو نصیب ہوتی ہے وہ تو بدستور روز افزوں ہوتی چلی جائیگی۔ لیکن اس طاقت کے استعمال کی نوعیت کیا ہوگی؟ یہ ”صاحبِ طاقت“ کی ”اخلاقی سطح“ پر منحصر ہے۔ بعض لوگ سائنس اور سائنس دانوں کو یہ الزام دیتے ہیں کہ انہیں کی ایجادات کے طفیل تباہی و بربادی کے سامان بیش از بیش ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ درست ہے اور تجربہ و مشاہدہ اس امر کے شاہد ہیں کہ سائنس کی ترقیات تباہی و بربادی کے سامانوں کو بڑھا رہی ہیں۔ مگر سائنس کا جواب بھی معقولیت سے خالی نہیں۔ بیشتر اس الزام کے مستحق وہ لوگ ہیں جو سائنس کی بخشی ہوئی طاقتوں کے استعمال پر قادر ہیں یعنی کارپردازانِ سلطنت نہ کہ پچارے سائنس دان جو فقط وسعتِ علوم کی خاطر اپنی تجربہ گاہوں میں شب و روز مشغول رہتے ہیں۔ اور جنہیں اس کے عوض میں پیٹ بھر کر روٹی بھی میسر نہیں آتی۔ سائنس کے اکثر اکتشافات و ایجادات محض

توسیع علم یا بنی نوع انسان کے فائدہ کے لئے کئے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص ایک ایسا انجن ایجاد کرتا ہے جس میں پانی بھر کر نہایت تیزی کے ساتھ بھڑکتی ہوئی آگ پر پھینکا جاسکے۔ ایسی ایجاد کا نوع انسان کے لئے غایت درجہ مفید ہونا ایک بدیہی امر ہے۔ اور ہم ہر روز اپنی ہستیوں میں اس کا شاہد کرتے ہیں۔ جہاں ذرا سی آگ نمودار ہوئی جھٹ آگ بجھانے کا انجن ”آپنچا“ اور چند ساعتوں میں وہ آگ جس کے شعلے آسمان سے باتیں کرتے دکھائی دیتے تھے دفعتاً غائب ہو گئی۔ اب اگر کوئی چاہے تو اسی مفید ایجاد سے ”تخریب“ کا کام بھی لے سکتا ہے۔ اس طرح کہ بجائے پانی کے پٹرول سے کام لے نتیجہ یہ ہوگا کہ آگ بجھنی تو درکنار اور مشتعل ہوگی۔ مگر ظاہر ہے کہ انجن کے اس ”نا جائز“ مصرف سے اصلی موجد اور سائنسدان پر کوئی عرف نہیں آتا۔ ایجاد کرتے وقت اس کو یہ گمان تک بھی نہ ہوگا کہ اس کے ایجاد کردہ انجن کو اس مصرف کے لئے بھی استعمال کیا جائیگا۔ اس مصرف کے تلاش کرنے میں سائنسدانی کی چنداں ضرورت نہیں بلکہ تھوڑی سی عقل چارہ کار اور تھوڑی سی ”شیطنیت“ درکار ہے اور بدقسمتی سے دنیا میں ایسے صاحب قدرت اہل دول کی کمی نہیں جو سائنس کے مفید ترین ایجاد سے بھی ہر جائز و ناجائز فائدہ حاصل کرنے کے لئے چشم براہ رہتے ہیں۔ ایک اور مثال لیجئے۔ جراثیم کی تحقیقات نے علوم طبیہ کو بہت ترقی دی ہے اور اس کا بنی نوع انسان کے لئے مفید ہونا اظہر من الشمس ہے مختلف بیماریوں کے جراثیم تباہ و برباد کر دئے جاتے ہیں اور اس سے بیماری رک جاتی ہے۔ لیکن جو سائنس جراثیم کو فنا کر دینے کے طریق سکھلاتی ہے وہی سائنس ان جراثیم کو پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔ عام طور پر تو سائنس سے پہلا کام ہی لیا جاتا ہے لیکن دنیا کی اخلاقی حالت ایسی نہیں کہ وہ سب سے مصرف کا خطرہ مفقود سمجھا جائے۔

اگرچہ اس سے بیشتر بھی دور بین لگا ہوں سے کچھ مخفی نہ تھا کہ تمدن حاضرہ کی موجودہ روش اور سائنس کی ترقیات میں ایک سخت خطرناک پہلو موجود ہے، لیکن گذشتہ جنگ نے اس امر کو اس خوبی سے ہر شخص پر واضح کر دیا ہے کہ مزید ثبوت کی ضرورت نہیں۔ سائنس کی معلومات ایسی نہ تھیں جو دشمن کی جان لینے یا اپنی جان بچانے کے کام آسکتی ہوں اور اس سے اس جنگ میں کام نہ لیا گیا ہو۔ مزید براں تجربہ کار و کثرت مشق سائنس دانوں بالخصوص ماہرین کیسیا اور انجینروں کو اس مطلب کی تنخواہیں دی جاتی تھیں کہ وہ ایسی ایجادیں کریں جن سے میدان جنگ میں کام

لیا جاسکے اور تھوڑے وقت میں زیادہ آدمی موت کے گھاٹ اُتارے جاسکیں۔ دوران جنگ ہی میں جرموں نے پچھتر میل والی توپ ایجاد کی اور اب سنا جاتا ہے کہ ایک فرانسیسی انجینیر نے ۱۱۰ میل والی توپ تیار کی ہے جو غالباً اُسندہ جنگ میں استعمال کی جائیگی، اگر ان تمام ایجادات اختراعات و انکشافات کو جو جنگ کے دوران میں جنگ کی وجہ سے معرض ظهور میں آئے ہیں اکٹھا کیا جائے تو ایک نہایت طول طویل فہرست ہوگی۔ میں اس جگہ فقط ایک ایسے ایجاد کا ذکر کر دینگا جو خاص اسی جنگ کی پیداوار ہے۔ اور جس کی وجہ سے فنون حربہ میں ایک مستقل اضافہ واقع ہوا ہے۔

جب جنگ اپنے پورے زور پر تھی اور ہر ایک فریق محارب اپنے تمام مادی، دماغی اور اخلاقی ذرائع کو حد امکان تک استعمال کرنے میں کوشاں تھا تا کہ اس کشمکش حیات کے خوفناک تلاطم سے زندہ اور کامراں نکل آئے۔ اس وقت جرمن کیمیا دانوں نے اس مسئلہ پر غور کرنا شروع کیا کہ فولاد اور گولہ بارود کے علاوہ بھی کوئی ایسی چیز ہو سکتی ہے جسے میدان جنگ میں ذریعہ ہلاکت انسانی بنایا جائے، غالباً مسئلہ حل طلب کی صورت یہ ہوگی۔ جنگ کی کامیابی اس بات پر منحصر ہے کہ کم سے کم عرصہ میں جتنی اوسع دشمن کی زیادہ سے زیادہ فوج یا تو ہلاک کر دی جائے یا جنگی کام کے لئے ناقابلِ کردی جائے۔ اس مقصد کے لئے انسان نے وقتاً فوقتاً آفات حربہ ایجاد و اختراع کئے ہیں۔ قریب سے فولاد اور بمب استعمال میں آتے۔ دُور سے گولہ بارود کام دیتے ہیں۔ لیکن کیا ان کے علاوہ اُسی مقصد کے حصول کے لئے کوئی اور طریق ممکن نہیں؟ کیا سائنس با این ہمہ ترقی کسی ایسے وسیلہ کے مہیا کرنے سے قاصر ہے؟ علم کیمیا کی تاریخ شاہد ہے کہ سینکڑوں کیمیا دان اپنی تجربہ گاہوں میں ایسے تجربات کرتے کرتے راہی ملک عدم ہو گئے جن میں ایسی گیسوں سے واسطہ پڑتا تھا جو انسانی قوائے حیات پر نہایت زہریلا اثر رکھتی تھیں۔ کیا ان شہیدانِ علم کی اس بے بہترین یادگار ہو سکتی ہے کہ جن گیسوں کی خصوصیات معلوم کرنے میں انہوں نے اپنی قیمتی جان دے ڈالی۔ انہیں گیسوں کی زہریلی خاصیتوں سے دشمن کی فوج کو ہلاک کرنے اور جنگ کو کامیابی کے نقطہ تک پہنچانے میں فائدہ اُٹھایا جائے؟ باقی رہا ایسی گیسوں کا بڑے پیمانے پر بنانا اور خندقوں تک پہنچانا تو یہ جرمن کیمیا دانوں کے لئے کوئی دقت طلب بات نہ تھی۔ انہوں نے ایسی گیسوں سے ابتدا کی جو نہایت آسانی سے مہیا ہو سکتی تھیں۔ سب سے آدل جو گیس میدان جنگ

میں استعمال کی گئی وہ کلورین (chlorine) گیس تھی یہ وہی گیس ہے جو سوڈیم دھات سے مل کر ٹنک پیدا کرتی ہے۔ اس گیس کو مائع کی حالت میں تبدیل کر کے آدم قد لوہے کے پیپوں میں بند کر کے خندقوں میں مختلف مقامات پر کھڑا کر دیا جاتا تھا۔

اپریل ۱۹۱۵ء میں محاذ فرانس پر اس گیس کا اولین حملہ کیا گیا۔ ایک دن ہوا کا رُخ حسبِ منشاء پاکر جرمنوں نے اپنے گیس کے ذخیروں کے منہ اتحادی خندقوں کی طرف کھول دیئے۔ اتحادیوں کے لئے یہ آفتِ ناگمانی تھی جس نے آنا فائیں ہزاروں سپاہیوں کو ہلاک کر دیا اور باقی ماندہ کو ایسے سخت عذاب میں مبتلا کر دیا جو حالاتِ نزع کے مساوی تھا۔ اتحادیوں کو یہ وہم و گمان تک بھی نہ تھا کہ جرمن علمِ کیمیا کا یہ پہلو بھی جنگی مصرف میں لا سکتے ہیں۔ اُن کے غصہ و رنج کی انتہا نہ رہی۔ فرانس و انگلینڈ کے اخبارات نے بہت شور مچا دیا۔ گالیوں کے کارٹوس چلائے گئے۔ بتایا گیا کہ یہ معاہدہ ہیگ کی رو سے سراسر ناجائز حرکت ہے۔ لیکن اس طرف سے ایک ہی جواب تھا۔ یعنی یہ کہ عشق و جنگ میں ہر حرکت جائز حرکت کا حکم رکھتی ہے؛ بالآخر اتحادیوں نے اس حملہ کے خلاف دماغی تدابیر سوچنی شروع کیں۔ دماغ کا ایک پہلو تو یہ تھا کہ اپنے سپاہیوں کی گیس سے حفاظت کی جائے۔ اس مطلب کے لئے ”گیس ماسک“ Gas mask یعنی گیس سے بچانے والا نقاب یا ٹوپی اختراع کی گئی۔ ہر ایک سپاہی اپنے منہ پر ایک ٹوپی اوڑھے رکھتا تھا۔ ٹوپی یا نقاب کا کپڑا جو فلائین کا تھا ایسی ادویات کے سالیوشن میں بھگو لیا جاتا تھا جو زہریلی گیس کو جذب کر لینے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ مثلاً کلورین گیس کو جذب کرنے کے لئے ہائی پو” Hypo استعمال کیا جاتا تھا۔ (یہ وہی ہائی پو ہے جو فوٹو گرافی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے)۔ مدعا یہ تھا کہ اگر ہوائیں کوئی زہریلی گیس ہو تو وہ منہ یا ناک تک پہنچنے سے پہلے نقاب کے کیمیائی مواد کے اندر ہی جذب ہو جائے۔

دماغ کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ گیس کا جواب گیس میں دیا جائے۔ چنانچہ اتحادیوں نے بہت جلد اس تدبیر کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ اور ایک بڑے پیمانے پر تیاری کے بعد ستمبر ۱۹۱۵ء میں انہوں نے بھی گیس کا استعمال شروع کیا۔ اتحادی کیمیا دان بھی میدانِ جنگ میں پہنچے۔ جس طرح توپ چلانے کے لئے توپچی درکار ہوتے ہیں اسی طرح فوج میں گیس چلانے کے لئے کیمیا دان بھرتی کئے گئے۔ ان کے علاوہ محاذ کے عقب میں سینکڑوں کیمیا دان نئی زہریلی گیسوں کی دریافت اور ان کے

استعمال کے طریق اختراع کرنے میں مصروف تھے، جرمن فرانس اور انگلستان کی تجربہ گاہیں اس کام کے لئے وقف تھیں۔ اب محارب قوموں کے زور بازو کا مقابلہ نہ تھا بلکہ انکی کیمیا دانی کا مقابلہ تھا، فریقین کی یہی کوشش تھی کہ ہر موقع پر نئی سے نئی گیس استعمال کی جائے تاکہ دشمن بے خبری کی وجہ سے چھٹی طرح دماغی تدابیر عمل میں نہ لاسکے، اس سہی میں بہت سی گیسیں استعمال کی گئیں اور بہت سی نئی اور پیچیدہ ترکیب والی گیسیں معلوم کی گئیں۔

کلورین کے علاوہ ایک اور گیس استعمال کی گئی جسے انگریزی میں فاسجین *phosgene* کہتے ہیں۔ اسے کلورین پر اس لئے ترجیح تھی کہ بے رنگ ہونے کی وجہ سے اسے محسوس کر لینا آسان نہ تھا۔ اس گیس کا اثر فوراً ظاہر نہ ہوتا تھا بلکہ کچھ وقت گزرنے پر اور اس وقت یہ بلائے بے درماں ثابت ہوتی، غالباً جو گیس جنگی نقطہ خیال سے بہت کار آمد ثابت ہوئی وہ مسٹرڈ گیس *Mustard gas* تھی۔ پھپھڑوں پر ہلکے اثرات کے علاوہ اس کا ایک اثر یہ بھی تھا کہ تھوڑی مقدار میں بھی جسم کے کسی حصہ کو چھو گئی تو اسے جلادالا اور زخم پیدا کر دیا۔ بالخصوص آنکھوں پر اس کا اثر بہت نمایاں تھا۔ اکثر حالتوں میں عارضی طور پر اندھا کر دیتی اور بعض حالتوں میں تو مستقل طور پر بینائی کو تباہ کر دیتی تھیں۔ ایسی گیسیں بھی استعمال کی گئیں جو آنکھوں میں آنسو لے آتی تھیں۔ اگرچہ ان کا اثر ہلکا نہ ہوتا لیکن سپاہیوں کو فرائض کی انجام دہی سے عارضی طور پر روک دیتیں۔ منجملہ ان کے ایک گیس کلور و پکرن *Chloro picrin* تھی۔

کہا جاتا ہے کہ ان سے بھی زیادہ ہلکا اور زود اثر گیس پیدا کی جا چکی تھیں یا پیدا کی جا رہی تھیں لیکن التوائے جنگ نے ان کو میدان جنگ کی تجربہ گاہ سے محروم کر دیا۔ اور اس طرح بہت سے کیمیا دانوں کی حسرتیں دل کی دل ہی میں رہ گئیں۔ لیکن خیر یہ نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی باوجود گذشتہ جنگ کے تلخ تجربہ کے متمدن اقوام کا رویہ بدستور یہ ظاہر کرتا چلا رہا ہے کہ آئندہ اس سے زیادہ ہولناک جنگ کا خطرہ ابھی دور نہیں ہوا، غیر مسلح کرنے کی کانفرنسیں اس انسانی تصادم کو روک نہیں سکتیں۔ اور انجمن اقوام کے تنخواہ یافتہ ناصحین کی تقاریر اور مضمون نگاروں کے قلم اقوام متمدنہ کی آتش حرص و آرزو کہ جسے سائنس کے ایندھن سے ہر روز نئی مدد اور قوت نصیب ہو رہی ہے۔ فرو نہیں کر سکتیں یہ خطرہ اس وقت تک کم نہیں ہو سکتا رہیں یہ ماننے میں تامل ہے

کہ جنگ مٹ بھی سکتی ہے) جب تک تمدن کے بنیادی اصولوں اور ملک داری کے موجودہ سیاسی و اقتصادی نقطہ خیال میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو جائے اور دنیا کی کھوئی ہوئی اخلاقی و روحانی قوت پھر عود نہ کر آئے۔ ورنہ جہاں تک خود ساختہ ناصح کی نصیحت کا تعلق ہے عشق اور جنگ دونوں کا ایک ہی جواب ہے۔ بقول حضرت غالب ؎

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سی
یہ جون عشق کے اندر چھٹ جائیگے کیا؟

کیا ہو! جو جنگ فتح ہو گئی اور نئی دنیا کے کیسے دانوں کو میدان فرانس کو اپنی کیمیائی علوم کی تخریب گاہ بنانے کا فخر نصیب نہ ہوا۔ آخر انہوں نے گھر جا کر اپنی حسرت نکال ہی لی، ابھی کچھ دن نہیں گزرے کہ ہمارا خبر رساں رائیٹر نئی دنیا سے پرانی دنیا کو بہ زبان برق یہ مژدہ جالغزا سنا تا ہے کہ امریکہ کے کیمیا دانوں نے ایک ایسی خوفناک زہریلی گیس دریافت کی ہے جو ہر قسم کی رکاوٹ سے گذر کر چمڑے تک فوراً اثر کر جاتی ہے۔ یہ گیس خاص طور پر ہوائی جہازوں سے انسانی بستیوں پر چھوڑنے کے لئے موزوں ہے۔ یہ گیس دنیا کے سب سے بڑے زہریلی گیسوں کے بنانے والے کارخانہ میں بنائی گئی ہے جو بالٹی مور کے قریب واقع ہے۔ یہ وہی کارخانہ ہے جو التوائے جنگ کے وقت روزانہ ۲۰۰ ٹن کے قریب زہریلی گیس پیدا کرتا تھا اور جن کا عملہ جارحانہ و مدافعانہ دونوں قسم کی ایجادات و اختراعات میں مصروف رہتا ہے۔ ناظرین قیاس کر سکتے ہیں کہ وہ جنگ جس میں مذکورہ بالا گیس اور اسی قبیل کی اور گیسیں استعمال کی جائیں گی۔ کیسی جنگ ہوگی + ایک ہوائی جہاز۔ ایک ٹن گیس اور ایک قابل اور باہمت جہاز دان۔ بس یہ سامان ہیں جو ایک لاکھ نفوس کی بستی کو پانچ منٹ کے اندر ہمیشہ کے لئے خاموش کر دینے کے لئے درکار ہوں گے۔

رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے

بھرے ہیں جس قدر جام و سہو میخانہ خالی ہے

منظر الدین مٹھر

تحقیق الاسنہ

گزشتہ سے پیوستہ

وہ لوگ جو کج کل غیر زبانوں کی علمی کتب کا ترجمہ کرتے ہیں اردو میں مناسب اصطلاحات کی غیر موجودگی سے بہت تکلیف اٹھاتے ہیں اگر وہ مندرجہ بالا اصول کے موافق انہیں غیر زبان اصطلاحات کو عربی صورت پر واپس لے آئیں تو وہی اصطلاحات ایک طرف تو اردو فارسی عربی جاننے والوں کے لئے قرین فہم ہونگی دوسری طرف محض غیر زبان جاننے والوں کی رسائی ذہن کے لائق ہونگی جیسا کہ ستاروں اور برجوں کے ناموں کی مطابقت سے ظاہر ہے۔

اب ہم اہل تطبیق کے مزید اطمینان کے لئے سنسکرت اسمائے علوم کو عربی صورت میں پیش کرتے ہیں +

اسماء علوم	معنی	عربی صورت	شرح معانی عربی
کادیہ	نظم	قافیہ	از فنون نظم مقفی و تصدیح مدح و ذم گفتن -
نامک	ڈراما	ناطق	بوزن خاتم سرائیدن و مکالمات و متبادل اہل سنسکرت
			نہ معنی نا چنا سے ماخوذ بتلاتے ہیں۔ عربی میں نظم معنی
			بیہودہ گوئی نطخ معنی سرائیدن ہے مگر ڈراما میں سب سے
			زیادہ نمایاں چیز ایکٹروں کا مکالمہ ہے نا چنا ضروری
			نہیں ہے +
تنتو و چار	فلسفہ	تانتو بصر	تانتو اسم فاعل تانتو شل تنصور انضر یعنی اصل و تخم و نشو و نما تخم۔
			بصار یعنی خورد و فکر و علم -
ویدانت	توجید	وحدہ انتی	سنسکرت میں ویدانتا معنی وید کی انتہا بتلایا گیا ہے۔ مگر عربی
		وحدانیت	میں انتی یعنی حاصل و ثمرہ وید کا۔ جو زیادہ مناسب ہے
			کیونکہ تمام علوم کو وید سے ماخوذ سمجھا گیا ہے۔ پھر وید عربی

اسماء علوم	معنی	عربی صورت	شرح معانی عربی
تیاے	منطق	ربناء	میں بمعنی علم توحید الہی ہے کیونکہ وہ مبدل وحد کا ہے۔ انت
جوتش	ہیئت	جوتہ اس	بمعنی انتہا عربی میں غنت ہے اور انتا مشابہ انتہاء۔
ریکھا گنت	ہندسہ	ریقع قنت	ازنی۔ علم درستی کلام و از خطا بازدارندہ۔ و بصواب برندہ
بیج گنت	جبر و مقابلہ	بیج قنت	جوتہ فضائے آسمان و زمین۔ اس نشان ہندہ یا صودہ
ویدک	طب	ویدق	بمعنی ستارہ۔
انک گنت	حساب	عنک	ریقع ار رقع۔ اندازہ نمائے فاصلہ بخطوط بنشتہ۔ قنت
کالنی پورن	تاریخ	کال نیی برہان	قانون و ضابطہ۔ صرف ریعق کافی تھا۔
بھوگول	جغرافیہ	بھو غول	بیج۔ مساوات بذریعہ آواز یا یعنی حروف۔ جبر و مقابلہ کے
پترو دیا	میسوری	صطر	تمام قواعد مساوات کے محتاج ہیں۔
گرہیزمان	تعمیر	قریج نارمان	از و دق۔ آرام دہندہ امراض جسم۔ دیکھتے ہیں کہ یہ دید
رنجن	رنگ زمی	رزا یارنق	سے ماخوذ ہے اس لئے ویدک نام ہوا اگر طب کا مفہوم
			اس سے ظاہر نہیں ہوتا اس لئے عربی شرح فایق ہے۔
			یکے ازا شیاے بسیار و بجنس کر اصل و بن ہر اشیاء باشد
			و بطور کلید بکار آید مراد عدد مفرد سے ہے۔
			کال از کل۔ اتوا مگزشتہ و ہلاک شدہ یعنی خبر دہندہ حالات
			مرگ برہان بیان واضح۔
			ہوزمین فراخ۔ غلّ بمعنی غلّو یا کرہ مجموعہ کرہ زمین۔ غول
			کے معنی کتاب خبر دہندہ بھی ہیں۔
			لکھشتن و نشتن و ضیہ علم۔
			قریج۔ خاند فراخ۔ نار۔ پختہ از آہک ساختہ مان از منو
			دریا متن اندازہ و حقیقت۔
			رزا۔ رنگ کردن۔ رنگا۔ سیاہ رنگ کردن۔

نام علم	معنی	عربی صورت	شرح عربی
ویپار	تجارت	ولیفار	از و فر مال بیا از تہم میا دشتن و داد و ستد کردن اُن بے افزودنی۔
نگیت	موسیقی	نسیت	از سُن آراستہ شدن و بصورت دیگرے بر آمدن آراستہ دیکو کردن سخن را دپائے کوبی۔
تنتوائے	پارچہ بانی	تنت و عی	تنت نیک ہفتن۔ دعی یاد کردن و قادر شدن۔
سورن کار تو	زرگری	سورن قرعہ او	شور و دن۔ سنگ آتش رنگ کہ بارائش جمال و لباس بکار برند۔ قرعہ بآتش تاب دادہ کوفتن او از اوی قائم شدن۔

مترجمین کتب انگریزی کی حوصلہ افزائی کے لئے چند علوم کے یونانی ناموں کو جو انگریزی میں مستعمل ہیں عربی صورت میں لاکر حل کرتے ہیں۔

یونانی نام کے معنی	یونانی نام	عربی صورت	شرح عربی
علم تغیرات ارت	فیلا لوجی	بالا لوضی	بالا۔ بوزن حساب تغیر السہ۔ لوضی از لفظ معلم من ح تبادل۔ ب۔ پ۔ ت۔ بترتیب متبادل۔
علم تشحیح الابدان	فریالوجی	فرجیہ لوضی	از فجو۔ شکاف و ادون اعضا جسم را۔
علم کاسہ سر	فرینالوجی	فرج ناہ لوضی	فرج یعنی سر۔ ناہ از نمی۔ یعنی کاسہ و ظرف۔
علم الطیور	بیالوجی	بیالہ لوضی	بیالہ۔ از بوه۔ یعنی پرندگان۔
علم طبقات الارض	جیالوجی	جیالہ لوضی	جیالہ۔ از جوا۔ اندون مخاک زمین۔ دزمین فراخ۔
علم آثار قدیمہ	آرکیالوجی	آرکیہ لوضی	آرکیہ۔ یعنی اشیاء دیرینہ یا قدیم۔
علم نباتات قدیمہ	پلانٹالوجی	پلنٹ لوضی	پلنٹ۔ اسم فاعل۔ بطبعی نبات قدیم و متجہ۔ اسم علم میں زمین میں پائی دی ہوئیں نباتات کے متعلق بحث ہے جو پتھر میں گئی ہیں۔
علم تشحیح الانسان	انٹھراپالوجی	انطراہ لوضی	انطراہ۔ تشحیح جسم انسان و قدامت اعضاء۔
			اس علم میں ایسے اندون اعضا جسم انسان سے بحث ہے جو تمام جوانات میں زمانہ قدیم سے مشترک یا ہم شکل چلتے آتے ہیں۔

یونانی نام کے معنی	یونانی نام	عربی صورت	شرح عربی
علم الاقوام	اتھنالوجی	عطنہ لوضی	عطنہ - گرد و اقوام شتر بانان -
تہذیب الاقوام	اتھنا گرافی	عطنہ قرانی	عطنہ - قوم - قرانی - لیاقت سزا داری و تمدن -
علم السنین	کرونالوجی	قرود لوضی	قرود - جمع قرن ہائے نسبتی بمعنی ازمنہ -
تقصص و سوانح	ٹریڈیشن	طراد ارض	طراد حکایات جنگہائے سابقہ و جلا وطنی اقوام -
علم ہیئت	اسٹروٹومی	اقتران لومی	اقص مجبور - جمع کے لئے انگریزی میں مستعمل ہے -
علم کیمیا	کیمسٹری	قیم اسٹری	اقتران ہم آمدن ستارہ در بروج فلکی و نظام حرکات آہنا -
تاریخ	ہسٹری	اسٹوری	اقتران کو یونانی خط میں حرف سنی C سے لکھیں آہنا -
افسانہ	سٹوری	سطوری	بھی پڑھا جا سکتا ہے لومی - ازمنہ غیر دہندہ و بیان کنندہ -
			قیم - از قوم مثل خیل - از قول بمعنی قوم معدنیات - اسٹری -
			از سطح ہم آدری و حفاظت - کیمیا قیمہ ہے -
			نوشتن قصہ ہائے و حفاظت دہم آدری آہنا -
			سطوری - از سطر افسانہ ہائے بے اصل نوشتن -
(۱۰) - انگریزی الفاظ کو عربی صورت پر لانے میں ایک اور دشواری پیش آتی ہے۔ اور وہ انگریزی الفاظ کے تلفظ اور کتابت کا باہمی اختلاف ہے۔ اس کے لئے زیادہ مفید طریقہ یہ ہے کہ کتابت پر اعتبار کیا جائے۔ تلفظ مرد و زمانہ کے سبب سے بہت بگڑ گیا ہے مگر کتابت اکثر اصلی حالت پر قائم چلی آتی ہے۔ مثلاً اپنا ایک تجربہ بیان کرتا ہوں - میں جن دنوں میں دو ایسوں کے انگریزی ناموں کی فہرست کو عربی سے نقل کر رہا تھا۔ ایک دو کا نام برگنڈی بیچ لکھا ہوا ملا۔ ماہیت کی کیفیت میں لکھا ہوا تھا کہ ایک درخت کا گوند ہے جو سوئٹزر لینڈ کے جنگلوں میں ہوتا ہے۔			
یہ پہلے سے معلوم تھا کہ برگنڈی فرانس کے ایک علاقہ کا نام ہے۔ مگر سوئٹزر لینڈ فرانس سے باہر ہے۔ خیال گزرا کہ کہیں سوئٹزر لینڈ کا پرانا نام برگنڈی نہ ہو۔ اس غلطی کو مٹانے کے لئے بارہوی صدی عیسوی کا نقشہ یورپ دیکھا جو تاریخ یورپ میں درج تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ برگنڈی فرانس سے باہر مگر مشرقی حد سے ملتی ہے اور اس کا نام ڈچی آف برگنڈی یعنی ریاست برگنڈی لکھا ہوا			

ہے اور موجودہ علاقہ سویٹزرلینڈ مع اس کے جنوبی علاقہ کے جو سمندر تک پہنچتا ہے۔ گنگڈم آف برگنڈی کے نام سے لکھا ہوا ہے یعنی سلطنت برگنڈی۔ اور تاریخ سے معلوم ہوا کہ سویٹزرلینڈ زمانہ سابق میں سلطنت برگنڈی کے اندر شامل تھا اور سویٹزرلینڈ نام زمانہ حال میں رکھا گیا ہے۔

دوسرا لفظ بیچ باقی رہا اس کو اس کے مشابہ الفاظ میں بہتیرا تلاش کیا مگر پتہ نہ لگا مجبوراً گتا بت انگریزی کو دیکھا تو لکھا ہوا تھا جس کو علاوہ بیچ کے بیچ، پیش، پکھ، بھی پڑھ سکتے ہیں جن کے مشابہ الفاظ مثل فتح، فتنش، تیج، بطش وغیرہ سب دیکھ ڈالے مگر کہیں پتہ نہیں آخر پکھ کے موافق لفظ فتح کو دیکھا تو گوئد کے موافق منے نکل آئے۔ تب معلوم ہوا کہ جس کو بیچ لکھا جاتا ہے دراصل فتح ہے اور کا تب اول نے بحر اس کے کہت کو پ بنا دیا بالکل صحیح لکھا تھا۔ فقط قیصری

حقیقت اور انتخاب۔ اس شخص کے لئے جو حقیقت کو دیکھ رہا ہو الفاظ کے انتخاب کی ضرورت نہیں وہ خود اسے بہترین لفظ مہیا کر دیگی۔
"ایمرسن" (شاعری و تحلیل)

شخصیت نہ کہ قابلیت۔ محض قابلیت مصنف نہیں بنا سکتی، کتاب کے عقب میں آدمی ہونا چاہیئے۔
(گئے)

مناسب لفظ اور مناسب محل۔ جہاں بھی ایسا لفظ استعمال کیا جائے جو ادبی لفظ مطالب کی حدود سے تجاوز ہو، تو اس لفظ کو خاص طور پر حسن افروز ہونا چاہیئے یا ترنم ریز کیونکہ ان خصوصیتوں میں سے کوئی ایک صفت انجذاب توجہ یا ارتقاع جذبات کا باعث ہو سکتی ہے۔ لیکن مناسب لفظ کا مناسب محل پر استعمال حسن ترنم میں شاید ہی کوئی گنجائش چھوڑتا ہو۔ صحت اور طراقت کا فطری حسن زیوروں کے پرتضع حسن سے کہیں زیادہ دلکش و موثر ہوتا ہے۔

لینڈ (داغری پل)

(خالہ)

ہندوستان کی تعلیم

(۱)

تعلیم

تعلیم۔ پڑھنا لکھنا۔ ایک ایسی انسانی اختیاری صفت ہے جس سے آدمی اپنے اصلی معنوں میں انسان بن جاتا ہے۔ یہ ہی وہ چیز ہے جس سے آدمی نہ صرف اپنی اور اپنے پاس پڑوس کی خدمت اور بھلائی کر سکتا ہے بلکہ اپنے سے دور رہنے والے انجمنوں کی خدمت اور بھلائی بھی تعلیم کے وسیلہ سے آسانی سے ہو سکتی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر تعلیم ایک ایسا اعلیٰ جوہر ہے جس کے ذریعہ سے آدمی اپنے مرنے کے بعد بھی آنے والی نسلوں کی خدمت اور ان کی بھلائی کرنے کی قدرت اپنے میں پیدا کر سکتا ہے۔ تعلیم لکھنا۔ پڑھنا۔ ان فکروں میں مبدأ فیاض کے کرم اور مہربانیوں کا ایسا ناپیدا کنار دریا لہریں مار رہا ہے جو انسان کی پیدائش سے آج تک تمام انسانی نسل کو سیراب کر رہا ہے اور کرتا رہیگا لیکن اس تعلیمی سمندر کا ایک قطرہ بھی کم نہیں ہو سکا اور نہ کم ہو سکتا ہے۔ تعلیم انسان کی چھپی ہوئی فطرتی قوتوں کو ظاہر کر دیتی ہے۔ تعلیم فطرت کے رازوں سے انسان کو آگاہ کر دیتی ہے۔ تعلیم انسان کو عالی حوصلہ بنا دیتی ہے۔ تعلیم سے انسان میں خود داری اور خود مددی کی روح متحرک ہوتی ہے۔ بغرض تعلیم کی ایسی تعریف جو اس چھوٹے کلمے کی نہایت گہرے لفظ پر پورے طور پر حاوی ہو سکے کسی تنہا انسان کی قدرت سے باہر ہے۔ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے اور جب سے دنیا کے حالات معلوم ہوئے ہیں ان کو دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تعلیم کا سوال ہمیشہ انسانی نسل کے روبرو رہا ہے اور دنیا کے مدبروں نے برابر اس اہم مسئلہ پر غور کیا ہے۔ ہر ملک اور ہر قوم کے تعلیمی مدبروں نے تعلیم کے سوال پر اپنے اپنے ملک اور اپنی اپنی قوم کے فائدوں کو نظر کے سامنے رکھ کر اور اپنی اپنی قومی ضرورتوں کا لحاظ کر کے غور کیا ہے۔ اور اپنے قومی اور ملکی فائدوں کے مطابق نتیجے پیدا کئے ہیں اور اس طرح سے عام تعلیم کے مسئلہ سے قومی تعلیم کا مسئلہ متاثر ہو گیا ہے۔

(۲) قومی تعلیم کا اثر

قومی تعلیم کے مسئلہ پر بحث کرنے سے پہلے ”عام تعلیم“ اور قومی تعلیم کا فرق سمجھ لینا چاہیے۔ ”عام تعلیم“ میں ہر قسم کی، ہر ملک کی، ہر قوم کی تعلیم شامل ہے۔ برخلاف اس کے قومی تعلیم ”اُس خاص تعلیم کو کہتے ہیں جس کا تعلق کسی خاص قوم سے ہوتا ہے۔“

تاریخ پر نظر ڈالنے سے ثابت ہو جاتا ہے کہ قوموں کا عروج و زوال قوموں کی عزت اور ذلت قوموں کی آزادی اور غلامی بلکہ قوموں کا عدم اور وجود سب قومی تعلیم پر توجہ یا غفلت پر منحصر ہے۔

(۳) قومی تعلیم اور قومی زبان

قومی تعلیم وہی تعلیم کہی جائے گی جو تمام قوم میں رواج پا جانے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ ایسی کوئی تعلیم ”قومی تعلیم“ نہیں کہی جاسکتی جو ایک محدود گروہ میں مروج ہو اور باقی تمام قوم اُس کے فیض سے محروم ہے اس نتیجہ پر پہنچ کر فیصلہ ہو جاتا ہے کہ قومی تعلیم کا ملکی زبان میں ہونا لازمی اور لا بدی ہے۔ اور قومی تعلیم اور قومی زبان کا آپس میں ایسا تعلق ہے جو کسی طرح نہیں چھوٹ سکتا۔ قومی تعلیم کا یہ ہی مطلب ہے کہ قوم کو قومی زبان میں پڑھایا لکھایا جائے۔ ہر خود ار قوم ہر مشہور قوم ہر ایسی قوم جس کے کارناموں سے دنیا کی تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ ہر ایسی قوم جن کی خدمتوں کو دنیا ہمیشہ بھلائی کے ساتھ یاد رکھیں گی اور جس کے مفید نشانات دنیا کے ہر حصہ میں ملیں گے اپنی قومی تعلیم اور قومی زبان کے تعلق کو ایسا اہم سمجھتی آئی ہے کہ ایسی قوم کا صرف دیوی کا روبرو، سلطنتوں کے انتظامات اور روزمرہ کی کھیت بڑھت ہی قومی بولی میں محدود رکھنے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اعلیٰ علوم و فنون کے ساتھ ہی مقدس تحریریں تک بھی اپنی قومی زبان میں محفوظ رکھنا ہر قوم نے اپنا مذہبی فرض سمجھا ہے۔ اور خود اُس پاک ہستی نے جس نے مقدس تحریریں کسی قوم پر نازل کرنا پسندیں اُن قوموں کی قومی زبان کا اتنا احترام کیا کہ اُسی زبان میں اپنا کلام بھیجا قدیم ایرانی قوم کی الہامی کتاب ”زندستا“ قدیم ایرانی بولی میں ”اور مزید دان“ کی طرف سے نازل ہوئی تھی۔ نہایت

قدیم مصری قوم کی الہامی کتاب پر دہم میرٹھ اُس پاک اعلیٰ ہستی نے ٹر۔ کی طرف سے مصری قوم کی اُس زبان میں ادتاری گئی تھی جو مصر کی بہت پرانی عمارتوں کے کتبوں، پرانے شاہی مقبروں، اہرام مصری کی تختیوں اور مصر کے ہزاروں برس پرانے پتھروں اور لوہے کے مناروں پر لکھی ہوئی پائی جاتی ہے جس کے پڑھنے والے دنیا سے نابود ہیں۔ چین کے مقدس رہنما۔ ناؤ۔ اور کنفیو شس کے الہامی صحیفے چینی بولی میں ہیں۔ غرض کہ توریت۔ زبور۔ انجیل۔ وید۔ وغیرہ ہر ایک الہامی کتاب اپنے اپنے متعلق زبانوں میں لائی گئیں۔ یہ واقعات۔ قومی زبان اور قومی تعلیم کے تعلق کو باہم ظاہر کرنے کے واسطے کافی دلیل ہو سکتے ہیں۔

(۴) قوموں پر تعلیمی زبان کا اثر

تعلیمی زبان کا جو اثر قوموں پر پڑا ہے اور اس سے جو نتیجے نکلے ہیں اُن پر خیال کر کے حیرت ہوتی ہے کہ قوموں کے عروج و زوال قوموں کی عظمت اور پستی قوموں کی آزادی اور غلامی بلکہ قوموں کے وجود اور عدم پر تعلیمی زبان کنٹراکٹ اور کنٹراکٹا اثر کرتی ہے۔ اور یہ اثر کنٹراکٹا دیر پا ہوتا ہے اور کس قدر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔ با اقبال قوموں کی تباہی کے حالات پر غور کرنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ایسی قوموں کا عروج اُس وقت تک بڑھتا رہا جب تک اُن کی تعلیمی اور ملکی زبان ایک رہی۔ جس وقت کسی باہر کے اثر سے تعلیمی زبان ملکی زبان سے علیحدہ ہو گئی اُسی وقت سے اُن قوموں کی بربادی شروع ہو گئی۔ جنہوں نے اس کا خیال نہیں رکھا بلکہ بعض قومیں تو اس زہریلے اثر کی تاب بھی نہ لاسکیں اور دنیا کے پردہ سے ناپید ہو گئیں۔ کارٹھیجیا کی قوم جس کا عظیم الشان تمدن اور حیرت انگیز تاریخ دنیا کے مورخوں کو حیران کئے ہوئے ہے۔ اس قوم کا عروج اُس وقت تک رہا جب تک اُس قوم کی تعلیمی اور ملکی زبان ایک رہی جس وقت اس قوم پر رومن اثر غالب ہو گیا اور کارٹھیجیا میں رومن زبان میں تعلیم کی طرف ایک خاص طبقہ کی توجہ شروع ہوئی اُسی وقت سے کارٹھیجیا میں قوم کا زوال شروع ہو گیا۔ اور آج وہ قوم اپنی قومیت کو کتنے ہی خولوں میں بدلنے کے بعد ڈسنی میں۔ کارٹھیجیا میں قوم کے نام سے نہیں۔ بلکہ عرب قوم کے نام سے فرانس کی غلامی میں اپنے دن پورے کر رہی ہے۔ ایران کی قدیم زبان بولنے والی پرانی ایرانی قوم جس کے جلال و جبروت کا دھندلا سا نشان۔ گمائی ندی کے کنارہ۔ ہمدان کے جنگلوں میں کوہ بیستون کے پہاڑی سلسلہ میں

پتھر کے گھدے ہوئے تاریخی نقش اور تراشی ہوئی تصویروں کے دیکھنے سے اب بھی ذہن میں آجاتا ہے اور جن کی اُس پرانی زبان کے کتبے اب بھی جا بجا ایران میں پائے جاتے ہیں۔ جن کے پڑھنے والے بہت کمیاب ہیں۔ گویا ایرانی قوم کی تباہی مسلمانوں کی چڑھائی اور قادیسیہ کی تاریخی لڑائی سے سنار کی جاتی ہے مگر قومی حالات پر غور کرنے والے سمجھ لیتے ہیں کہ اس نامور ایرانی قوم کا زوال قادیسیہ کی جنگ سے کتنی ہی جلد ہی پہلے اُس وقت سے شروع ہو گیا تھا جب سے کہ سکندر اعظم رومی نے ایران کو فتح کر کے یونانی قوم کے ماتحت کر دیا۔ اور ایران میں پرانی ایرانی زبان کے دوش بدوش یونانی زبان میں تعلیم کی طرف رغبت شروع ہو گئی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ ایرانی قوم اپنی قدیم زبان سے علیحدہ ہو گئی اور پرانی ایرانی زبان کے ساتھ ہی ایرانی قوم کی آزادی ہمیشہ کے واسطے جاتی رہی۔ اسی طرح اگر غور سے دیکھا جائے تو اسیر یا کی پرانی تاریخی قوم سریانی زبان کھو کر عدم کے پردہ میں جا چھپی۔ یہ ہی حشر عبرانی بولنے والی قوم کا ہوا جو نیم غلامی کی صورت میں اپنے سانس پورے کر رہی ہے۔ خود ہندوستان کو بیٹھے۔ ہندو قوم نے اپنی قومی تعلیم۔ وید کی زبان سنسکرت سے جدا کر لی اس کا اثر دیکھنے کے ہزاروں برس سے ہندو قوم اپنی قومی آزادی کھو چکی ہے۔ یہ تو بہت پرانی قوموں کا حال اور ان زبانوں کے متعلق قصے ہیں جو دنیا سے ناپید ہو چکی ہیں یا ناپید ہو رہی ہیں۔ ذرا بہت قریب کا حال دیکھئے۔ عربوں نے مصر مراکو۔ شام۔ عراق۔ تونس۔ الجیریا میں پہنچ کر ان قوموں کی اصلی زبان کی جگہ عربی زبان میں قومی تعلیم جاری کر دی اس کا اثر ظاہر ہے کہ مصر، مراکو، شام، عراق، تونس، الجیریا کی اصلی زبان کے ساتھ ہی ان ملکوں کی جداگانہ آزادی قومیت صفحہ ہستی سے فنا ہو گئی۔ اور آج یہ ممالک عربی قوم کی ملکیت ہی نہیں بلکہ قومیت کے لحاظ سے بھی عربی ہی ملک سمجھے جاتے ہیں۔ اسپین کے عرب اپنی زبان کے ساتھ ہی اسپین سے فنا ہو گئے امریکا کے مشرق باشندوں نے نئے آباد ہونے والے انگریزوں کی زبان کو اپنی قومی زبان کے طور پر تسلیم کر لیا اور امریکا میں قومی تعلیم انگریزی زبان میں جاری ہو گئی۔ نتیجہ دیکھئے کہ امریکہ کے اصلی سرخ باشندے حسرت سے دیکھ رہے ہیں کہ اُن کے ملک پر پردیسی لوگ بلا شرکت غیرے قابض ہیں اور مشرق باشندوں کی قومیت فنا ہو رہی ہے۔ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں تو ان ملکوں کے اصلی رہنے والوں کا ستیاناس ہو گیا اور باہر کے لوگ بے غل غش ان ملکوں کے مالک بنے بیٹھے ہیں۔ ان مثالوں سے تعلیمی زبان کا حیرت انگیز اثر قوموں کے بننے اور بگڑنے پر جو ہوتا ہے وہ صاف معلوم ہو جاتا ہے

اور فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ ہر خوددار ملک میں ہر غیور ملک میں ہر ایسے ملک میں جو اپنی آزادی کی قدر کرتا ہو، ہر ایسے ملک میں جو اپنے کو غلامی سے بچانا چاہتا ہو۔

(۵)

قومی تعلیم قومی زبان میں ہونا لازمی ہے

ہمارے ملک ہندوستان میں موجودہ تعلیم کا اعلیٰ حصہ چونکہ اجنبی بولی میں ہے اس لئے ہندوستان کی مرد و سرکاری تعلیم قومی تعلیم نہیں کہلائی جاسکتی۔ اور نہ اس درجہ تک پہنچ سکتی ہے کہ اس کو ہم ہندی قومی تعلیم تسلیم کر لیں +

حاجی محمد موسیٰ خاں۔ دتادلی ضلع علیگڑھ

قومی زبان کی حفاظت ہر وقت اور ہر زمانہ میں سوسائٹی کے اعلیٰ طبقوں کی مقدس امانت اور ایک نہایت ہی اہم استحقاق رہی ہے اور ہے + ہر صاحب علم کو چاہیئے کہ وہ اسے اپنی غیر محتمم توجہ کا مطمح نظر بنائے کہ وہ اپنی زبان کو صاف اور سلیجھا ہوا لکھے گا وہ اسے بولے گا اور جہاں تک اس کی طاقت میں ہے اس کے ”حسن“ اور ”کمال“ کی حفاظت کرے گا۔ وہ قوم جس کی زبان اکھڑنا ترشیدہ اور مجھول ہے لازمی طور پر ہر پہلو سے جہالت کے کنگرے پر کھڑی ہے اور کسی وقت ضرور گرے گی + وہ قوم جو اپنی زبان کو بربادی کے ہاتھوں جانے دیتی ہے اپنی دماغی آزادی کے آخری نصف سے دست بردار ہوتی ہے اور دنیا سے ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو جانے کی تمنا کی تصدیق کرتی ہے + (ایک جرمن مصنف) خالد بٹالوی

تحریکِ خیر

۱

پٹنہ میں بیرانام کا ایک گاؤں ہے۔ وہاں ایک ضعیف، بیکس، خستہ حال، گونڈن رہتی تھی، جھنگلی نام تھا۔ اُس کے نہ کوئی اولاد تھی، نہ گھر نہ دوار، نہ جگہ نہ زمین، زندگی کا سہارا صرف ایک بھاڑ تھا گاؤں کے ٹوک عموماً ایک وقت چہینہ یا ستور پر بسر کرتے ہی ہیں۔ اس لئے جھنگلی کے بھاڑ پر ہمیشہ ایک بھیڑ لگی رہتی تھی۔ جو کچھ بھنائی میں ملتا اُسی کو پیس یا بھون کر کھالیتی اور وہیں بھاڑ کی جھونپڑی کے ایک گوشے میں پڑ رہتی۔ وہ روز سویرے اُٹھتی اور چاروں طرف سے بھاڑ جھونکنے کے لئے سوکھی پتیاں بٹور لاتی۔ بھاڑ کے پاس ہی پتیوں کا ایک انبار لگا رہتا تھا۔ دوپہر کے بعد اس کا بھاڑ گرم کیا جاتا تھا۔ لیکن جب ایک دانشی "پاورناماشی" کے دن رواج کے مطابق بھاڑ نہ گرم ہوتا یا گاؤں کے زمیندار ٹھاکر بیرنگھ کے دانے بھوننے پڑتے اُس دن اُسے بھوکے ہی سو رہنا پڑتا تھا۔ کیونکہ ٹھاکر صاحب کا کام بیگار میں کرنا پڑتا تھا۔ اس بیگار کے علاوہ جھنگلی کو اُن کا پانی بھی بھرنا پڑتا تھا۔ وہ ان کے گاؤں میں رہتی تھی۔ اس لئے انہیں اس قسم کی خدمت لینے کا پورا حق تھا۔ اسے جبر نہیں کہا جاسکتا۔ جبر صرف اتنا تھا کہ یہ بیگار بالکل سوکھی ہوتی تھی۔ ٹھاکر صاحب کا خیال تھا کہ اگر مزدوری ہی دے کر کام کرایا تو پھر بیگار کیسی۔ کسان کو پورا اختیار ہے کہ وہ دن بھر بیلوں کو نل میں جوتنے کے بعد شام کو بے آب دانہ کھونٹے سے باندھ دے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو یہ اُس کا رحم نہیں، محض اپنی غرض ہے ٹھاکر صاحب کو مزدوری دینے سے تو اصولاً انکار تھا۔ رہی غرض۔ اس کی کوئی فکر نہ تھی۔ کیونکہ ایک تو دن بھر بھوکے رہنے سے بڑھیا مر نہیں سکتی تھی، بوڑھے بلا کے سخت جان ہوتے ہیں، موت کی نگاہ بچا کر نکل بھاگنے میں مشاق، ورنہ بوڑھے ہوتے ہی کیوں، دوسرے اگر خدا نخواستہ بڑھیا مر بھی جاتی تو اس کی جگہ گاؤں میں دوسرا گونڈ بہت آسانی سے بسایا جاسکتا تھا۔

۲

چیت کا حینہ تھا۔ اور شکرانت کے قبل کا دن۔ آج بہار اور دوسرے مشرقی اضلاع میں نئے

اناج کا ستو کھایا اور خیرات کیا جاتا ہے۔ گھروں میں چولہے نہیں جلتے۔ بھنگی کے بھاڑ کا ہنگامہ خوب گرم تھا۔ بھاڑ کے سامنے ایک میلہ سا لگا ہوا تھا۔ دم مارنے کی فرصت نہ تھی۔ کبھی کبھی وہ گاہکوں کی عجلت پر جھنجھلا پڑتی۔ کیا کروں، دو کے چار ہاتھ بنالوں۔ کھرا نہ بھنے گا تو مجھی کو گالیاں دو گے۔ کراتے میں ٹھاکر صاحب کے یہاں سے اناج کے دو بڑے بڑے ٹوکے آچینچے، اور حکم ہوا کہ ابھی بھون دے۔ بھنگی ٹوکے دیکھ کر سہم اٹھی۔ ابھی دوپہر تھا۔ پھر سورج ڈوبنے سے پہلے اتنا اناج بھوننا دشوار تھا۔ گھڑی دو گھڑی اور مل جاتی تو ایک اٹھوارے کے کھانے بھر کو اناج مل جاتا۔ بھگلوان سے اتنا بھی نہ دیکھا گیا۔ ان جم دو توں کو بھیج دیا۔ اب پہر رات تک مفت بھاڑ میں جلنا پڑیگا۔ اُس پر سینکڑوں چھدے۔ اناج گھٹ گیا۔ کھرا نہیں بھوننا۔ یا بھٹ کھرا کر دیا۔ دیر لگا دی۔ یا سو سا نہ انداز سے دونوں ٹوکے رکھوائے۔

چپراسی نے تند لہجہ میں کہا۔ دیر نہ لگے۔ نہیں تو تم جانو گی، بھنگی۔ ہمیں بیٹھے رہو۔ جب سب دانہ بھن جائے تو لے کر جانا۔ اگر کسی دوسرے کا اناج چھوڑوں تو ہاتھ کاٹ لینا۔

چپراسی۔ ہمیں بھٹنے کی مہلت نہیں ہے۔ لیکن تیسرے پہر تک دانہ بھن جائے۔ چپراسی تو یہ تاکید کر کے رخصت ہو اور بھنگی دانہ بھوننے لگی۔ دوسرے گاہک تکرار کرنے لگے۔ ہم دو گھنٹہ سے کھڑے ہیں۔ ہمارا دانہ نہیں بھوننا۔ اب کل ستو کیے بنے گا؟ بھنگی نے چڑھ کر کہا۔ میں کیا کروں۔ بھندار کا اناج نہ بھونوں تو رہوں کہاں، تمہارے منہ نہیں تھا۔ چپراسی سے کیوں نہ کہا اتنا اناج تو تم اکیلے دے جاتے ہو۔ ہمارا اناج کون بھونے گا؟ لاچار لوگوں نے اپنی اپنی چھبڑیاں اٹھائیں اور چلتے ہوئے بھنگی خدا یا نہ جوش کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھی۔ مگر من بھر سے زیادہ اناج بھوننا کوئی دل لگی تو تھی نہیں۔ اور پھر تھوڑی دیر میں بھوننا چھوڑ کر بھاڑ بھی جھونکتی پڑتی تھی تاکہ تاؤ ٹھنڈا نہ پڑ جائے۔ تیسرا پہر ہو گیا اور ابھی آدھا اناج بھی نہ ختم ہوا۔ وہ ڈری کہ کہیں زمیندار کے آدمی آتے ہوں۔ آتے ہی گالیاں دیں گئیں۔ بھاڑ پھوڑنے لگیں اور تیزی سے ہاتھ چلانا شروع کیا۔ ایک لنگہ دروازے کی طرف تھی، دوسری ناند کی طرف یہاں تک کہ بالو ٹھنڈا ہو گیا اور دانہ سیوڑا لٹنے لگا۔ سو ہے کا دزنی چچو چلاتے چلاتے دونوں

ہاتھ شل ہو گئے، مصیبت کا سامنا تھا۔ اپنی بیکسی پر رونے لگی۔ نہ جانے نارائن کہاں بھول گئے ساری دنیا مرتی ہے۔ مجھے موت بھی بھول گئی۔ جس کی یہاں دُرگت ہے اُسے کوئی وہاں بھی نہیں پوچھتا۔ کون میرے اُفسردہ پونچھتا ہے اپنا خون جلاتی ہوں تو کیسے داغ میسر ہوتا ہے، لیکن جب دیکھو سر پر سوار اسی لئے نہ کہ ان کے گاؤں میں رہتی ہوں۔ ان کی چار انگل دھرتی پر میرا نباہ ہو رہا ہے۔ ایسی کتنی زمین گاؤں میں پڑی ہوئی ہے۔ کتنے ہی بڑے بڑے گھر اُڑے ہوئے ہیں۔ وہاں تو کیسے نہیں ہوتی۔ پھر مجھی پر آٹھوں پہر یہ دھوش کیوں رہتی ہے۔ کوئی ذرا سی بات ہوتی ہے تو یہی دھمکی ملتی ہے کہ بھاڑ کھود کر پھینک دوں گا۔ اُجاڑ دوں گا۔ میرے سر پر بھی کوئی ہوتا تو کیوں یہ دھکے سینے پڑتے۔

وہ انہیں خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ زمیندار کے دونوں چہر اسیوں نے اگر پوچھا، اناج کھن گیا، بھنگی نے بے خوف ہو کر کہا۔ بھن تو رہا ہے۔ دیکھتے نہیں ہو۔ چہر اسی۔ سارا دن گزرا گیا اور تجھ سے اتنا اناج نہ بھوٹا گیا۔ اور تو یہ بھون رہی ہے کہ اناج کا ستیاناس کر رہی ہے۔ یہ تو بالکل سیوڑے ہیں۔ ان کا ستو کیسے بنے گا۔ دیکھ تو آج کٹھا کرتی کیا دُرگت کرتے ہیں نتیجہ یہ ہوا کہ اُسی رات کو بھاڑ کھود کر پھینک دیا گیا۔ اور حراماں نصیب، آفت زدہ بڑھیا کا کوئی سہارا نہ رہا۔

۳

بھنگی کی روٹیوں کے لالے پڑ گئے۔ گاؤں والوں کو بھی بھاڑ کے بغیر تکلیف ہونے لگی۔ کتنے ہی گھروں میں تو دودھ پر کو دا ہی نہ میسر ہوتا۔ لوگوں نے جا کر ٹھاکر صاحب سے سفارش کی کہ بڑھیا کو بھاڑ جلانے کا حکم دیدیتے لیکن ٹھاکر صاحب نے پروا نہ کی۔ بولے یہ شیطان کی خالہ ہے۔ نہ جانے کس گھنٹ میں بھولی ہوئی ہے۔ بھوکوں مرگئی تو سیدھی ہو جائے گی۔ میرا من بھر دا نہ چوہٹ کر کے رکھ دیا۔ سمجھتی ہوگی کٹھا کر میرا کیا لیں گے۔ یہ نہیں جانتی کہ ٹھاکر ہی کی بدولت چین کی بنی بجاتی ہوں۔

ٹھاکر صاحب کی یہ مردانہ باتیں سن کر لوگ لوٹ آئے۔

ایک اسامی نے کہا۔ اس مرے مردے پر کیا تاؤ دکھاتے ہیں۔ کسی مرد سے ہاتھ ملاتے تو

معلوم ہوتا۔

دوسرا بولا۔ ان کی ٹھکانی غریبوں کو پینے ہی میں رہ گئی ہے۔ سرکاری پیادوں کو دیکھ کر تو کانپنے لگتے ہیں، مردوں کے منہ کیا آئیں گے۔ ہاں ہم لوگ ان کے گاؤں میں بے ہیں جو چاہیں کریں۔ کئی دن تک تو بھنگی جوں توں کر کے بسر کرتی رہی۔ سکرانٹ کے دن اناج زیادہ مل گیا تھا لیکن جب وہ اناج خرچ ہو گیا تو فاتحے کرنے لگی۔ کئی آدمیوں نے سمجھا یا تیرا اس گاؤں میں کیا رکھا ہے کیوں کسی دوسرے گاؤں میں نہیں چلی جاتی۔ ہم وہاں چل کر تیرا بھاڑ بنوا دیں گے۔ تیرے رہنے کو ایک جھونپڑی بھی اٹھا دیں گے۔ آرام سے رہنا۔ سب زمیندار ایسے ہی تھوڑے ہیں مگر بڑھیا نے یہ تجویز منظور نہ کی۔ اس گاؤں میں اس نے اپنی مصیبت کے سچاس برس کاٹے تھے۔ یہاں کے ایک ایک پیڑ پتے سے اُسے محبت ہو گئی تھی۔ یہاں وہ بچے بچے کو جانتی تھی۔ بچہ بچہ اُسے جانتا تھا سارا گاؤں اپنا گھر معلوم ہوتا تھا۔ زندگی کے سکھ دکھ سب اسی گاؤں میں جھیلے تھے۔ اب آخری وقت میں اس سے کیونکر ناکا توڑے۔ اس خیال ہی سے اُسے قلع ہوتا تھا۔ دوسرے گاؤں کے سکھ سے یہاں کا دکھ بھی پیارا تھا۔

اس طرح ایک پورا عرصہ گزر گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ ٹھاکر بیر سنگھ اپنے دو تین پہراسیوں کو لئے لگان وصول کرنے جا رہے تھے۔ کارندوں پر انہیں اعتبار نہ تھا۔ نذر نذرانے میں، حق دستور میں، وہ کسی غیر کو شریک نہ کرنا چاہتے تھے۔ کبھی کبھی کہا کرتے زمینداری میں کیا رکھا ہے۔ سرکاری مطالبہ اور عدالت کے خرچ نکال کر سینکڑے میں دس روپے بھی نہیں بچتے۔ اب تو جو کچھ سے وہ یہی ادب پر ہی رقم ہے۔ اسی پر یہ سارا اٹھاٹ بنا ہوا ہے۔ غور کی لگا ہوں سے ادھر ادھر تاکتے۔ اسامیوں کے سلاموں کا تبسم سے جواب دیتے چلے جاتے تھے۔ کتنا رعب تھا، کتنی تعظیم، عورتیں انہیں دیکھتے ہی جھٹ گھونگھٹ بڑھا کر منہ پھیر لیتی تھیں۔ دروازوں پر بیٹھے ہوئے لوگ گھبرا کر کھڑے ہو جاتے تھے کوئی اپنی بگڑی سنبھالنے لگتا۔ کوئی اپنا ناریل آڑ میں رکھ آتا تھا۔ اس شان سے گاؤں کا چکر لگاتے ہوئے وہ بھنگی کی بھڑا کی طرف سے گذرے۔ ادھر تا کن تھا کہ بدن میں آگ لگ گئی۔ بھاڑ کی از سر نو تعمیر ہو رہی تھی۔ بڑھیا مٹی کے کوندے اٹھا اٹھا کر بڑی تیزی سے رکھ رہی تھی۔ شاید اس نے کچھ رات رات ہی کام میں ہاتھ لگا دیا تھا اور طلوعِ سحر سے پہلے ہی اُسے ختم کر دینا چاہتی

تھی۔ آج دیوی کی پوجا تھی۔ رواج کے مطابق انکی چبوترے پر گاؤں کی کنواری لڑکیوں کو سونپ کر دیا جانے والا تھا۔ بڑھیا نے اس تقریب کے لئے ہمیشہ اپنے بھائیں دانہ بھونا تھا۔ اس کی مزدوری وہ کچھ زلیتی تھی۔ اگر آج بھارت تیار ہو گیا تو دانہ کون بھونے کا؟ کسی دوسرے گاؤں سے دانہ بھن کر لایا گیا تو کہیں دیوی جی ناراض نہ ہو جائیں۔ نہ جانے گاؤں پر کیا آفت آئے۔ ٹھاکر بگڑینگے۔ کوئی پروا نہیں۔ دیوی تو خوش ہو گئی۔ ٹھاکر بگڑینگے تو بہت کرینگے میرا بھارت پھر کھدوا دیں گے۔ دیوی بگڑینگے تو گاؤں کی خیریت نہیں۔ اور پھر ٹھاکر صاحب بھی تو دیوی کے بھگت ہیں۔ وہ ایسی جرات کیسے کرینگے؟ دیوی سے تو راجہ بھی ڈرتا ہے۔ ٹھاکر کی کون گنتی۔ ان خیالوں نے بڑھیا کو بھارت کی مرمت پر آمادہ کیا تھا۔ وہ اپنے کام میں ایسی مچو تھی کہ ٹھاکر صاحب کے آنے کی بھی بے خبر نہ ہوئی۔ دفعۃً اسکے کان میں آواز آئی۔ کس کے حکم سے؟

بھنگلی نے چونک کر سر اٹھایا تو ٹھاکر صاحب کھڑے تھے۔ کچھ جواب نہ دے سکی۔

ٹھاکر صاحب نے پھر وہی سوال کیا۔ کس کے حکم سے؟

بھنگلی نے دلیرانہ انداز سے جواب دیا: دیوی جی کے حکم سے۔

ٹھاکر۔ اس گاؤں کا مالک میں ہوں۔ دیوی نہیں۔

بھنگلی نے چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہا: ٹھاکر ایسی بات منہ سے نہ نکالو۔ دیوی سنسار کی مالک ہیں ہم تم کس گنتی میں ہیں؟

ٹھاکر۔ (چہرے میں سے) کیسی چکھڑا بڑھیا ہے۔ دیوی کا خوف دلا کر مجھے نیچا دکھانا چاہتی ہے۔ گرا دو اس کے بھارت کو،

چہرے میں کسی کو اس حکم کی تعمیل کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ٹھاکر صاحب کا غصہ اور بھی تیز ہوا۔ چہرے میں کوئی کھرام اور ڈر پوک کتے ہوئے کھوٹے سے اتر پڑے اور بھائیں زور سے ایک ٹھوکر ماری۔ مٹی گیلی تھی۔ سب کچھ لٹے دیئے بیٹھ گئی۔ دوسری ٹھوکر ناند پر چلائی لیکن بڑھیا سامنے آگئی۔ ٹھوکر اس کی کمر پر پڑی۔ اوندھے منہ گر پڑی۔ آنکھوں کے سامنے تتلیاں اڑنے لگیں۔ اب اسے غصہ آیا۔ کمر سلاتی ہوئی بولی۔ ٹھاکر۔ تمہیں آدمی کا ڈر نہیں ہے تو دیوی دیوتا کا ڈر تو ہو نا چاہیے۔ مجھے اس طرح اُجاڑ کر کیا پاؤ گے؟ کیا اس چارنگل دھرتی میں سونا نکل آئیگا۔ میں تمہارے ہی بھلے کو کہتی ہوں۔ گریب کی ہائے بڑی ہوتی ہے۔

میرادل مت دکھاؤ۔

ٹھاکر۔ اب تو یہاں پر بھاڑ نہ بنائیں گی؟
بھنگی۔ بھاڑ نہ بناؤں گی تو کھاؤں گی کیا؟

ٹھاکر۔ تیرے پیٹ کا ہم نے ٹھیکہ لیا ہے؟ گاؤں چھوڑ کر نکل جا۔
بھنگی۔ کیوں نکل جاؤں؟ بارہ سال کھیت جو تنے سے آسامی کا شتکار ہو جاتی ہے۔ میں تو اسی
جھونپڑی میں بوڑھی ہو گئی۔ میرے ساس سسر اور ان کے باپ دادا اسی جھونپڑی میں
رہے۔ اب جم راج کو چھوڑ کر مجھے یہاں سے کوئی نہیں نکال سکتا،
ٹھاکر۔ اچھا تو اب تو قانون بھی بگھارنے لگی۔ ہاتھ پیر جوڑتی تو چاہے رہنے بھی دیتا۔ لیکن اب
تجھے نکال کر ہی دم لوں گا۔ (چہرے میں اگ لگا دو
دیکھیں اب کیسے بھاڑ جلاتی ہے،

بھنگی نے کہا۔ آج دیوی کی پوجا ہے۔ بھاڑ جلانے دو۔ کل جو جی میں آئے کرنا۔

ٹھاکر۔ تیرا ہی ایک بھاڑ نہیں ہے۔ دوسرے گاؤں میں بھی بھاڑ گرم ہوتے ہیں۔

۴

ایک لمحہ میں شعلے اٹھنے لگے۔ انکی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرنے لگیں پس کسی دیوانے
کی طرح ادھر ادھر دوڑنے لگیں۔ سارے گاؤں کے لوگ اُس کوہ آتشیں کے چاروں طرف
جمع ہو گئے۔ بھنگی اپنے بھاڑ کے پاس غمناک بیٹھی ہوئی یہ دلسوز نظارہ دیکھتی رہی۔ اس کے دل
میں نہ جانے کیا کیا خیالات آرہے تھے۔ مجھ پر اتنا غصہ! اسی ابھاگے پیٹ کے لئے اتنی
مصیبت۔ دھتکار ہے ایسی جنگ کانی پر! کون کوئی میرے آگے پیچھے بیٹھا ہوا ہے کہ یہ سب
اندھرسہ کر بھی جیتی رہوں۔ اب سہارا ہی کیا ہے۔ بھاڑ ہی ٹوٹ گیا۔ پتیاں جل ہی گئیں۔
کیا بھیکہ مانگ کر بیٹ پالوں۔ اتنی عمر بیت گئی۔ کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا یا۔ اب کے
دن کے لئے یہ دھکے سہوں یہ سوچتے سوچتے بڑھیا رونے لگی۔ ناکامی اور یاس کا غلبہ
اور بھی زیادہ ہوا۔ سر پر ایک جنون سا سوار ہو گیا۔ وہ تیزی سے اٹھی اور دھکے ہونے
شعلوں میں گھس گئی۔ لوگ چاروں طرف سے دوڑے لیکن کسی کی ہمت نہ پڑی کہ آگ کے

منہ میں جائے۔ ٹھاکر صاحب گھوڑے پر سوار یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ جوں ہی بڑھیا شعلوں میں گھسی وہ بجلی کی طرح گھوڑے سے کودے اور دم زدن میں ہوا کی طرح شعلوں کے اندر خصل ہو گئے۔ ساری خلقت دم بخود، ہر اس اور وحشت کے عالم میں کھڑی تھی۔ ایک لمحہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ ٹھاکر صاحب بھنگی کو گود میں لئے آگئے باہر نکلے۔ اُن کے کپڑوں میں آگ لگ گئی تھی۔ بھنگی کے کپڑے بھی جل رہے تھے۔ وہ بے ہوش تھی۔ لوگوں نے اپنے کل اتار اتار کر انہیں اڑھا دیئے۔ بھنگی کی جان کی کسی کو پروا نہ تھی۔ سب کے سب ٹھاکر صاحب کی جان کی خیر منا رہے تھے۔ خیریت یہ تھی کہ انہیں آگ سے کوئی گزند نہ پہنچا تھا۔ صرف کہیں کہیں جلد پر آج آگئی تھی۔ مگر بڑھیا کا سارا جسم جھلس گیا تھا۔

آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ شعلے ابھی تک دہک رہے تھے اور ٹھاکر صاحب بڑھیا کو گود میں لئے اُس کی جلن کو اپنے آنسوؤں سے ٹھنڈا کر رہے تھے۔ ان کے گھر کی عورتیں بھی آگئی تھیں۔ کوئی بڑھیا کو ہیکھا جھلتی تھی۔ کوئی اس کے جسم پر مسکے کا لپ کر رہی تھی۔ اور لوگ بھی اپنے اپنے دیہاتی لٹکے کام میں لا رہے تھے۔

دفعۃً ٹھاکر صاحب نے کہا ”کسی کو شہر بھیج دو ابھی ڈاکٹر کو بلا لائے“
ٹھکرائن نے کہا۔ انہیں دیہاتی لٹکوں سے اچھی ہو جائیگی۔ ڈاکٹر کو بلا کر کیا ہوگا،
ٹھاکر۔ اگر وہ مر گئی تو میں زہر کھا لوں گا،
ٹھکرائن۔ اب وہ نہ مرے گی۔

ٹھاکر۔ (دجوش سے) ہاں اگر میرے امکان میں ہے تو اب وہ اس صدمے سے نہ مرے گی
اپنی موت سے مرے گی۔

۵

ٹھاکر بیر سنگھ اپنے علاقہ میں بہت نیک نام نہ تھے۔ اس واقعے نے انہیں منظور خاص عام بنا دیا۔ اسماعیلوں نے بالعموم ان کی جانبازی کی تعریف کی۔ مگر زمینداروں نے اسے فوری جنون سمجھا۔ ایک بڑھیا کے لئے آگ میں کودنا فضول تھا۔ اُس کے مر جانے سے کون سنسار سونا ہوا جاتا تھا۔ کوئی اس کے نام کو رونے والا بھی تو نہ تھا۔ ہاں آپہر جاتے

توالبتہ خاندان بے چراغ ہو جاتا۔

ایک مہینہ گزر گیا تھا۔ بھنگی ٹھاکر صاحب کے مکان میں لیٹی ہوئی تھی۔ بیرنگھ اسکے سرہانے بیٹھ ہوئے تھے۔ دفعۃً بھنگی نے کہا، بھتیاب تو میں اچھی ہو گئی۔ مجھے اپنا بھار کیوں نہیں جھونکتے دیتے۔ یہاں کب تک پڑی رہوں گی۔ بہت دن تو ہو گئے، بیرنگھ نے کہا، ”بھنا جی رو ب گیا۔ کوئی تکلیف ہے؟“

بھنگی۔ ہاں بھتیابی کیوں نہ رو بے گا۔ دودھ اور حلوا کھانے اور آٹھوں پہر پان کی طرح پھرے جانے سے کس کا جی نہ رو بے گا۔ اس سے بڑھ کر اور کون نگلیچھ ہو گی! کیوں بھتیاب۔ جب تم میرے پیچھے آگ میں کھٹے تمہیں ڈرنے لگا۔ یہ بھی نہ سمجھا کہ ایک بڑھیا کے لئے کیوں اپنی جان جو حکم میں ڈالوں۔ میں بہت سوچا کرتی ہوں کہ اُس گھڑی تمہارے من میں کیا بات آئی،

ٹھا کر۔ میں نے کچھ نہ سوچا سمجھا۔ مجھے تو جیسے ایک نشہ سا آ گیا۔ میں آپے میں نہ تھا۔ خود بخود میرے پیر آگ کی طرف دوڑے۔ مجھے ذرا بھی خیال نہ تھا کہ کیا کرتا ہوں، کہاں جاتا ہوں، کیوں جاتا ہوں۔ کچھ بھی ہوش خواہ نہ تھا۔ سب کچھ آپ ہی آپ ہو گیا۔ ایشور کو مجھے کلنک سے بچانا منظور تھا۔ اور کیا +

پریم چند

سب سے محبت کرو اور بہت کم پر اعتماد، لیکن کسی کے ساتھ بُرائی نہ کرو۔ شکسپیر

دنیا میں کوئی چیز بیکار نہیں، سب اپنی اپنی جگہ کارآمد ہیں۔ ”لوگ فیلو“

ان لوگوں کی حالت کس قدر قابلِ رحم ہے جن میں صبر نہیں ”شکسپیر“

اگر تم اپنی زندگانی کو خوشی اور شادمانی کے ساتھ بسر کرنا چاہتے ہو تو صلح پسند بنو ”تھیکرے“
(خالد)

بے صبروں کا دوزخ

میرے دوست یقین نہیں کرتے۔ میرے ذاتی تجربہ کو وہ افسانہ نویس بیان کرتے ہیں۔ ناچار سپلک کو منصف قرار دیتا ہوں۔ تمہیداً متاعرض کر دینا ضروری ہے کہ میرے دوست بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں دروغ گو ہوں۔ دشمن تو واقعی مجھے راستہ باز خیال اور بیان کرتے ہیں کیونکہ محض از روئے بغض میں انہیں کبھی موقع نہیں دیتا کہ وہ مجھے عملاً یا قولاً جو فروش گندم غلاما ہر کر سکیں۔ یہ واقعی میری کمزوری ہے کہ میں ہمیشہ دشمنوں کی عداوت کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہوں اور دانستہ انہیں مجھے جھوٹا ثابت کرنے کی خوشی سے محروم رکھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ہر شریف آدمی کا فرض ہے کہ دشمنوں کی خاطر چند عیوب کو اچھی طرح سے پائے تاکہ ان کو جھوٹی تمت لگانے کے فضول عیب سے بچائے۔ یسوع مسیح کا قول ہے کہ دشمن سے محبت کرو اور محبت اصلی اور سچے معنے میں یہی ہے کہ جس سے محبت کی جائے اس کی اخلاقی عظمت کا پورا خیال رکھا جائے۔ دشمن سے محبت کرنے کے یہی معنے ہیں کہ اپنے میں وہ برائیاں پیدا کرو جو تمہارا دشمن چاہتا ہے کہ تم میں ہوں تاکہ وہ تم کو بغیر جھوٹ بولنے کے بدنام کر سکے اور اس کی اخلاقی عظمت قائم رہے۔ میں یہ نہیں کرتا اور یہ بخل میرا طبعی ہے اور میں اللہ جل شانہ سے ہزار بار دعا کر چکا ہوں کہ میری طبیعت سے یہ بخل کم ہو مگر نہیں ہوتا۔ ہاں مگر دوستوں سے میں نے کبھی اس قسم کی پردہ بازی نہیں کی۔ پھر وہ مجھے کیوں صادق تصور کرتے ہیں؟ اصل وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ عادت سے مجبور ہو کر اس قدر ذلیل ہو گیا ہوں کہ دوستوں سے بھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ گویا ان سے بھی دشمنی کرتا ہوں۔ مگر یہ غنیمت ہے کہ میرے دوست اس قدر میرے محرم راز ہیں کہ ان کو میرے بیسیوں اور عیوب معلوم ہیں۔ اور اس لئے وہ برسرِ پر خفا نہیں ہوتے۔ بلکہ کیا تعجب ہے کہ وہ میری راستہ بازی کو ایک قسم کا مرض تصور کرتے ہوں۔ اور اس لئے چنداں معترض نہ ہوں۔ ایشیا میں جہاں اور امراض کا زور ہے یہ بھی بمنزل فیل پائی کسی کشتی نفس میں موجود ہے گو عام نہیں اور ممکن ہے کہ میں بھی اسی مرض میں مبتلا ہوں۔ شاید ایسا ہی ہو کیونکہ آخر میں یورپین تو نہیں۔ ہوں تو وہی کالا آدمی۔ خیر آدم بر سر مطلب۔

۱۹۱۸ء کے انفلو انزا کی وبا کی اعداد شماری پر میرا بھی احسان ہے۔ صرف اعداد شماری میں ہی نہیں بلکہ ڈاکٹر پردری میں بھی میں نے حصہ لیا۔ بہت سے لوگ ضرور ایسے تھے کہ جنہوں نے اس نادر موقع پر بھی خست سے کام لیا اور جو ڈاکٹروں کو فیس دے بغیر چل دے یا اس سے بتر کفیس دے بغیر اچھے ہو گئے۔ ڈاکٹر حق بجانب ہو گئے اگر انہیں کبھی معاف نہ کریں مگر میں اس زمرہ میں نہ تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے میرا پورا علاج کیا۔ میں سخت احسان فراموش ہو گیا۔ اگر ان کی خدمات کا اعتراف نہ کروں مگر مرض کو دوا سے ضد تھی۔ ”مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی“ انفلو انزا سے ڈبل فرینا ہوا۔ تھوک سفید سے گلابی۔ گلابی سے گلنار۔ سانس ایک کی بجائے چار۔ غذا بند۔ غشوں کا انبار۔ سب کچھ ہوا۔ ساتھ والے کمرے میں صنفِ نازک کا ایک لاجواب نمونہ اپنے انفلو انزا کے باعث نہیں بلکہ میری بُری حالت کی خبر کی وجہ سے جاں بحق ہوئی۔ جیسا کہ مشہور ہونا چاہیے تھا مشہور ہو گیا کہ میں مر گیا ہوں۔ فرشتوں نے بھی غالباً باہر سے ہی سنا اور وہ میرے ہی کمرے میں داخل ہوئے فرشتے اس معاملے میں بالکل بے قصور تھے۔ جنگِ یورپ کے ٹھکے ہوئے۔ لاشیں گھسیٹتے گھسیٹتے چور ہو چکے تھے۔ اگر جلدی میں ایک کمرے کی بجائے دوسرے میں داخل ہو گئے تو کیا تعجب۔ ایک نے میری روح سے کہا چل، روح تھر تھر کانپتی ہوئی نکلی۔ ایک نے اس طرف ایک نے اُس طرف سنبھالا۔ تھوڑی دُور جا کر روح کو پھر انہوں نے ایک عجیب قسم کا جسم پہنایا اور آنا فانا اس میرے پرانی روح والے نئے جسم کو ایک عالیشان عمارت کے بیرونی کمرے میں داخل کر دیا۔ روح نکالنے والے فرشتے چل دیئے۔ اس کمرے میں اور بھی میری جیسی بیسیوں ہستیاں تھیں۔ مگر سب خاموش۔ اتنے میں چند محافظ داخل ہوئے اور ہم سب کو ہانک کر لے گئے۔ ایک محافظ نے دوسرے سے کہا کہ ہاں یہ سب ساتویں طبقے والے ہیں۔ میں اپنی کرتوتوں سے واقف تھا۔ کچھ متعجب نہ ہوا۔ سمجھ گیا کہ جہنم کا ساتواں طبقہ میری رہائش کے لئے موزوں خیال کیا گیا ہے۔ کسی حد تک خوشی ہوئی کہ غنیمت ہے کہ گیارہواں نہیں یا اکیسواں نہیں۔ گو مجھے کوئی علم نہ تھا کہ کل کتنے طبقے ہیں مگر خود پسندی نے وہاں بھی نہ چھوڑا۔ یہی جی میں آیا کہ تجھ سے ہزاروں اور بدتر ہو گئے اسی لئے تو تجھے ساتواں طبقہ ملا ہے۔ آنا فانا ساتویں طبقہ کے دروازہ

پر پہنچ گئے۔ (جنم کے کارندے بلا کے پھرتیلے ہیں۔ رستہ بھی نہ دیکھنے دیا اور جھٹ لے کر پہنچ گئے) وہاں ایک ایک کا جائزہ لیا گیا۔ میرا نمبر سب سے اخیر تھا۔ باقی تو سب داخل کئے گئے۔ مگر میرے داخلہ کے وقت کچھ آپس میں ان محافظوں کے اشارے ہوئے جس سے میں یہ سمجھا کر کچھ غلطی ہوئی ہے۔ چنانچہ ایک اخیر ہی اشارے سے جس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں ”یہاں کانہیں“ مجھے نکالا گیا۔ اب مجھے ایک ایسی جگہ لایا گیا جو میرے خیال ناقص میں جہنم کا *hellmouth* تھا یہاں جب تک کہ وہ رجسٹر دیکھیں مجھے ادھر ادھر تاک جھانک کا موقع ملا۔ کوئی ایسی الو کھی بات نظر نہ آئی۔ بھیڑ تھی۔ متوحش بھیڑ تھی۔ مگر اس قسم کی بھیڑ بہت دفعہ ریل کے اسٹیشنوں پر درجہ سوئم کے داخلہ پر میں دیکھ چکا تھا۔ محافظوں کے چابک اپنا کام کر رہے تھے مگر آہ و بکا کچھ نہ تھی۔ سب ہستیاں صرف اس سراسیمگی میں تھیں کہ ہم کہیں رہ نہ جائیں۔ شاید اس جہنم کی یہی مقررہ سزا ہو کہ انسان سفر کی سراسیمگی میں ابدی طور پر گرفتار رہے۔ ریل سامنے۔ ٹکٹ پاس مگر داخل ہونا نہیں ملتا۔ چابکوں کی جسمانی تکلیف محسوس نہیں ہوتی کیونکہ روحانی خوف طاری ہے کہ ریل کہیں چل نہ دے۔ عورتیں۔ بچے۔ بوڑھے پاؤں تلے روندے جارہے ہیں۔ کوئی کسی کا رفیق نہیں۔ مددگار نہیں پر ساراں حال نہیں۔ پیچھے سے دھکیلے جارہے ہیں۔ آگے سے پیچھے گھسیٹے جارہے ہیں۔ گٹھریاں۔ لائٹھیاں ڈاڑھیاں۔ پگڑیاں۔ دوپٹے۔ آنکھیں سب خلط ملط ہو رہی ہیں۔ انسانی اضطراب کی واقعی خوفناک تصویر تھی اور بہت سخت سزا۔ میں ابھی یہ دیکھ ہی رہا تھا کہ دفتر کے کسی بڑے صاحب نے کسی ماتحت کو کہا ”ڈیم۔ ڈیم فول۔ بہشت کا پتھر (یہ شاید وہاں کی گالی ہو)۔ نکالو۔ بے صبر لوگ کے دفنرخ میں لے جاؤ“

چنانچہ میں اس دفتر سے نکالا گیا۔ مجھے نکالتے نکالتے بابو صاحب نے کچھ اور بھی نکالا۔ یعنی اپنا خصہ۔ ایک لات۔ دو ٹکے۔ اور کئی زبانی تبرکات۔ میرے حصے میں آئے۔ باقی دفتر کے چہرہ اسیوں میں بنے۔ مگر اس لکھ کو بی میں بلا کی تاثیر تھی۔ میں دھواں دھار خلا میں سے لڑھکتا ہوا۔ قلابازیاں لگاتا ایک عمارت کے دروازہ پر پہنچا۔ دروازہ خود بخود کھل گیا۔ میں سر پہلے پاؤں پیچھے لڑھکتا ہوا دروازہ میں داخل ہوا۔ دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ از غیب ایک کاغذ میرے ہاتھ میں دیا گیا۔ انفلوانزا سے پہلی زندگی میں میں ترقی کے لئے

ہمیشہ بے صبر رہتا تھا۔ چنانچہ اس کاغذ پر صرف یہ لفظ لکھے ہوئے تھے۔

تمہاری ترقی ہوگی

مگر سکند سکند میں ہی فقرہ بدل کر یوں ہو جاتا تھا۔

ابھی نہیں

میری وہ روحانی ایذا قابل بیان نہیں جب کہ ترقی ہوگی، والا فقرہ پل پل میں بدل کر ”ابھی نہیں“ ہو جاتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ میری دائمی سزا ہے۔ کوئی الفاظ بیان نہیں کر سکتے کہ یہ سزا میرے لئے کتنی بڑی تھی۔ یا یہ کہ انصاف الہی نے کس قدر موزون سزا میرے لئے تجویز کی۔ ”ہوگی“ ”ابھی نہیں“ ”نہیں“ ”ہوگی“ ”نہیں“ ”ابھی نہیں“ کوئی دوزخ ان سیدھے سادھے دو تین لفظوں کے بار بار بامجبوری پڑھنے اور محسوس کرنے سے بدتر نہیں ہو سکتا۔ اگر میرا بس چلتا تو اپنی اس بے صبر شخصیت کو سو سو طرح سے قتل کرتا جس نے مجھے یہ روز بد دکھایا کہ ہمیشہ کے لئے ”ہوگی“ ”نہیں ہوگی“ کے چکر میں گرفتار رہو۔ رنج۔ غصہ۔ پشیمانی گھٹا باندھ باندھ کر میرے قلب پر حملہ کرتے تھے۔ ”ہوگی“ ”نہیں ہوگی“ کے تازیانے میری روح کی کھال ادھیڑے ڈالتے تھے۔ مجھے تو یہ معلوم ہوا کہ ہزاروں سال مجھے یہ سزا ملی ہے مگر ایک بارگی آسمان سے شعلہ سان ایک پنجہ گرا اور مجھے اٹھا کر چلتا بنا۔ تھوڑی دیر کا مجھے پتہ نہیں کہ کیا ہوا۔ مگر آخر مجھے ہوش آیا اور میں ایک نئی قسم کی عمارت میں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا جسم مجھے مل گیا ہے۔ ابھی اوپر کچھ دیکھنے نہ پایا تھا کہ ایک نہایت شاندار بزرگ اس کمرے میں وارد ہوئے۔ فرمانے لگے۔

”مسٹر۔ مجھے آپ سے ایک غلطی کا اعتراف کرنا ہے۔ میں ملک الموت ہوں۔

میرے کارندوں نے آپ کو اٹھالانے میں غلطی کی۔ آپ کو قبل از وقت جو تکلیف ہوئی وہ آپ معاف کریں۔ چلئے اپنے گھر“

میں۔ جناب۔ کیا۔ یہ آپ کا دولت خانہ ہے؟

ملک الموت۔ نہیں۔

میں۔ بہت بہتر۔ پھر آپ تشریف لیجائیے۔ میں آپ کو غلطی معاف کرتا ہوں۔ مگر میں واپس

جانا نہیں چاہتا۔ مجھ سے پھر کوئی بے صبری کی بات ہو جائے گی اور میں بے صبروں کے دوزخ میں اب دوبارہ جانا نہیں چاہتا۔ میں اسی جگہ رہوں گا۔ یہ مجھے پسند ہے۔ صاحب خانہ اگر نکالینگے تو میں نکل جاؤں گا۔

ملک الموت - یہ ضد اچھی نہیں۔

میں - ضد جناب کی طرف سے ہے کہ جاؤ اپنے گھر۔ میری طرف سے کوئی ضد نہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں کن صاحب کا مہمان ہوں۔ جب آپ کا یہ گھر نہیں تو آپ بھی مہمان ہیں۔ ایک مہمان کو دوسرے مہمان کے نکالنے کا حق تو کبھی نہیں سنا۔ ملک الموت - اچھا میں صاحب خانہ کو بلاتا ہوں۔

اتنے میں ایک شاندار مگر نہایت ہی پیاری صورت والے بزرگ وارد ہوئے۔ اور مجھ سے مخاطب ہوئے۔

”مسٹر۔ آپ نے ایک ایسا لفظ استعمال کیا ہے جس سے میں قریباً مجبور ہو جاتا ہوں بالخصوص اس لئے کہ آپ حتی الامکان مہمان نواز ضرور ہیں مگر میرے اختیارات بہت محدود ہیں۔ میں فرشتوں کے کام کا نگران ہوں۔ اگر کوئی سہو ہو جائے تو اسے درست کرنا میرے سپرد ہے۔ آپ کے متعلق محض سہو کچھ کارروائی عمل میں آئی جسے درست کرنا میرا فرض تھا چنانچہ میں آپ کو دوزخ سے نکال لایا۔ مگر یہاں میں آپ کو رکھ نہیں سکتا۔

میں - آپ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ آپ کا گھر ہے۔ آپ خود مجھے یہاں لائے۔ لازمی طور پر میں آپ کا مہمان ہوا۔ آخر مہمان کا آپ کے ہاں کم سے کم حق کیا ہے؟ میں ناکارہ سہی مگر اس کم سے کم حق سے تو محروم نہیں ہو سکتا۔ آپ کی شفقت سے بعید نہ ہو گا اگر مجھے اس حق سے فیضیاء ہونے دیں۔

نگران فرشتہ - میں آپ کو صرف اتنے وقت تک رکھ سکتا ہوں جو آپ کی زبان میں تین دن سمجھا جاتا ہے۔

میں - مگر اس عرصے میں مجھے آپ بہشت و دوزخ کی سیر تو کرا سکتے ہیں۔ نگران فرشتہ - بہشت کی ہرگز نہیں۔ کیونکہ وہاں کے کام میں سہو کو دخل نہیں میرا منصب

صرف سہوی امور کی درستی ہے۔

میں۔ بہت بہتر۔ جس امر میں آپ کا اختیار نہیں اس کے لئے میں آپ کو کیسے کہوں۔ مگر میری بیوی کہاں ہیں؟

ملک الموت۔ یہی تو غلطی ہوئی۔ ان کو لانا تھا آپ کو لے آئے۔ ان کو بہشت میں لیجانا تھا وہ اب وہاں جا رہی ہیں۔

میں۔ کیا میں ان سے مل سکتا ہوں؟

ملک الموت۔ جی نہیں۔

میں۔ کیوں۔

ملک الموت۔ ان کا یہ رتبہ نہیں۔

میں۔ تو آپ مجھے وہاں لیجائیں۔ میرے معزز میزبان خدا کے لئے میرے حال پر رحم کر دو۔ مجھے اس اپنی ملکہ سے مل لینے دو۔

نگران فرشتہ۔ پھر آپ نے وہی بے صبری کی بات کی۔

میں۔ (رو کر) معاف کیجئے۔ اللہ معاف کیجئے مگر یہ کہاں کا دستور ہے کہ میاں مہمان اور بیوی الگ تھلک۔ ختم مرسلیں کی خاطر انہیں اپنا مہمان بنائیے۔

نگران فرشتہ۔ اے ضدی ذی روح۔ کاش کہ یہ تمہاری ضد نیک کاموں میں صرف ہوتی۔

میں۔ اس سے زیادہ کیا نیک کام ہو سکتا ہے کہ میں اپنی رفیق زندگی کو دلی پیار سے دیکھنا چاہوں؟

نگران فرشتہ۔ سچ کہتے ہو اور یہی جذبہ اس ازلی نور کا جزو تمہیں ملا ہے جو تمہارے میں سے نیک اور صابر لوگوں کو فرشتوں سے بھی بالاتر رتبہ دیتا ہے۔

میں۔ جزاک اللہ۔

زہرہ۔ میری زہرہ۔ میرے دل۔ جان کی مالک زہرہ۔ میری ہر نیکی کی محرک زہرہ۔ ہر پاک خواہش کی موید زہرہ آئی۔ مسکرائی۔ اس کے پاؤں میں نے چومے۔ نئے انداز سے کہنے لگی۔

”پیارے صبر کرو گے تو جلد ملیں گے“

پیشتر اس کے کہ میں کچھ کموں زہرہ چلی گئی۔
نگران فرشتہ - آئیے آپ کو دوزخ کی سیر کرادوں۔
میں - جی حاضر۔

نگران فرشتہ - آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپ کیوں ایسی ہولناک جگہ کی سیر کرنا چاہتے ہیں؟
میں - جی صرف اس لئے چونکہ مجھے دنیا میں واپس جانا ہے میں دوست دشمن سب کو آگاہ کروں
ان کے دلوں میں نور ایمان کے شعلے بھڑکاؤں۔ سچے دل سے ان کی خدمت کروں۔ منت سے
محبت سے۔ آنسوؤں سے انہیں یقین دلاؤں کہ خدا کی رحمت بے پایاں ہے مگر اس کے
رحم کو۔ انصاف کو بخشش کو بہت نہ آزماؤ۔ بچو بچو۔

الہکم اللہ کا شرحتی ذرئہ المقابر

نگران فرشتہ - شوق خدمت بھی اسی نور کا ایک جزو ہے جو انسان کو باقی ذمی الارواح سے ممتاز
کرتا ہے۔ مگر تم چاہے کچھ کرو دنیا میں کوئی بھی تمہاری بات کا اعتبار نہیں کریگا۔ سب تم پر ہنس
گے۔ اس بات پر یقین رکھو۔

میں - کوشش کرنا میرا فرض ہے اور میں ضرور کوشش کروں گا۔

نگران فرشتہ - شاباش - تمہارے ملک میں صبر کے معنی غلط مشہور ہیں۔ صبر کے صحیح معنی
استقلال کے ہیں اور اسی معنی میں وہ آئیہ رحمت ہے۔

آن اللہ مع الصابرین

تکلیف کا برداشت کرنا صبر نہیں۔ باوجود ظاہری تکلیف کے نیک کام میں مستعدی سے
لگے رہنا اور نہ ملنا اصل صبر ہے۔ خدا تمہیں اصلی صبر کی توفیق دے۔

ہم ابھی دوزخ کے صرف چند قطعات میں پھرے تھے کہ پھر بجلی کی چمک ہوئی۔ کرکراہٹ
سے ایک پنچہ ہماری جانب لپکا اور ہم دونوں کو اٹھا کر پھر اس نگران فرشتہ کے گھر میں چھوڑ گیا
اور جاتے جاتے ایک فرمان نگران فرشتہ کو دے گیا۔ انہوں نے مجھے اس کا مطلب یوں بیان کیا۔

نگران فرشتہ - اے میرے عزیز مہمان - حکم ربی ہے کہ میں تجھے زیادہ مہمان نہ رکھوں۔ تو نے ایک
بہشتی کے پاؤں چومے ہیں اس لئے دوزخ کی آگ تجھ پر حرام کی گئی ہے مگر گذشتہ گناہوں کی

پاداش میں یہ حکم نافذ ہوا ہے کہ جتنی تیری جسمانی زندگی دنیا میں باقی ہے وہی تیرے لئے دوزخ کا حکم رکھے۔ اب جاؤ۔ خدا حافظ ۷

میں اب زندہ ہوں۔ دوست رشتہ دار سب مبارک باد دیتے ہیں کہ میاں تم بچ گئے۔ انہیں کیا پتہ کہ یہ زندگی میرے لئے کیا حکم رکھتی ہے۔ اور انہیں کیا پتہ کہ میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ مجھے اب وہ پرچہ ”ہوگی“ ”نہیں ہوگی“ پھر نہیں ملیگا۔ انہیں کیا معلوم کہ بہشت کا پاس مال کے بعد اگر کوئی دوسرا دینے والا ہے تو وہ نیک بیوی۔ انہیں تو صرف یہ خبر ہے کہ میں افسانہ نویس کرتا ہوں۔ کاش کہ وہ سمجھیں۔

آخر میں میں اتنا واضح کرنے کی جرات کرتا ہوں کہ دوزخ کے مشاہدہ کا حال میں پھر بشرط صحت و زندگی لکھوں گا مگر جو چند قصص تھوڑے سال ہوئے مشہور ہوئے تھے وہ بہت حد تک بے بنیاد ہیں۔

مجھے ٹھیک یاد نہیں مگر کسی ایرانی نے مشہد مقدس کے مظالم کے بعد کچھ مشہور

کیا تھا جس کا لب لباب یہ ہے۔

”مسٹر گلیڈسٹون نے دوزخ میں جا کر باقاعدہ میونسپل کمیٹی قائم کی ہے۔ اس کمیٹی کے انتظام سے دوزخ میں جا بجا مصلحتوں کے گھر بنائے جا رہے ہیں (مصلحت مصلحت وہ مصلحت ہے جس پر آگ کچھ اثر نہیں رکھتی۔ اب تو وہ ایک عام چیز ہے۔ یورپ کی ایجاد ہے جبرن قیصر نے بھی دوران جنگ میں ایک گھر یا کمرہ مصلحت مصلحت کا طیاروں کے آتش بارگولوں سے بچنے کے لئے بنوایا تھا) اندر ہی اندر سے سرنگ لگا کر بہشت سے پانی لایا گیا ہے۔

دروازوں پر یورپین فوج کا پرہ ہے۔ بغیر پاس کے یورپین بھی اندر نہیں جاسکتا۔ ایشیائی تو پاس بے پاس سب محروم ہے۔ پانی کم ہو جانے سے بہشت کی کساد بازاری ہے بلکہ مسلمان لوگ وضو کے لئے بھی پانی سے تنگ ہیں۔ دوزخ بڑا بارونق ہوتا جاتا ہے۔ علمی مشاغل۔ فلسفیانہ مباحثے۔ ناچ رنگ سب کچھ جاری ہے۔ مسلمانوں کے لئے جو ایک بڑا طبقہ دوزخ میں محفوظ تھا اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے گلیڈسٹون دوزخ میں الحاق ہو رہے ہیں۔ بڑے بڑے پادشاہوں کو بھی اب جگہ نہیں ملتی وغیرہ وغیرہ“

جہاں تک میں نے دوزخ کو دیکھا یہ سب قصے مبالغہ آمیز ہیں۔ صرف ایک جگہ واقعی پرہ تھا اور اس پر بڑے موٹے لفظوں میں لکھا تھا ”Reserved for the Czar“ یعنی زار روس کے لئے مخصوص ہے۔ دوزخ میں کم از کم مسلمانوں کے اٹاک بدستور قائم ہیں۔ بلکہ ترقی پر ہیں۔ یہ محض افترا اور مسلمان قوم کی ہتک ہے کہ وہ دوزخ سے بھی بے دخل کئے جا رہے ہیں۔ پادشاہوں کا بہت بڑا ہجوم ہے۔ بیسیوں میں نے خود دیکھے جن کے آگے سونے چاندی کے سکوں کے ڈھیر پڑے ہیں اور وہ بڑی تندہی سے جیب پڑ کر رہے ہیں۔ مگر دوزخ کے درزی ناقص ہیں۔ سب پادشاہوں کے جیب پھٹے ہوئے تھے۔ وہ اشرفیاں ڈالتے جاتے تھے اور اشرفیاں گرتی جاتی تھیں۔

بہشت کی تباہی کا حال بھی غالباً قیاسی ہے۔ جب دوزخ والا قصہ سچ نہیں تو یہ بھی ضرور بناوٹ ہوگی کہ اندرونی سرنگوں کے باعث بہشت کی نہروں میں پانی کم ہے۔ پیٹر مچھا رہے ہیں۔ پھل کا نام نہیں۔ مٹی کے کوزے جا بجا ٹوٹے پڑے ہیں۔ میسواکوں کے ڈھیر۔ ڈھیلوں کے انبار سے گلوگیر ہیں۔ نیلے تہ بند پھٹے پرانے جا بجا لٹک رہے ہیں۔ کھجور کی گٹھلیاں۔ زم زمیوں کے ٹین جاناخاؤں میں لپٹے پڑے ہیں۔ امام بے تنخواہ۔ موذن فاتحے سے۔ مسجد میں نہ درزی نہ بوریا نہ چرائی سیرری رائے ناقص میں یہ سب قصے ہیں۔ مگر میں خواہ مخواہ کسی ایرانی پر دروغ گوئی کی تمہت فہرناہیں چاہتا۔ ممکن ہے کہ جس طرح مجھے ملک الموت کی غلطی سے دوزخ کی سیر کا موقع ملا انہیں بہشت دوزخ دونوں کی سیر کا موقع ملا ہو۔ پبلک خود انصاف کر سکتی ہے۔ دروغ برگردن راوی۔

بہت کوشش کی کہ اصلی مطلب پبلک پر بھی ظاہر نہ کروں مگر ایک طاقت ہے جو مجبور کر رہی ہے۔ مجھے ظاہر کرنا پڑتا ہے۔ اوپر یہ لکھ چکا ہوں کہ میرے دوستوں کو کیا پتہ کہ میری زندگی میرے لئے کیا حکم رکھتی ہے وہ حکم یہ ہے۔

ہر صبح کو میرے ایک گذشتہ زندگی کے بے صبری میں ضائع کردہ دن کو میرے سامنے لایا جاتا ہے۔ اس دن کو انسانی صورت دی جاتی ہے۔ صورت کس کی؟

بغینہ میری

پھر مجھے ایک کند۔ ناکارہ۔ زنگ آلود چھری دی جاتی ہے۔ پھر میں گھنٹوں اپنے آپ کو فوج کرتا

ہوں مرنے والے کے دم واپس کی نگاہیں کلیجہ چھلنی کئے ڈالتی ہیں۔ مگر میں کجخت قسائی انسانی گلو پر نہیں اپنے گلو پر آ رہ کشی کرتا جاتا ہوں۔

شام کو ہر روز میرے یہ گلو بربیدہ مقتول مجھے اکٹھے ملتے ہیں۔ ایک کچھری سی ہوتی ہے۔ سب کے سب عجب دردناک طریقے سے میری طرف انگلیاں اٹھاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں

یہ ہے ہمارا قاتل

ہائے وہ میری مجرمت۔ اس پر عدالت کا سوال ”کیوں؟“ ستم۔ اے دوستو!۔ اے پبلک! اے آنے والی بنی نوع انسان کی نسلو! بتاؤ اُس کیوں کا کیا جواب دوں۔ تمہارے لئے یہ قصہ سنی۔ مگر میں تو روز صبح کو یہ ڈراما اور شام کو یہ مقدمہ دیکھتا ہوں میرے لئے تو قصہ نہیں۔

فاعتبرو یا اولی الالبصائر

زندہ دوزخی

شاعر کا فرض۔ وہ شاعر جو دنیا کو رنج بنانے کی کوشش نہیں کرتا شاعر نہیں۔

”شاعر پیدا ہوتا ہے بنایا نہیں جاتا“ درست، لیکن خام پیدا ہوتا ہے۔

قوم اور ادب۔ دنیا کی کوئی قوم ادب کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی۔

زبانیں اور جنگ۔ دنیا کی تمام زبانیں مصروفِ پیکار ہیں اور رہیں گی۔

اڈیٹر کو بہت وعدے نہیں کرنے چاہئیں۔

اڈیٹر سے بہت توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔

خالد۔

ٹیلیفون اور ہمزاد

ہمزاد کی نسبت سنار کرتے تھے کہ جب وہ کسی کا تابعدار ہو جاتا ہے تو رات کو سونے نہیں دیتا ہر وقت باتیں کرتا رہتا ہے اس کا علاج یہ ہوتا تھا کہ اس کو درخت کے پتے شمار کرنے کا حکم دیدیا جاتا تھا۔ تاکہ وہ اس مشکل کام میں مشغول رہے اور عامل ہمزاد کچھ دیر آرام کر سکے۔ مگر نئے زمانہ کے ہمزاد لینے ٹیلیفون میں یہ بات نہیں ہے وہ کسی وقت بھی چین نہیں دیتا۔ اور اس کے چپ کرنے کی کوئی ترکیب ایجاد نہیں ہوئی۔

ہمزاد کالی صورت کا ایک چھوٹا سا بھتتا ہوتا ہے اور عامل کی پیٹھ کی طرف کھڑا ہو کر کان میں باتیں کرتا ہے۔ ٹیلیفون میں بھی وہی اوصاف ہیں۔ چھوٹا قد۔ کالی صورت کان میں لگنا۔ اور ہمزاد کی طرح کبھی صاف بولنا کبھی باتوں کو چبا جانا۔

ہمزاد ہندوستانی بھوت ہے۔ ٹیلیفون دلایتی بھوت ہے۔ ہمزاد تاج کرنے میں صرف وقت خرچ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں وقت بہت ارزاں چیز ہے۔ ٹیلیفون روپے کے زور سے تاج ہوتا ہے کہ دلایت میں روپیہ بہت ضروری چیز ہے۔ ہمزاد اپنے عامل کو لوگوں کی نظروں میں مرغوب بنا دیتا ہے کیونکہ صد ہا آدمی عامل ہمزاد کے پاس آتے ہیں اور اس سے خبریں دریافت کرتے ہیں پوشیدہ چیزیں نکالتے ہیں۔ وہ عامل سے ڈرتے ہیں۔ اور اس کی عزت بھی کرتے ہیں اور بعض لوگ نذر نیا بھی دیتے ہیں۔ ٹیلیفون بھی اپنے مالک کی ضرورت کو لوگوں کی نظروں میں بڑھا دیتا ہے۔ جن کے ہاں ٹیلیفون نہ ہو وہ مالک ٹیلیفون کے پاس عاجزانہ خوشامدیں کرتے ہوئے آتے ہیں اور ٹیلیفون میں دو باتیں کر لینے کی اجازت مانگتے ہیں اور مالک صاحب انداز غرور و تمکنت سے اجازت کی گردن ہلاتے ہیں۔

ہمزاد ٹیلیفون میں ہندوستان ویورپ کی مکمل تہذیب موجود ہے ہمزاد صرف اپنے عامل کو نظر آتا ہے۔ اپنے عامل سے بات کرتا ہے اور اس کے سوا کسی غیر سے مخاطب نہیں ہوتا اور ٹیلیفون یورپین عورتوں کی طرح ہر شخص سے بات کرنے میں آزاد ہے اور پوشیدہ رہنے کی عادت ان میں نہیں ہے۔ ہمزاد کبھی نقدی نہیں مانگتا۔ ٹیلیفون سال کے سال اپنا ٹیکس لینے آن کھڑا ہوتا ہے۔

ہمزاد میں ایسا کوئی پرزہ نہیں ہوتا جسکے خراب ہونے سے سارا ہمزاد بیکار ہو جائے ٹیلیفون میں یورپ کی خصوصیت پوری طرح موجود ہے۔ یورپ کی ہر چیز کا قاعدہ ہے کہ اسکے وجود میں دو چار۔ دس پانچ۔ سو پچاس۔ ایسے ٹکڑے جڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ اگر ان میں کا ایک بھی بگڑ جائے تو باقی کے سب اچھے بچھے پڑزے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیکار بیٹھ جاتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ جناب جب تک ہمارے بھائی کو منانے کے لئے کچھ خرچ نہ کرو گے ہم سب کام نہ کر سکیں گے۔ کہو بھائی تمہیں پرانی بات سے کیا سروکار تم اپنا کام کئے جاؤ تو جواب ملتا ہے کہ ہم میں کا ہر پرزہ ایک خاص کارخانہ میں تیار ہوتا ہے اور ہمارے ملک والوں نے جان بوجھ کر یہ حکمت رکھی ہے کہ خریدار ہر کارخانہ کا محتاج ہے۔ یہ نہ ہو تو سب لوگوں کا کام مساوی حیثیت میں نہ چل سکے۔

ہمزاد کی تکلیف شخصی ہوتی ہے۔ وہ صرف اپنے عامل کو ستاتا ہے اور جگاتا ہے۔ ٹیلیفون جمہوری ملک کا ہے اس کی تکلیف بھی جمہوری ہے۔ تمام گھروالوں کو انکی ذات سے اذیت ہے۔ گھڑی گھڑی گھنٹیاں بجاتا ہے جا کر بوجھو کیا کہتے ہو۔ جواب دیتا ہے آپ کہاں سے بولتے ہیں غصہ آتا ہے کہ کیا بے تمیزی کا سوال ہے سب لوگ منہ سے بولا کرتے ہیں۔ پھر یہ پوچھنے کی کیا بات ہے۔ یوں کہنا چاہیے تھا کہ آپ کون صاحب ہیں اور کس مقام پر ہیں یہی ایک تکلیف نہیں ہے ٹیلیفون میں ہمزاد قسم کی تکلیفیں ہیں۔ اول تو نمبر ملانے والے ستاتے ہیں کبھی جلدی نمبر ملا دیتے ہیں کبھی اتنی دیر لگاتے ہیں کہ کن بات (ریسور) کو کان سے لگائے جائیں لیتے رہو اور ہو ہو پکارے جاؤ وہاں سے نمبر بلیر کا جواب نہیں آتا۔ اور آتا ہے تو ایسا جیسا کوئی کحاف اوڑھے لیٹا ہے اور غنودگی میں بولتا ہے۔ کبھی فوراً کمدیا جاتا ہے انگیج (مشغول) ہے۔ دوسری جگہ (رکا ہوا) ہے۔ حالانکہ اس میں صحت نہیں ہوتی۔ اور نمبر ملانے کی محنت سے بچنے کے لئے کمدیا جاتا ہے۔ کبھی ایسے لوگ ٹیلیفون میں بات کرنی چاہتے ہیں جنکو کبھی اس دلایتی بھوت کے ذریعہ بات کرینکا اتفاق نہیں ہوا۔ انکی ادھوری باتیں اور گھبراہٹ انسان کو تکلیف دیتی ہے کبھی شریر لوگ اپنے دل کے بھارتی ٹیلیفون کے ذریعہ نکالتے ہیں اور جو جی چاہتا ہے کہتے ہیں اور کوئی گرفت انکی نہیں ہو سکتی کیونکہ دلایتی بھوت کے عجائبات میں ایک یہ بات بھی ہے کہ اسکو ناجائز استعمال کرنے کی آزادی بھی ہوتی ہے۔

الغرض ہمزاد اور ٹیلیفون میں یہی فرق ہے جو آسمان اور زمین میں ہے۔ جو کالے اور گورے میں ہے جو جاہل اور عالم میں ہے۔ اور ان دونوں کے حاصل کرنے میں تکلیف اور راحت برابر کی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ مگر ٹیلیفون میں راحت کم ہے اور تکلیف زیادہ ہے۔ جنکو یہ نعمت میسر نہیں ہے

وہ شاید ہزار کے مشتاقوں کی طرح اس بات کو نہ مانیں مگر میں نے تو اس نعمت یورپ کو اچھی طرح آزما کر لکھا ہے کہ میرا ہزار اس ٹیلیفون کی بلا سے لاکھ درجہ اچھا تھا۔ اگرچہ تھا تو وہ بھی بلائے بے دریاں مگر نہ ایسا کہ رات چین ہے نہ دن چین ہے۔ جب ذرا خیال جما کر کوئی کام شروع کیا اور ٹیلیفون نے گھنٹی بجا کر اس میں رخنہ ڈالا۔

ہندوستان میں اگر ولایت کی ہر چیز ایک فیشن اور آزاد بندہ بن جاتی ہے ٹیلیفون بہت کام کی چیز تھی۔ گھریلو میلوں اور کوسوں کی بات کان میں آجاتی تھی۔ مگر ہندوستان میں کار بار کی آسانی کے لئے اسکو استعمال نہیں کیا جاتا یہاں تو یہ کام رہ گیا ہے۔ ٹن ٹن ٹن۔ کون صاحب ہیں؟ میں ہوں صاحب داد خاں۔ کیا ارشاد ہے؟ جی کچھ نہیں بس یہ معلوم کرنا تھا کہ آپ کے ہاں میری آواز جاتی ہے یا نہیں۔ آداب عرض ہے۔ جاتا ہوں۔

متوالے

اواہن پوش طعن نبوش متوالو! تم جہاں جا رہے ہو وہاں رکھا کیا ہے؟ تمہیں خبر نہیں تم معذور ہو!
بانبر استاد کے ضدی سبق خوانو! جب منے تمہیں نہیں آتے تو دوسرے سبق نوکے بان بھنے سے کیا وجد ہوگا۔ کاش کاش کہ مطلب بھی سمجھو اور سمجھاؤ!

زمانہ وہ ہے جہاں سے تم جاتے ہو جہاں سے تم کہتی ہے کہ بھائی کو بھائی نہ چھوئے جہاں تن آسانی سکھاتی ہے کہ یہ سہل ہے کہ یہ کار با نوبیوشوں میں حصہ رسدی تقسیم ہو مگر یہ مشکل کو غیر کو کیاقت کے جادو سے ایسا سحر کر دے کہ تم سے پاکشی کا نیک خیال تک بھلا دے۔ جسے تم ہندی غلام سمجھتے ہو وہ مکتب ہے اور دس حرفت یہ کہ بھائے کو اپنا بناؤ یہاں تک کہ کوئی زور مست ہے نہ زور مست۔ اتنا سمجھ جاؤ تو کہیں جانکی ضرورت نہیں۔ اتنا سمجھ نہ سکو تو بھولے و فاشعار دلوں کی بادیوں میں جھانکے ہل چل جائینگے۔ رگوں بھلو اوتوالو! یہ ستا نہ بیوہ کب تک؟ بس ہی نا کہ چند قدم لڑکھڑاؤ گے اور پھر ہانکے جاؤ گے!!

اس صنم خانہ کے پرستار بیٹوہ مردانگی کے طلبگار ہیں۔ دھردانگی جس پر زین عشق عشق کرے جو آنے والی نسوں کے لئے نمونہ اور ہمارے لئے آئین ہو۔ جو سیکھ سکھا ئے سنے سنائے نہیں بلکہ دل سے پیدا ہو اور نگاہ سے یوں چلے کہ زبان و بازو کے استعمال کی ضرورت نہ ہو۔

اوتوالو! جہاں ملن کی ضرورت ہو وہاں چال کو کوئی کیا کرے۔

لغات الجاہلین

س ڈاکٹر۔ ہمدرد ہو تو مسیحائے زمان مردہ کو زندہ کرنے والا۔ ورنہ عام طور پر بے درد انسان زندہ کو مردہ کرنے والا۔ قبرستان کی آبادی میں ہر سال معتد بہ اضافہ کرنے پر مصر۔ اپنی فیس پوری وصول کرنے پر بغض گو اس کو یقین ہو کہ اس کے گھر سے باہر نکلتے ہی مریض کا دم بھی ساتھ ہی نکل جاوے گا۔ عجل جلی سے کسی کو ننگڑا۔ کسی کو لڑا کسی کو لہجہ کر دینے والا۔ جس کے قلم کے ایک کش سے ضرب خفیف شدید میں تبدیل ہو جاتی ہے قتل عمد اتفاقیہ موت یا تلی پھٹ جانے یا دل کی حرکت بند ہو جانے کے باعث موت میں بدل جاتا ہے جو کسی مرض کا نام سنتے ہی نسخہ تجویز کر دیتا ہے۔ خواہ مریض کا مزاج سوداوی ہو یا بلخی یا صفرو دی یا کیا۔ جو معقول فیس ملنے پر ملازموں کو سالہا سال کی بیماری کی رخصت دلا دیتا ہے۔ گلم فیس ملنے پر حقیقی بیمار کو ادائیگی فرایض کے قابل فرما دیتا ہے۔ وہ مستند شخص جو کسی ہسپتال میں چھ ماہ تک بیمار رہا ہو۔ یا تین ماہ تک کپسوڈری کا کام سیکھتا رہا ہو۔ وہ شخص جو انگریزی ادویات کے اردو میں لکھے ہوئے ناموں کو خاص لب و لہجہ کے ساتھ جھنڈتا ہو۔

دیسے حکیم وہ شخص جو نیلو فر بنفشہ صندل بزوری دینار وغیرہ کے شربت ایک ہی بوتل سے پچتا ہے گودہ جانتا ہے کہ اس میں سوائے خالص چینی کے اور کوئی چیز نہیں ہے۔ ص-د-تی
شاعر کسی کام کے بغیر مصروف رہنے کے فن میں مشاق۔ بیکار مباح کچھ کیا کہ کا مصداق۔ شمر کے اندیشے میں دُہلا ہونیو الا قاضی۔ حال فراموش، سوگوار ماضی۔ بغیر فیس لئے لیلی و مجنوں کا وکیل۔ دل اور دماغ کی بے تعلقی کی دلیل۔ خیال کے جال میں جذبات کو پکڑنے والا شکاری۔ انہماک سے معمور احساس سے عاری۔ کل کائنات کا خواہ مخواہ راز دار کسی بیماری کے بغیر بیمار الغرض ایک خدائی فوجدار
آدارہ و مجنوں نے رسوا سر بازار سے (۱-ش)

محفل ادب

عثمانیہ یونیورسٹی۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی کے متعلق فرماتے ہیں:-
 دُنیا ئے علم و تعلیم کے ہر فرد نے شاید عثمانیہ یونیورسٹی کا نام سنا ہو گا۔ لیکن اکثر اشخاص کے لئے یہ صرف ایک لفظ ہی ہے۔ حالانکہ وہ ہندوستان کی یونیورسٹی تعلیم میں ایک انقلاب پیدا کر رہی ہے اس کا نام ہمارے سامنے بغداد۔ قریطہ۔ یاقاہرہ کے خواہائے پریشاں کا نقشہ پیش کرتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے۔ کہ ہندوستان کی ایک ریاست کا عملی مرکز ہے یہ یونائیدہ یونیورسٹی ہزار گز لیڈ ہائینس نظام کی مرہبان توجہ سے عالم وجود میں آئی ہے اور اس روشن خیال والی کے نام سے موسوم ہے۔ یہ شاید نہایت ہی انسب ہوا ہے کہ ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست نے اس کام کی طرف سب سے پہلے قدم بڑھایا ہے جو ہندوستان میں یونیورسٹی تعلیم کے انقلاب عظیم کی خبر دیتا ہے۔ اکثر ہم یہ دیکھ کر حیرت ہو جاتے ہیں۔ کہ ہندوستانی ریاستیں جو عموماً برطانوی ہند کے مقابل میں بہت ہی پسماندہ اور جاہل سمجھی جاتی ہیں۔ اور علانیہ ”زیر حمایت“ کے نام سے پکاری جاتی ہیں۔ تعلیم و معاشرت کے میدان اصلاح میں سب سے پہلے بہادرانہ قدم رکھتی ہیں۔

تعلیم یافتہ اور سست ریاست حیدرآباد نے جو فاداری، شان و شوکت اور عزت و عظمت کی قدیم روایات پر اب تک قائم ہے۔ ایک نہایت ہی عظیم و اہم تجربہ کے میدان میں قدم رکھا ہے۔ ٹھیک اس وقت جبکہ تمام ہندوستان اس موضوع پر کہ تعلیم کے مختلف مدارج میں کونسی زبان رکھی جائے سرگرم مباحثہ ہے۔ اس حوصلہ مند ریاست نے بُرا یا بھلا جیسا بھی ہو۔ ایک فیصلہ کن قدم آگے بڑھادیا ہے۔ اور اس بات پر فخر کر سکتی ہے۔ کہ یہ عزت اسی کے حصہ میں آئی ہے۔ کہ دیسی زبانوں کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم دینے کی وہ اولین رہنما ہے۔ یہ اس جامعہ کی خصوصیت ہے۔ صرف زمانہ اس کے نتیجہ کا فیصلہ کریگا۔

(معارف)

کیا مانی مصور تھا؟ ابوہریرہ بن یزید، تحقیق السند میں خود مانی کی تصنیف شاہ برقان کے حوالہ

سے لکھتا ہے کہ ”وہ ۲۱۵ء یا ۲۱۶ء میں بمقام ہمدان پیدا ہوا۔ اس کا باپ، جس کا نام پانگ تھا (عرب مورخین جسے فتق کہتے ہیں) ہمدان کے ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ مانی کی ماں کا نام مارمریم یا آتا جنم تھا، جو ایران کے قدیم شاہی خاندان اشغانی سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ زمانہ وہ تھا جب مشرق میں زردشتی مذہب اور مغرب میں مسیحی مذہب اپنے عروج پر تھے۔ اس کا باپ چونکہ خود بھی بعد کو مسیح مغتک (Baptized) طبقہ میں شامل ہو گیا تھا، اس لئے ظاہر ہے کہ مانی کی ابتدائی تعلیم، جو اس کے باپ ہی کے پاس ہوئی، مسیحی معتقدات کے زیر اثر ہوئی ہوگی۔ لیکن خود مانی کا بیان یہ ہے کہ میں ابھی جنم ہی میں تھا کہ قوم فرشتہ میری ماں کو حامل حمل میں نظر آتا اور ظاہر کرتا کہ تیرے بطن سے ایک پیغمبر پیدا ہونے والا ہے۔ جب میری عمر بارہ سال کی ہوئی تو مجھ پر الہامی کیفیت طاری ہونے لگی اور چوبیس سال کی عمر تھی کہ میں نے تبلیغ حق و صداقت شروع کر دی۔“

اس وقت شاہ پور ایران کا حکمران تھا۔ اس لئے مانی نے سب سے پہلے اسی کو مخاطب بنانا سنا سمجھا۔ شاہ پور کا بھائی پیردزاس سے قبل اس کا معتقد ہو گیا تھا، اس لئے مانی اسی کے ذریعہ سے شاہ پور کے دربار تک پہنچا اور وہاں اپنے تئیں پیغمبر ظاہر کر کے اپنی تعلیمات پیش کیں۔

یعقوبی کا بیان ہے کہ جب مانی ابن حار شاہ پور کے دربار میں آیا۔ تو اس نے زردشتی مذہب کی برائیاں بیان کر کے کہا کہ نظام کائنات دو قوتوں کے ہاتھ میں ہے۔ ایک کا قبضہ تاریکی پر ہے جس سے تمام معاصی پیدا ہوتے ہیں۔ اور دوسری قوت روشنی کی مالک ہے جس سے تمام نیکیاں رونما ہوئی ہیں۔ شاہ پور نے اس کے اصول تسلیم کر لئے اور اپنی رعایا کو مجبور کیا کہ وہ مانوی مذہب اختیار کر لیں اب چونکہ فرمانروائے وقت نے اس کا مذہب اختیار کر لیا تھا۔ اس لئے اس نے نہایت اہتمام سے اپنے معتقدات کی تبلیغ شروع کی اور اسی سلسلہ میں اس نے سات (۷) کتابیں بھی تصنیف کیں، جن میں سے چھ شامی زبان میں تھیں اور ایک شاہتران، قدیم پہلوی زبان میں۔ (دنگار)

قصہ نویسی۔ شاید یہ انسانی فطرت میں داخل ہے۔ کہ اپنی پسند اور نفیس کی رہنمائی کا ہمیشہ اتباع کیا جاتا ہے اس لئے بعض افعال کی کثرت ضرب المثل اور دال عادت سمجھی جاتی ہے یہی نظر سے جہاں تک تذکرے گزرے ان سب کا خلاصہ نقائص بھی طوالت کا سبب ہوگا۔ مگر شے نمونہ از خروا

کچھ امور قابل ذکر ضرور ہیں۔ بالعموم تذکرہ نویسوں میں یہ بات پائی جاتی ہے۔ کہ جس شخص پر زیادہ توجہ ہوئی اس کی تعریف کے انبار لگا دیئے۔ یہ کوئی ضروری بات نہیں۔ کہ اس سے آنکھوں کی نفسہ کوئی وابستگی ہو۔ بلکہ فطرتاً ان کا وقار ان کے دل پر مرکوز ہے۔ یا کلام زیادہ پسندیدہ ہے۔ حالانکہ اہل تذکرہ کو لازم ہے کہ شاعر کا اصل حال بغیر کسی رورعایت کے تحریر کریں۔ عداوت کا اظہار تذکرہ نویس میں کسی طرح زبان نہیں آتا۔ سب سے آخر تک نیک نیتی ثابت ہونا چاہیئے۔ انصاف کا ہر جگہ لحاظ از بس ضروری ہے۔ سب سے بڑا سقم انتخاب کلام کی وجہ سے نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس میں یا تو یہ ہوتا ہے۔ کہ اگر انتخاب اچھا ہوا تو امیدوں کا خون ہو گیا۔ اس لئے زیادہ مناسب صورت یہ ہے۔ کہ بقدر گنجائش پوری پوری غزلیں نقل کر دی جائیں۔ تاکہ ناظرین شاعر کی استعداد کا خود اندازہ کر لیں۔ اور فن شعر کی دستگاہ اور رتبہ سے کما حقہ ماہر ہو جائیں۔ مگر افسوس ہے۔ کہ تذکرہ نویس ایسا نہیں کرتے۔ یا تو شاعر کو فلک الافلاک پر پہنچا دیتے ہیں۔ یا قعر ندلت میں گرا دیتے ہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ بے رحمی وہ فرد گزاشت ہے۔ جبکہ بعض قابل ذکر شعراے چشم پوشی اختیار کی جاتی ہے۔

(اعجاز)

عبرت یہ دکھا رہی ہے اعجاز	گویا ہے زبان بے زبانی	آواز قبر۔
اک قبر سے آرہی ہے آواز	سُن لے لے راہ گیر سُن لے	
آراستہ جب ہو محفل ناز	اس گوشہ تنگ کی ہے فکر	
جب جمع ہوں دوستان ہراز	یہ عالم بیکسی نہ بھولے	
جب آئے صدائے نغمہ ساز	یہ گنج خموش بھی رہے یاد	
آغوش میں جب ہو یار دساز	یہ نقش فنا مٹے نہ دل سے	
جب دور شراب کا ہو آغاز	یہ خواب عدم نہ ہو فراموش	
(دین و دنیا)	(تاجور)	

مختصر قصوں سے یہ مقصود نہیں کہ پڑھنے والوں کو سبق حاصل ہو اور کوئی نصیحت ملے۔ بلکہ ان کا مدد محض دلچسپی اور دل بھلا دینا ہے۔ کامیاب قصہ صرف وہ ہے۔ جسکو پڑھ کر ایسا معلوم ہو۔

گو یا حقیقت کی تصویر الفاظ میں کھینچ دی گئی ہے۔ قصہ نویس کو اُدیشک نہیں بلکہ مصور ہونا چاہیے۔ جو جیسا نظارہ دیتا ہے۔ اُسے ایمان داری سے ادا کر دیتا ہے۔ بابورا بیند رنا تھ ٹیگور سے دریافت کیا گیا۔ آپ مختصر قصے کیوں لکھتے ہیں۔ آپ نے جواب دیا۔ کیونکہ میرے دل میں خیالات اُٹھتے ہیں۔ اویس انیس دُنیا کے سامنے پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جنہیں نصیحتوں اور اُپدیشوں کی ضرورت ہو۔ اُن کے لئے قصوں کی کتابیں پڑھنا پانی بلونے کے مترادف ہے۔ قصہ نویسی آرٹ ہے اسے آرٹ کی نگاہ سے ہی دیکھنا چاہیئے +

لٹریچر میں نائٹک کو درجہ امتیاز حاصل ہے۔ اس سے کسی قوم و ملک کی تہذیب کا سراغ مل سکتا ہے نائٹک قوم کی زندگی کی تصویر ہے۔ نائٹک قوم کے اندرونی جذبات کا کھلا ہوا بیان ہے، اُس کے ماضی کی پُر شکوہ داستان ہے۔ مگر نائٹک تاریخ نہیں ہے۔ تاریخ اور نائٹک کے مابین ایک امتیازی دیوار حائل ہے۔ تاریخ کسی قوم کی مردہ تصویر ہے۔ نائٹک اُس کی زندہ کہانی ہے۔ تاریخ میں پرانے واقعات کو عہد ماضی کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ نائٹک میں اُنہی واقعات کو زندہ کر کے دورِ حاضرہ کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ تاریخ ”تھا، تھی اور تھے“ کا مجموعہ ہے۔ نائٹک ”ہے اور ہیں“ کا فسانہ ہے۔ تاریخ پڑھ کر طبیعت فسرہ ہو جاتی ہے، نائٹک دیکھ کر رگوں میں خون اُبلنے لگ جاتا ہے۔ کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی، تا وقتیکہ وہ نائٹک کی ماہیت اور اہمیت کو کامل طور پر محسوس نہ کر لے +

(سودھ - مہندی)

(سدرشن)

حاجب ابن زرارہ (ایک عرب نژاد) کسریٰ سے ملنے کی آرزو لے کر اس کے شاہی محل تک پہنچا اور دربان کے دریافت کرنے پر کہا کہ میں ملک عرب کا ایک باشندہ ہوں۔ کسریٰ نے اندر بلا لیا اور دریافت کیا کہ ”تم کون ہو؟“ اس نے جواب دیا کہ ”سید العرب“ کسریٰ نے کہا تم نے دربان سے تو کہا ہے کہ میں اہل عرب میں سے ایک عام آدمی ہوں حاجب ابن زرارہ نے جواب دیا کہ ہاں میں کسریٰ سے ملنے سے پہلے عرب کا ایک عام باشندہ تھا لیکن کسریٰ کے شرفِ حضوری حاصل کرنے کے بعد اب میں ”سید العرب“ ہوں کسریٰ نے اس جواب پر اظہارِ تحسین کیا اور حکم دیا کہ اس شخص کا منہ موتیوں سے بھرا جائے۔

(اللال مصر)

(تاجو)

کچھ عرصہ گزرا، سر بلند پہاڑ کے ایک تاریک غاریں ایک آدمی رہتا تھا وہ جوگی تھا
 دُنیا اُس کے لئے موجب کشش نہ تھی۔ اُس کی راتیں حُسن و شوق کے خیالوں اور اُس کے خواب
 زندگی کی مسرتوں سے محروم تھے۔
 اُس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ عبادت کے لئے وقف ہو چکا تھا وہ جوگی تھا

ایک دن اُس پہاڑ پر ایک عورت چڑھی۔
 اُس کی آنکھیں مستِ شباب نہ تھیں، اُس کے بال حسین نہ تھے۔ اُس کے ہونٹوں پر خوبصورتی
 نہیں کھیلتی تھی۔ مگر عورت تھی وہ پہاڑ پر چڑھی

اب وہاں ایک مرد رہتا ہے۔
 اُس کے ساتھ ایک عورت رہتی ہے۔
 وہاں جوگی نہیں رہا۔
 (سمارٹ سنٹ)

عورت کا دل بچے کی جیب ہے۔ جس میں وہ جو کچھ ملتا ہے پر شوق ہاتھوں سے ڈال لیتا ہے۔
 ٹوٹا ہوا تاگا، مڑجھایا ہوا پھول کھوٹا سکا، پتھر کا ٹکڑا۔ چاقو کا دستہ۔ یہ سب اشیاء ناکارہ ہیں۔ انکو
 سمجھدار دُنیا نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اور حقارت کی ٹھوکر لگا کر راستے سے پرے مٹا دیتی ہے
 مگر چھوٹے بچے کے لئے یہ عجائبات دُنیا سے بھی قیمتی ہیں۔ وہ اُن پر اپنی جان عزیز چھڑکتا ہے۔
 عورت کا دل بھی بچے کی جیب ہے جس میں اُسے جو کچھ ملتا ہے۔ پر شوق ہاتھوں سے ڈال لیتی ہے۔
 نفرت کے دو لفظ، محبت کا ایک کلمہ، لاپرواہی کا قہقہہ، شوق بھری آواز لگائیں، جعلی سردائیں، یہ
 سب اشیاء ناکارہ ہیں۔ سمجھدار (مردوں کی) دُنیا ان کو دیکھ کر چونک اُٹھتی ہے۔ مگر عورت کے لئے یہ
 بیش قیمت خزانہ ہے۔ وہ اُسے مردوں سے چھپا کر رکھتی ہے۔
 (سدرشن) نیو میگزین

بربریت کیا ہے؟ بربریت انفرادیت ہے، اہتذیب محض ضمیر کی اشتراکیت ہے۔

سلطنت فقط اُس عام عارضہ کی اک دوسری شکل ہے جو انانیت کہلاتا ہے۔ اور سیاسیات میں اس کا عمل ویسے ہی نتائج پیدا کرتا ہے جیسا کہ فرد و اعدی میں ہماروں میں رہنے والا وحشی آدمی بھی اک ضمیر رکھتا تھا بعینہ جیسے ہم رکھتے ہیں۔ زیادہ فرق یہ تھا کہ اُس کا ضمیر اُسی سے واسطہ رکھتا تھا، حفاظت نفس قدرت کا پہلا قانون ہے اور انسان اُس زمانے میں اسی قانون کے احاطہ کے اندر محصور تھا۔ اُسکے اپنے حقوق و جذبات اُس کی اپنی خواہشات و خیالات ہی چیزیں اُسے بھلی معلوم ہوتی تھیں اور انہیں کی وہ نگہداشت کرتا تھا، جب اُس نے ایک نئے فرقہ زندگی بنایا اور اُسکے بال بچے بڑھے تو اُس کا ضمیر زیادہ وسیع ہوا اور اُسکے نئے تعلقات انکی شخصیت کا جز بن گئے۔ اُس نے اپنی زوجہ اور بال بچوں کی محافظت ایسی ہی ناداری سے کی جیسی کہ اپنی۔ بعد کو رفتہ رفتہ اُسکے بچوں نے آپس میں شادیاں کیں اور وہ ایک قبیلہ کا جز بن گیا۔ وہ اور زیادہ وسیع ہو گیا اُس کا ضمیر قبیلہ کا ضمیر ہو گیا۔

وسعت کا عمل جاری رہا۔ قبیلہ ایک ریاست یا اک چھوٹی سی دولت بن گیا۔ پھر پھر چھوٹے چھوٹے گروہ متحد ہو کر ایک بڑا گروہ بن گئے جس کا نام قوم رکھا گیا۔ اُس کا انفرادی ضمیر اب بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گیا جسے حُب قومی کہتے ہیں۔ لیکن قوم و ملک کی محبت تہذیب کی انتہائیں یہ تو ترقی کی شاہ راہ فقط اک عارضی قیام گاہ ہے اور صحیح منہائے کمال انسانیت ہے انسان کا ضمیر جذبہ نہیں کہلا سکتا جب تک وہ قومیت سے اک زیادہ وسیع جذبے سے متاثر نہ ہو۔ کیونکہ ضمیر کی حقیقی اور دائمی بنیاد نوع انسان پر ہے۔

جس قدر ہم ملک ملک کے تمام لوگوں کے لئے احساس خدمت محسوس کریں ہم مذہب ہیں اور جس قدر ہم یہ قوت بصیرت کم ہو ہم نا شائستہ و غیر متہدن ہیں۔ سینڈرز اپنی تصنیف میں جیٹس میں لکھتا ہے کہ رب خالق نے انسانوں کو تعلیم دی کہ قبیلے کے دائرے میں چوری کرنا گناہ ہے۔ اسی بنا پر اُس نوع کی قومیت جو سکھاتی ہے کہ ہمیں فاپنے ہم ملکوں سے وفاداری اور انصاف برتنا چاہیے۔ نیم وحشی ہے! وہ عظیم انسان منہائے کمال جسکی طرف دنیا سرگرم سفر ہے کسی طرف واقعات ہمیں کشاں کشاں لے جاتے ہیں اور جسکی طرف دنیا کے بہترین خیالات یکسوئی کے ساتھ جھکے جاتے ہیں نوع انسان کا اتحاد ہے اور ان تمام انسانی عدالتی رسائی کے اوصاف کا دوسری قوموں کے ساتھ روا رکھنا جن کا ہم اپنے ہم قوموں کے ساتھ برتنا لازم جانتے ہیں!

(ج ب)

(کرنت اپنی نین)

حصہ نظم کلام اکبر

آپ سُن لیجئے سنی ہیں کچھ اس بات کے بھی
فلسفہ کبھی کبھی موسم میں بدل جاتا ہے
گوشِ حُج میں موسم میں خیالات کے بھی
اور ہی سانچے میں لُحِق کا ڈھل جاتا ہے
لاکھ سمجھتا ہوں اسکو میز پر آچائے پی
یہ عروسِ ہند اب تک کہہ رہی ہے ٹپے پی

رباعیات گرامی

اے روحِ بھسم زار نالی تاچند
پر برزن و بر فراز سدرہ نشیں
در بندِ قفس شکستہ بالی تاچند
در مرکزِ فتنہ خاکِ مالی تاچند

برخیز کہ عارفان بخود سیر کنند
خود را دیدند غیر از خود رفتند
در پردہِ نظرِ بکعبہ و دیر کنند
خود غیر خود ند قطع از غیر کنند

گویائے رباعیم بخود غیرم من
از بندہ غیر شرنیسا ید بوجود
دانائے رموزم آسمان سیرم من
از حلقہ بگوشان ابوالخیرم من

آصف الدولہ کا امام بارہ

(لکھنؤ)

آصف الدولہ مرحوم کی تعمیر کین
دیکھ ستیاح! اے رات کے ستارے میں
خاک پر عرش کو دیتی ہے بلندی کا جواب
منہ سے اپنے منہ کا ل نے جب اُٹھی ہو نقاب

درو دیوار نظر آتے ہیں کیا صاف و سبک
یہی ہوتا ہے گمان خاک سے مس اس کو نہیں
یک بہ یک دیدہ حیران کو یہ شک ہوتا ہے
بے خودی کتنی ہے آیا یہ زمین پر کیونکر
اک عجب منظر دیکھ کر نظر آتا ہے
دور سے عالم تصویر نظر آتا ہے

شوکت و شان عمارت کی خبر دیتا ہے
وہ سپیدی سحر نور کی ہلکی ہلکی
ایسے عالم میں وہ کہڑے سے ابھرنا اس کا
ہوتے ہیں گنبد و مینار فضا میں ظاہر
جگمگاتا ہے شبا عوں میں یہ ایوان بلند
پارہ چوب کے احسان کی ضرورت نہ ہی
اس کی تعمیر کو آئے نہیں معمار فرنگ
بچ گیا خاک کے پردہ پہ یہ مٹی کا طہسّم
اس کے سایہ میں گراتا راج حکومت سر سے
بل گئے خاک میں سب اس کے بنانے والے
کیا سرشام ادا سی کا سماں رہتا ہے
دھوپ اترتی ہوئی آنکھوں کو یہ دکھلاتی ہے
جس کے فیضان حکومت کا کرشمہ ہے یہ
اُس کی ہمت کی بلندی ہے بلندی اس کی
جب زیارت کو محرم میں بشر آتے ہیں

پردہ شب کے سرکنے پہ سحر کا آغاز
آشیان چھوڑ کے جب کرتے ہیں طائر پرواز
جیسے موجوں کے تلاطم سے نمایاں ہو جہاز
بڑھ کے ہوتی ہیں زیارت سے لگا ہوا ممتاز
جس کی صنعت کا ہے دنیا سے زالا انداز
خاک اور خشت نے بل کر یہ دکھایا اعجاز
ہے یہ تہذیب اودھ کے لئے سرمایہ ناز
درد نہ دنیا کی ہوا اس کے لئے تھی ناساز
اس نے دیکھا یہ زمانہ کا نشیب اور فراز
کچھ شجر ہائے کہن اب ہیں پُرانے دساز
درو دیوار سے کر جاتی ہے رونق پر داز
دل مجروح کا مہر خشت میں ہے سوز و گداز
اس کے دامن میں ہے سویا ہوا وہ خلق نوا
اُس کے اخلاق کی وسعت کا ہے اس میں انداز
چاندنی رات میں آتی ہے فلک سے آواز

بے ادب پامنہ اینجا کر عجب درگاہ است
سجدہ گاہ ملک درویش شاہنشاہ است
چلبست لکھنوی

قطعہ

کسی نے آکے جناب جنید سے یہ کہا
جو بیل چل کی پوچھ تو ملنے والے لاکھ
کل آکے کی تھیں محبت کی سینکڑوں باتیں
کہا جنید نے مطلب کے ساتھ بلنا کیا
وفا جو اور سے چاہی تو خود غرض ٹھہرے
کہ آج کل ہے زمانے کا کچھ عجیب حساب
جو دل ٹٹول کے دیکھو تو دوستی نایاب
کچھ آج یاد نہیں جیسے پچھلی رات کا خواب
بناؤ اور بگاڑ اس کا ہو بہو شکل حساب
دفا شعار ہوئے خود تو خود غرض احباب
احمد علی بشوق - قدوائی -

سفرِ عدم کی اطلاع

یہ نظم جناب زادہ خاتون صاحبہ شروانیر (رنجش) عت سخن گو خاتون نے خواجہ بانو کے پاس بھیجی تھی اور غالباً
ابھی کہیں نہیں ہے۔ اس وقت جبکہ ملک میں خاتون محترمہ کی وفات سے جگہ جگہ ماتم ہو رہا ہے اور تعلیمات
گھرانوں میں اس موت کو قومی حادثہ خیال کیا جاتا ہے اس نظم کا شائع ہونا کئی اعتبار سے اچھا ہے۔ ایک تو مرحومہ
کی شاعرانہ قابلیت کرر روشنی میں نظر آئیگی۔ دوسرے انکی وہ فلسفیانہ و صوفیانہ ذہانت معلوم ہوگی جو خدا نے
انکو عطا فرمائی تھی۔ تیسری بات جو سب سے زیادہ ہے وہ مرحومہ کی قوتِ کثرت ہے۔ اس نظم میں انہوں نے صاف صاف
بتا دیا ہے کہ مرنے کا تو دل اور ذہن اب میں عدم کے سفر کو جانے والی ہوں۔

لذت دید کا چمکا ہے تو آدیکھ مجھے
صاحب دیدہ دینا ہے تو آدیکھ مجھے
جو نہ دیکھا تھا کبھی تجھ کو دکھائی دیکھا
ساری دنیا کو بھی دیکھا ہے تو آدیکھ مجھے
ترجمان دل پر شوق ہے صورت کو نہیں؟
تو قیامت کی شناسا ہے تو آدیکھ مجھے
مٹ گیا فرق من و تو جو منی میں تجھ پر
آئینہ گر نہیں دیکھا ہے تو آدیکھ مجھے
میری صورت ہے تماشہ گریاس و امید
جگہ کو گر شوق تماشا ہے تو آدیکھ مجھے
دیدنی ہے مرے پہلو کا پری خانہ بھی
سیرِ باطن کی تمنا ہے تو آدیکھ مجھے
اُس کی قدرت کا ایکسٹونے سا کرشمہ ہوں میں
الفت ہستی اعلا ہے تو آدیکھ مجھے

سب مری بات پہ کہتے ہیں کہ فختل ہے دماغ
درد کا بیت جہاں میں ہوں مجسم مضمون
شکل نیرنگ جہاں آنکھ میں پھر جائیگی
غم را دیکھ کے بھولیگی سب اپنی کلفت
ہیں صعوبات سفر دید کے آگے لاشے
وہم ہے خواب ہے دھوکا ہے حیات انسان
لوگ پوچھینگے مری صورت دیرت تجھ سے
دیکھ اب سیر عدم بد نظر ہے مجھ کو
دیدنی ہے مری کیفیت ناگفتہ بہ
میری بیوی بیٹے خواجہ بانو آخر کے پانچ اشعار کو اچکل بار بار بڑھتی ہیں اور زار دقتار روتی ہیں۔ انکو مروجہ کے شاخ
غیر معمولی تعلق تھا جب نظم لکے پاس آئی تو انہوں نے اسکو معمولی شاعرانہ بات سمجھ کر رکھ دیا۔ اب وہ کہتی ہیں
کہ سیر عدم کی اطلاع پا کر بھی میں دوبارہ لکھنے نہ جا سکی اور حیات انسانی کا دھوکا سنے آگیا میں نے سفر کی مشاکلا
کا ہدایا یا مشاکلات باند باند سیر سے سامنے آئیں مگر افسوس محنت نے میری کچھ مدد نہ کی۔ درنہ دید مزید کی حسرت دل میں نہ
رہتی ہیں مروجہ سے صرف ایک بار بھیک پور جا کر ملی تھی پھر کبھی ہاں جانا ممکن نہ ہوا۔
خواجہ بانو کہتی ہیں مروجہ کے بہت سے خط میرے پاس ہیں اگر مروجہ کے عزیزوں نے نامناسب نہ جانا تو میں ان کی
نظر ثانی کر کے شائع کر ادگی کر کہ بہر خط درس حکمت اور تغیرات عالم کے سبق کا خزانہ ہے۔ حسن نظامی

جذباتِ عالیہ

گرامی

شب کے چل دو گوشہ چشم عنایتے
ہاں واریسی بہ نکتہ مضمون باغِ خلد
عصیان اور رحمت پروردگار ما
مائیم وز لطف یار و مسلسل حکایتے
خوانی اگر ز مصحف رخسار آیتے
ایں رانہا پتے مست نہ از رانہا پتے

از صبر و شکر نے سنجے نے ترائے
عنوان یک نگاہ تو آستوب عالمے
عقل بہانہ جو سپہ افگند ورم گرفت
تا چند امتحان تغافل سے

الّا چکد ز حضرت انسان شکایت
تمسید نیم خند تو مرگ دلائیے
در عرصہ کہ عشق علم کرد رایت
دیرینہ بندہ ایست گرامی رعایت

مرزا محمد ہادی

صورتیں اُمید کی خواب پریشاں ہو گئیں
راحتیں طویل مرض کی صرف درماں ہو گئیں
بے مرمت سی جو قبریں کوچہ وحشت میں تھیں
پہنچہ وحشت نے سینہ پر جو کیں گلکاریاں
کچھ دلوں و اعظا نے جن کا خود کیا تھا التزام
کامیابی لذتِ مہموم جب ثابت ہوئی
اُن سے کیا لطف تعلق اُن سے کیا دل بستگی
ہم سے پوچھے بھی کوئی تو کیا کہیں کیا چاہیے
چند باتیں وہ جو ہم زندوں میں تھیں ضرب المثل

سالمے آنکھوں کے آئیں اور پنہاں ہو گئیں
زندگی جن مشکلوں سے تھی وہ آسان ہو گئیں
وہ بھی آخر صرف استحکام زنداں ہو گئیں
فصل گل میں زینت چاک گریباں ہو گئیں
اب وہ تکلیفیں سراسر جزو ایماں ہو گئیں
حسرتیں دل سے نکلتے ہی پشیاں ہو گئیں
غیر کے ماتم میں جو زلفیں پریشاں ہو گئیں
خواہشیں بیتابی دل سے پریشاں ہو گئیں
اب سنا مرزا کہ وردِ اہل عسراں ہو گئیں

عبدالحمید صدیقی

گم ہوں راز و نسیاں میں تیرے
حسنِ ہستی نوازیں تیرے
جلوہ پر دہ ساز میں تیرے
حسنِ نیرنگ ساز میں تیرے
لطفِ بندہ نوازیں تیرے
حسنِ عالم طرازیں تیرے
عرصہ ترکستازیں تیرے

محو ہوں لطفِ ناز میں تیرے
میسری ہستی بٹا چکا ہے عشق
یہ فریبِ نظر - معاذ اللہ
چشمِ نظر رہ محو حیرت ہے
شانِ تسخیرِ عالم جاں سے
اُف - یہ عالم فریبیاں ظالم!
کشتہ مشقِ ناز ہیں لاکھوں

ناظر

حضرت ہمایوں مرحوم کی سیرت شریعہ کے موتر پر پنجاب کے مشہور شہر سیال خان بہادر چودھری خوشی محمد صاحب ناظر نے اشعار ذیل فی الہید ارشاد کئے تھے اس مجلس میں آنریبل سر محمد شفیع بھی شریک تھے مقطع میں اسکی طرف اشارہ ہے (ج)

رازِ ناساں کسی سے اپنا عیاں نہ کرتے
اے کاش دل کو اہلِ بان نہ کرتے
گر لو اہوس نہ کرتے دھوئے عشقاں ہی
وہ اپنے عاشقوں کا یوں انتخاب نہ کرتے
گرجاتے جوانی ہے ایک نقشِ فانی
یغز و لہجہ کی یوں نوجوان نہ کرتے
گرجاتے کہ غم سے ممکن نہیں رہائی
راحت کی کاش منہا ہم راہِ گمان نہ کرتے
اُس دل کو بلا پھر طالعِ ہمایوں
ہم نقدِ جان دل کو یوں نشان نہ کرتے
زندہ کی انجمن میں گر محبت نہ آئے
اس طرح کشیش کی عزیز جان نہ کرتے

تھا آفتابِ محشرِ نظارہ سوزِ ناظر

سر پر شفیعِ عالم گر سا ماباں نہ کرتے

بنیخود

اسکو بھی ہر نڈھے میں اپنی بھی بنیخود
اک کچھ ہے تنہا کی یہی آرزو ہے
جس کہکشاں ہے باغِ جنانِ دہ تو ہے
پھولوں کو گن سونگے ان میں خود کی کہ ہے
چوسک چھوڑ بیٹھا عاشقِ تادہ
کتنے ہیں لوگ جس کو جانِ جہاں دہ تو ہے
کیا کہو باریہِ جادو آنکھوں میں سر گدا
ہم جسکو دیکھتے ہیں تجھ سا ہی ہو بہو ہے
سوئے کے ہر شکر کو کھیرا دانی ہم
پاس آئے دہ درہما دت تیری خیر ہے
ہر سمت روشنی ہی چھلنی ہوئی ہے کئی
پردہ سے جلوہ گاہ کس کا رخ نہ کو ہے
جس لہجہ میں دیا یا اپنا لے بنایا
معتشوق کی نظریں عاشق کی آرزو ہے
ظاہر میں ہے خدا تو باطن میں دلِ ربا
یہ بھی ہے شان تیری اُس شان میں بھی ہے
جامِ مراد بھرنے کیسو مجھے بھی لے
شہرِ ترے کرم کا دنیا میں چار سو ہے
آئینہ میں عید ہے عکس آئینہ کا
میں آنکھوں پر دہو ہوں تیرے سرور ہے
غیر خود کوئی چٹکا بلبل نے دل میں بھیجا
پڑے کلبے وہ عادی بھنے میں گنگوڑ ہے
عصیل اپنے مجھ سا آمر کا تجھ سا
دنیا میں ہی میں ہوں مقبول تو ہی ہے
بنیخود شرابِ بنی غلات نیلے تیری
ہم تجھ کو جانے میں مستِ الت تو ہے

تاجور

صاحبِ خانہ کہیں خانہ بر انداز نہ ہو
پردہ داری ہی کہیں پردہ دراز نہ ہو
نہیں بلبل میں اگر حقیقت پر واز نہ ہو
بزمِ محشر بھی تری انجمنِ ناز نہ ہو
صفتِ شمع پگھل جائے اور آواز نہ ہو
جس کا انجام نہیں یہ وہی آغاز نہ ہو
وہ فسو لسا رنج اندازہ در انداز نہ ہو

دھبہ بردہ دلِ عشقِ فسوں ساز نہ ہو
ضبطِ فریاد سے ہو جائیں نہ آنکھیں پر غم
روحِ پرواز کر لگی قفسِ عنصر سے
صدرِ محفل نہ ہو تو ہی کہیں اُس محفل میں
دل میں کھیٹے اُس دل کو جو سوزِ غم سے
ہو کہ سی اٹھنے لگی دل میں خدا خیر کرے
تاجور! ترکِ محبت کی قسم ٹوٹ نہ جائے

